یک
موضوعی
خصوصی
شمارہ
سطور

جدید اردو ادب کے لیے

مارہ : ۱۳
روری : ۱۹۸۳ء
شنویس : جمال گیاوی۔
طبوعہ : نعمانی پریس، دہلی۔

قیمت : ۱۵ روپے

ترتیب :

کمار پاشی

سطور پرکاشن

۳۳۷۱، دہلی گیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

باتیں

سطور کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر کا سبب ایک تو اپریل ۸۲ء میں میری ودیش یاترا اور دوسرے بھارت میں واپس آنے پر ساس کا انتقال ہے۔

سطور کے اشاعتی پروگرام میں اُردو ادب کی اہم شخصیتوں پر خصوصی نمبر شایع کرنا بھی شامل رہا ہے۔ زیرِ نظر یک موضوعی شمارہ میں جناب گوپال مِتّل کی شخصیت اور ان کے شعری اور نثری کارناموں پر اس دور کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان مضامین کی روشنی میں گوپال مِتّل کے شخصی اور شعری کردار کو بآسانی دیکھا، سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی گوپال مِتّل کی شاعری کا انتخاب اور ان کے چند مضامین بھی شاملِ اشاعت ہیں تاکہ قاری ان کے مطالعہ سے گوپال مِتّل کی شاعری اور نثری کارناموں کے سلسلے میں آزادانہ طور پر اپنی رائے قائم کر سکے۔

مجھے اُمید ہے کہ ہند و پاک کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں یہ خصوصی شمارہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور پڑھا جائے گا۔

——— کمار پاشی

اندرونِ صفحات

کمار پاشی

حرفِ چند

آج سے بائیس برس پہلے گوپال متّل کا سامنا کرتے ہوئے مجھے ڈر لگتا تھا۔ اس طویل مدّت میں ان سے سیکڑوں بے تکلف ملاقاتیں ہوئی ہیں لیکن یہ سچ ہے کہ ان سے سامنا کرتے ہوئے میں آج بھی گھبرا جاتا ہوں۔

جب میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں نے ان کے بارے میں بہت سوں سے سن رکھا تھا کہ گوپال متّل نے نہ صرف عالمی ادب کا بلکہ عالمی سیاست کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے اور وہ گھنٹوں بے تکان مختلف موضوعات پر مدلّل گفتگو کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ امریکہ نواز ہیں اور کمیونسٹوں کی مخالفت کے صلے میں انہیں بہت کچھ حاصل ہوتا رہتا ہے اور یہ بھی کہ ماہنامہ "تحریک" کی باقاعدہ اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان کی بلا نوشی، آوارگی، عشق اور جملے بازی کے قصے بھی اکثر سننے میں آجاتے تھے۔ ان سب نے گوپال متّل کی شخصیت کو کسی حد تک پُراسرار بنا رکھا تھا۔ میں چونکہ ان دنوں اردو شاعری میں تازہ تازہ وارد ہوا تھا لہٰذا بڑے ادیبوں کا سامنا کرتے ہوئے میری ٹانگیں کانپنے لگتی تھیں۔ پھر

بارہ

متل جیسے پُراسرار شخص سے ملاقات کرنا میرے نزدیک ایک مُہم سَر کرنے کے مترادف تھا۔

یہاں میں اپنے بارے میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں ایڈونچرسٹ نہیں ہوں۔ مجھے اپنے جان ودل عزیز ہیں اور کسی مُہم پر نکلنا میرے نزدیک کوئی زیادہ پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ادبی حلقوں میں مجھے بڑی حد تک بے خوف، نڈر اور منہ پھٹ تصور کیا جاتا ہے۔

گوپال متل سے میری ملاقات بالکل اچانک ہوئی جس کے لیے میں قطعی طور پر تیار نہیں تھا۔ ہوا یوں کہ ایک مرتبہ جب میں نے چند دوستوں کے درمیان اپنی کچھ نظمیں پڑھیں تو مخمور سعیدی نے جو ادارہ 'تحریک' سے منسلک تھے اور وہاں موجود تھے، مجھ سے میری تازہ نظم 'تحریک' میں اشاعت کے لیے مانگی۔ یہ شروع ۱۹۶۰ء کی بات ہے تب تک میری دو تین غزلیں 'مشرب' کراچی میں شایع ہو چکی تھیں۔

چند روز بعد میں 'تحریک' کے دفتر جا دھمکا۔ جیب میں ایک نظم تھی جس کا عنوان تھا "ترقی پسند تحریک سے خطاب"۔ 'تحریک' کا دفتر تین کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک کمرہ دائیں طرف اور دو کمرے بائیں طرف۔ ان دنوں بائیں طرف پہلے کمرے میں عام طور پر مخمور سعیدی ہی بیٹھتے تھے اور گوپال متل اندر والے چھوٹے کمرے میں۔ جب میں دفتر میں گھسا تو پہلے والے کمرے میں مخمور سعیدی براجمان تھے۔ میں نے کرسی میں بیٹھتے ہی نظم ان کے حوالے کی۔ غالباً دو ایک مرتبہ انھوں نے نظم پڑھی اور 'اچھی ہے' شاید یہ بھی کہا۔ اس کے ساتھ ہی مخمور بولے: 'باقی صاحب آپ اندر جاکر متل صاحب سے مل لیجیے'۔ یہ کہہ کر نظم والا کاغذ انھوں نے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ میرے لیے امتحان کی گھڑی تھی لیکن چند لمحوں میں کیا فیصلہ کرتا سوائے اس کے کہ ڈرتے ڈرتے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ متل صاحب میز پر بکھرے کاغذوں کے انبار پر جھکے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر بیٹھنے کو کہا۔ میں ان کے سامنے کرسی میں بیٹھ گیا اور نظم ان کے آگے کر دی۔ نظم انھوں نے توجہ سے پڑھی۔ بے حد تعریف کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر میرے پاس کچھ اور نظمیں ہیں تو وہ بھی انھیں اشاعت کے لیے دے دوں۔ میں بار بار اُٹھنے کے لیے پر ہلاتا اور وہ بار بار مجھے رُکنے کو کہتے۔ میں ڈر اس لیے رہا تھا کہ کہیں متل صاحب نظم کے

سلسلے میں کوئی سوال نہ کر بیٹھیں۔ مثلاً اس کے مفہوم کے بارے میں واقعی اگر اس وقت وہ کوئی ایسا سوال کر بیٹھتے تو میں اپنی بغلیں جھانکنے لگتا۔

میں ہمت بٹور کر جب واقعی اُٹھنے لگا تو وہ بولے کہ میں نظم کا عنوان بدل دوں اور وہ اس لیے کہ نظم اتنی لطیف ہے کہ اس پر "ترقی پسند تحریک سے خطاب" ایسا تحت و کرخت عنوان کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ میں بضد تھا کہ نظم چونکہ ترقی پسند شعرا اور اُن کی شاعری کے پیشِ نظر کہی گئی ہے لہٰذا اسے اسی عنوان کے تحت ہی چھپنا چاہیے۔ بہر حال نظم 'تحریک' کی اگلی اشاعت میں پورے صفحہ پر نمایاں طور پر میرے ہی سُجھائے عنوان کے تحت شایع ہوئی (اگرچہ بعد میں یہ نظم میرے پہلے مجموعہ میں مِتل صاحب کے مشورے کے مطابق 'دیو داس' کے عنوان سے شایع ہوئی) اور یوں میں اب باقاعدگی سے 'تحریک' میں چھپنے لگا اور مِتل صاحب سے ملاقاتیں بھی برابر ہونے لگیں۔

مندرجہ بالا واقعہ سے آپ یہ تو جان ہی گئے ہوں گے کہ مِتل صاحب کو ادب میں نعرہ بازی پسند نہیں۔ وہ ادب کی لطافت میں کثافت کسی بھی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ شاعر ہیں، نثر نگار ہیں، ناقد ہیں مترجم ہیں اور ایک مدیر کی حیثیت سے انھوں نے تقریباً پچیس برس نئی نسل کی رہنمائی کی ہے۔ اُن کے بد ترین مخالف بھی ان کی رواں دواں اور صاف ستھری نثر کے قتیل اور اُن کی بے پناہ ناقدانہ صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ مِتل صاحب اُردو کے علاوہ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کے مضامین ہندوستان ہی میں نہیں بیرونِ ہند بھی شایع ہوئے ہیں۔ پھر انگریزی زبان پر ان کی دسترس کا پتہ ان سیکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی لاتعداد کتابوں سے بھی چلتا ہے، جن کا انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ ان کے سینے میں ایک شاعر کا دل دھڑکتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے اپنی گوناگوں ادبی اور سیاسی مصروفیات کے پیشِ نظر، شاعری پر زیادہ توجہ نہیں دی جس کے نتیجے میں ان کی شعری تخلیقات کی تعداد ان کے بیشتر ہم عصروں کی نسبت بہت کم ہے تاہم معیار کے اعتبار سے ان کی تخلیقات ایوانِ شاعری میں گوپال مِتل کو مسندِ خاص عطا کرتی ہیں۔

گوپال مِتل کے اب تک دو شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ایک "دوراہا" اور دوسرا "صحرا میں اذان"۔ "دوراہا" اب دستیاب نہیں لیکن

"دوراہا" کی منتخب غزلیں اور نظمیں "صحرا میں اذان" میں شامل ہیں جن سے ان کی شاعری کے ارتقائی سفر کی نشاندھی کی جا سکتی ہے۔ بہت پہلے گوپال متل نے کہا تھا:

شاعری میں نہ رہا جذبہ و احساس کو دخل
اب اسے قوم کی خدمت پہ لگایا جائے

طنز متل کی شاعری کا ایک نمایاں عنصر ہے۔ وہ نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کے طنز میں تلخی نہیں، بلکہ میٹھی سی لطیف چبھن ہے جس کا اثر دیر تک قائم رہتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں ان کے طنز کا نشانہ صرف حالی نہیں بلکہ اس کی زد میں سطحی قومی شاعری کرنے والے وہ تمام شعراء آتے ہیں، جن کی شاعری جذبہ و احساس سے عاری ہے۔ گوپال متل کے نزدیک اچھی شاعری کی تعریف کیا ہے، یہ شعر اس کی پوری وضاحت کرتا ہے۔ بلراج کومل نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

"گوپال متل کے ہاں معاشرتی اور سماجی عناصر کا ردِ عمل جذبوں کی پاکیزگی اور صداقت کا اظہار بن کر اجاگر ہوا ہے۔ وہ رجائیت اور قنوطیت کی حد بندیوں کے اسیر نہیں ہیں وہ صرف اس صورت حال کے شاعر ہیں جو وجود انسانی کے تضادات کو مکمل طور پر قبول کر چکنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔"

گوپال متل نے جس طرح معاشرتی اور سماجی زندگی کو جیا ہے اور وہ جس صورت حال سے دوچار رہے ہیں، اس کا تخلیقی اظہار ان کے ہاں جگہ جگہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ چند شعر دیکھیے:

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سونے مکان کا دیا ہوں

منصور نہ دعویٔ انا الحق
سولی پہ مگر لٹک رہا ہوں

شعر میں تذکرۂ دشت و بیابان ہو مگر
اک بڑے شہر میں گھر اپنا بسایا جائے

زندگی، زندگی ہوتی تھی کبھی
مر نہ جانے کی سزا ہے اب تو

پورے ملبوس میں اس شخص کو ننگا دیکھو
چشمِ بینا ہے تو پھر یہ بھی تماشا دیکھو

نہ بُت کدے میں ہے رونق نہ میکدے میں خروش
اب اہلِ دل سے تہی صرف خانقاہ نہیں

کون منجدھار میں جائے سرِ ساحل بیٹھیں
دُور سے ڈوبنے والوں کا تماشا دیکھیں

ان کے علاوہ گوپال متل کی کئی نظمیں (مثلاً نظم نمبر ایک سے آٹھ تک) بھی موجودہ انسان کے ذہنی خلفشار کو منعکس کرتی ہیں۔

گوپال متل کا شعری اسلوب اگرچہ مستحکم شعری روایات کی یاد دلاتا ہے تاہم موجودہ مظاہر کو انھوں نے اپنی مخصوص نظر سے دیکھا ہے۔ بقول وزیر آغا: "نہ صرف ان کا زاویۂ نگاہ ہی نیا ہے بلکہ اسلوب بھی تازہ ہے اور امیجز بھی انوکھے ہیں۔" یہ سچ ہے کہ متل پرانے پن کے قدر شناس اور قدر دان ہیں اور ادب میں کلاسیکی روایتوں کے پاسدار بھی، لیکن رشید حسن خاں کا یہ کہنا کہ بیشتر نئے ادیبوں اور شاعروں کے متعلق متل کی رائے تحقیر آمیز رہی ہے اور جدیدیت کی طرف داری اور سرپرستی انھوں نے ہوا کا رُخ دیکھ کر کی ہے، سراسر غلط ہے۔ میں بھی یہ بات ذاتی علم کی بنا پر لکھ رہا ہوں کہ جہاں گوپال متل کو کلاسیکی روایات عزیز رہی ہیں وہاں وہ میراجی سے لے کر احمد ہمیش تک بہت سے جدید شعرا کی تخلیقات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ تیکنیکی سطح پر انھوں نے یقیناً کلاسیکی روایات سے استفادہ کیا ہے، لیکن موضوع، اسلوب اور لہجے کے اعتبار سے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ جدید رجحانات کا حامل ہے۔ ان کے بیشتر ہم عصروں کے یہاں ہمیں غزل اور نظم کا فرق بھی نہیں نظر آتا مثلاً راشد اور فیض، دونوں کی نظموں پر غزلیہ ڈکشن کا گہرا سایہ ہے۔ وہی ترکیبیں،

وہی مرکب الفاظ، جو صرف غزل کے شعر ہی میں اپنی چمک دمک دکھا پاتے ہیں، دونوں شعراء کی نظموں میں جگہ جگہ سر اٹھا اٹھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں اور کہیں کہیں خیال کے بہاؤ کو بھی روک دیتے ہیں ان کے برعکس گوپال متل کے یہاں نظم اور غزل کے فرق کو آسانی سے دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر گذشتہ پچیس برسوں میں انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں، وہ موضوع اور اسلوب ہر دو اعتبار سے غزلیہ شاعری کی روایت سے کوسوں دور ایک نئے تخلیقی ذائقے سے روشناس کراتی ہیں۔ ہر نظم ایک مکمل اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ نظم دیکھیے جو انھوں نے ہند و پاک جنگ کے دوران کہی تھی:

مجھے کیا بتاتے ہو
میں جانتا ہوں
وہ نا آشنائے رہِ آشنائی
بڑا سنگ دل ہے
ہمیشہ ہی دل کو دکھاتا رہا ہے
مجھے کیا بتاتے ہو
میں جانتا ہوں
وہ کوچہ
جسے آج تک کوئے دلدار کا نام دیتے رہے
آج شہرِ عدو ہے
مجھے کیا بتاتے ہو
میں جانتا ہوں
قبیلوں میں جب جنگ چھڑتی ہے دل ٹوٹ جاتے ہیں اکثر

مصرعوں کا دھیما دھیما بہاؤ، اس یاس انگیزی کا غماز ہے، جس سے شاعر دوچار ہے۔ نظم اداسی کی کیفیت کو پیش کرتی ہے جو پہلے مصرع 'مجھے کیا بتاتے ہو' سے آخری مصرع 'دل ٹوٹ جاتے ہیں اکثر' تک قاری کو اپنے ساتھ بہائے لیے جاتی ہے۔

وزیر آغا گوپال متل کی شاعری کے انفرادی اسلوب اور منفرد رنگ و آہنگ کے تو قائل نظر آتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ خیال بھی ہے کہ متل کے ابتدائی کلام پر فیض کے اثرات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ مثالاً انھوں نے جس نظم کا ذکر کیا ہے در اصل وہ نظم گوپال متل نے فیض کی نظم کے جواب میں کہی تھی۔ رہی یہ بات کہ بعض مرکب الفاظ جو فیض کی شاعری کا حصہ ہیں، انھیں گوپال متل نے بھی استعمال کیا ہے تو اس سلسلے میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ایک دور میں بہت سے شاعروں کے یہاں ایک سی ترکیبیں اور تلازمے مل جاتے ہیں۔ لہٰذا بارشِ سنگ، کوئے ملامت، دار و رسن، غمِ روزگار جیسی ترکیبوں نیز قاتل اور مقتل کے تلازمے نہ صرف فیض بلکہ اس دور کے بیشتر شعراء کے ہاں بآسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض جدید شعراء نے بھی ان کا استعمال کیا ہے۔

گوپال متل کی شاعری کلاسیکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ ان کا دھیما دھیما سلگتا لہجہ، خود کلامی کا سا انداز کہیں کہیں طنز کی میٹھی لطیف چبھن، موضوعاتی تنوع اور گہری معنویت کی حامل سوچ انھیں اپنے ہم عصروں میں ایک درجۂ خاص عطا کرتی ہے۔

گوپال متل ایک منفرد شاعر ہی نہیں، صاحبِ اسلوب نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی نثری تخلیقات 'تحریک' کے سیکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے ادب، سیاست، عمرانیات غرض کہ ادبی اور سماجی زندگی کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کیا ہے اور جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے اختلاف کی گنجائش کم ہی پیدا ہوتی ہے۔ جہاں شاعری میں وہ جذبہ و احساس کو مقدم قرار دیتے ہیں وہاں نثر میں وہ منطقی استدلال کی ڈور کو کہیں بھی ڈھیلا نہیں چھوڑتے۔ ان کی نثر سادہ، سلیس اور چھوٹی چھوٹی رواں دواں سطروں پر مشتمل ہے۔ لفظ کو نثر میں بھی وہ تخلیقی سطح پر استعمال کرنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی نثر کے شیدائیوں میں وزیر آغا، انور سدید، رشید حسن خاں، بشیر بدر، اور عنوان چشتی جیسے نئے ناقد اور محقق ہی نہیں بلکہ مولوی عبد الحق، قاضی عبد الودود، رشید احمد صدیقی، سید سلیمان ندوی، عبد الماجد دریا آبادی، اور مولانا صلاح الدین احمد جیسے ادب کے عالموں نے بھی

ان کی نثر کی داد دی ہے۔

گوپال متل کی شخصیت ہمہ جہت بھی ہے اور ہمہ رنگ بھی۔ نثر ہو خواہ شاعری ہر دو میدان میں اُن کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آئندہ صفحات میں ان کی شاعری، نثر اور ان کی شخصیت پر اس عہد کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ جس کی روشنی میں ان کے شخصی اور ادبی کردار کو با آسانی دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ گوپال متل کے مضامین اور ان کی شاعری کا انتخاب الگ سے شامل کیا جارہا ہے تاکہ قاری آزادانہ طور پر ان کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکے۔ مجھے اُمید ہے کہ گوپال متل کی شخصیت اور ان کے فن پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے یہ مجموعہ نثر و نظم بے حد مفید ثابت ہوگا۔

●●

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سُونے مکان کا دِیا ہوں

جگن ناتھ آزاد

گوپال مِتّل

گوپال مِتّل سے میری پہلی ملاقات آج سے تینتالیس برس قبل لاہور میں ہوئی، اور یہ ملاقات محض اتفاقیہ تھی۔ کرپال سنگھ بیدار مجھے مولانا تاجور مرحوم کے ہاں لے گئے تھے۔ وہاں گوپال متّل پہلے سے موجود تھے مولانا کے ساتھ اپنی اس ملاقات کا ذکر میں اپنی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں تفصیل سے کر چکا ہوں۔ یہاں مجھے یہ لکھنا ہے کہ گوپال متّل اُس زمانے میں غالباً ROYIST تھے۔ رائے ازم کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں مارکسزم سے جا ملتے ہیں۔ گوپال متّل مولانا کے ساتھ بات چیت میں رائے ازم کی خوبیاں انھیں بتا رہے تھے۔ مولانا جب بات کرتے تھے تو اُن کی تان کمیونسٹوں کی مخالفت پہ ٹوٹتی تھی۔ آخر مولانا نے یہ کہہ کے بات ختم کی کہ گوپال متّل! تم ہزار کمیونسٹ بنو لیکن جب کمیونسٹوں کی حکومت آئے گی تو وہ سب سے پہلے تمھیں نشانہ بنائیں گے کیونکہ تم کوٹ اور پینٹ پہنتے ہو اور اکثر انگریزی میں بات کرتے ہو۔ خدا معلوم مولانا کے دل میں کمیونسٹوں یا کمیونزم کا کیا تصوّر تھا۔ لیکن اُن کے اس جواب پر ہم سب نے ایک قہقہہ لگایا اور گوپال متّل نے بھی یہ دیکھ کر کہ اس سیاسی بحث میں اُن کی اور مولانا کی WAVE LENGTH ایک نہیں ہے بات کو ختم کیا۔

مولانا سیاست کے میدان کے مرد نہیں تھے۔ ان کا میدان دوسرا تھا۔ گوپال متّل کئی میدانوں کے مرد تھے، اور

ہیں ۔ اور اُس پہلی ملاقات میں جس بات نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ جو استدلال میں نے گوپال متل کی بات میں دیکھا اس کا تجربہ شاید اس سے پہلے مجھے نہیں ہوا تھا۔

اُس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ گوپال متل عمر میں مجھ سے دس برس بڑے ہیں۔ بی۔ اے کا امتحان گارڈن کالج راولپنڈی سے پاس کر کے میں لاہور آیا تھا۔ سیاسی تقریریں اکثر لیڈروں کی میں نے سنی تھیں لیکن کسی بزمِ احباب میں سیاست کے موضوع پر ایسی مدلل بات سننے میں نہیں آئی تھی۔

میں لاہور ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے لیے آیا تھا لیکن ایسی ہی محفلیں زنجیر پا بن گئیں۔ اور ایم۔ اے میں داخلہ ملتوی ہوتا چلا گیا۔ اسی آوارہ گردی کے دوران میں وقار انبالوی نے مجھے روزانہ "ملاپ" میں ملازمت دلوا دی ——

گوپال متل اُس زمانے میں "بھارت ماتا" میں کام کرتے تھے جس کے مدیر اعلیٰ لالہ رام پرشاد تھے۔ جہاں تک میرا خیال ہے متل اُس میں دو ایک کالم مستقل طور پر لکھتے تھے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اداریہ بھی کبھی کبھار لکھا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں اُردو صحافت ہندو صحافت اور مسلم صحافت میں بٹی ہوئی تھی۔ 'زمیندار'، 'احسان'، 'شہباز'، 'انقلاب' مسلم اخبارات تھے۔ 'پرتاپ'، 'ملاپ'، 'بندے ماترم'، 'ویر بھارت' اور 'بھارت ماتا' ہندوؤں کے اخبار تھے اور حقیقت یہ ہے کہ مسلم اخبارات کی صحافت کا معیار ادبی اعتبار سے ہندو اخبارات کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا۔ مسلم اخبارات میں لکھنے والے تھے ظفر علی خاں، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، نصراللہ خاں عزیز، ابوسعید بزمی، حمید نظامی، حاجی لق لق، چراغ حسن حسرت اور اس پائے کے دیگر ادیب۔ ان کے مقابلے میں ہندو اخبارات کا پلڑا بہت ہلکا تھا۔ ان کی ادبی آبرو صرف دو اہلِ قلم کے ہاتھ میں تھی۔ ایک میلا رام وفا اور دوسرے گوپال متل۔ وقار انبالوی جب کبھی ہندو اخبارات میں آ جاتے تھے تو ان اخبارات کا، پرتاپ ہو یا ملاپ، ادبی پایہ بلند ہو جاتا تھا ورنہ ان اخبارات کی نظم و نثر اکثر مولانا سالک اور ظہیر امرتسری کی طعن و تشنیع کا نشانہ رہتی تھی۔ میلا رام وفا کا کمال اُن کی سیاسی موضوعات پر ہنگامی نظموں میں نظر آتا تھا مثلاً "اے فرنگی" کے عنوان سے اُن کی متعدد نظمیں ایک زمانے میں بہت مشہور ہوئیں۔ گوپال متل کی بات دوسری تھی۔ انھوں نے اس طرح کی ہنگامی نظموں میں اپنا وقت ضایع نہیں کیا۔ ان کا کمال اُن کی وہ نشتریت تھی جو ان کی سیاسی نثر میں نظر آتی تھی، اور اس میں استدلال کا جو پہلو ہوتا تھا اس کا تعریفی ذکر اکثر مجھے دوسرے اخبارات کے دفتروں میں سننے میں آتا تھا۔ عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کو میں نے اُس زمانے میں بھی گوپال متل کا رطب اللسان پایا۔

شاعری کے لیے ان کا میدان دوسرا تھا۔ 'شاہکار'، 'ادبِ لطیف'، 'سویرا' اور 'ادبی دنیا' میں ان کا کلام شایع ہوتا تھا۔ روزانہ اخبارات کو ان کی شاعری نے کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ "شاہکار" کے تو گوپال متل مدیر بھی رہے اور نہ صرف یہ کہ مولانا تاجور گوپال متل کے دورِ ادارت میں 'شاہکار' کے معیار سے پوری طرح مطمئن تھے بلکہ ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں 'شاہکار' کا پایۂ اعتبار اُس زمانے میں بہت بلند رہا۔

اخبارات کی شاعری سے یاد آیا۔ ایک دفعہ میں نے گوپال متل کی ایک نظم غالباً "بھارت ماتا" ہی میں دیکھی۔ یہ

اس اخبار کا شیوراتری نمبر تھا اور یہ نظم سوامی دیانند سرسوتی کی تعریف میں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ عقیدت کے اعتبار سے گوپال متل آریہ سماجی نہیں ہیں۔ میرے والد محترم آریہ سماجی تھے۔ گویا میں ایک آریہ سماجی گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اور جب ہم لوگ راولپنڈی میں رہتے تھے تو ہمارے گھر کے سامنے آریہ سماج مندر تھا۔ سڑک کے اُس پار، ہر اتوار کی صبح کو اس میں جلسہ ہوتا تھا اور ویسے بھی ہر تہوار کے موقع پر اس مندر میں جلسے ہوتے رہتے تھے۔ ہم گلی محلے کے تمام ہندو لڑکے بڑے شوق سے ان جلسوں میں جاتے تھے۔ یہ وہ دَور تھا جب آریہ سماج میں اُردو اور فارسی کے علما، بڑی تعداد میں تھے۔ اب تو شاید کوئی ڈھونڈے سے نہ ملے۔ اگرچہ سوامی شردھانند، پنڈت لیکھ رام اور گنگا رام کا دَور جا چکا تھا لیکن لالہ لاجپت رائے، پنڈت چموپتی ایم اے، مہاتما آنند سوامی، مہاشے کرشن اور دھنہ جے مُنی کی بدولت آریہ سماج میں ہندی کے ساتھ ہی ساتھ اُردو کا معیار بھی خاصا بلند رہا۔ آخر الذکر پانچ حضرات کی تقریروں کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں موجود ہے۔ ان تقریروں سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں تھا چنانچہ آریہ سماج کے ساتھ میرا تعلقِ خاطر ایک مدت تک رہا اور اُس زمانے میں اگرچہ میں لاہور آنے کے بعد کسی آریہ سماج مندر میں نہیں گیا (کیونکہ راولپنڈی میں تو آریہ سماج مندر بالکل گھر کے سامنے تھا اور لاہور میں ایسی صورت نہیں تھی) لیکن آریہ سماج کے لٹریچر اور ہندو دھرم کی جانب اُس رویے سے جو آریہ سماج نے پیش کیا تھا میرا دلی قرب ایک زمانے تک باقی رہا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندو دھرم کی جانب آریہ سماج کے بانی کا APPROACH میری نظر میں وہی تھا جو اقبال اور ابوالکلام آزاد کا اسلام کی جانب یعنی افکارِ الٰہیہ میں تشکیل جدید یا RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT چنانچہ جب لالہ سُورج بھان نے وید منتروں کے انگریزی ترجموں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے کتابچے شایع کیے تو میں نے وہ بڑے شوق سے پڑھے۔ وہی لذّت جو مجھے وید منتروں کے ان ترجموں میں ملی تھی بہت بعد میں جا کے مجھے محمد پکھتال کے انگریزی ترجمۂ قرآن میں نظر آئی۔

تو میں گوپال متل کی بات کر رہا تھا۔ نظم بہت عمدہ تھی اور اُس سطح سے کہیں بلند تھی جو ہندو اخبارات کی عام سطحِ نظم تھی۔ پنجاب کے ہندو اخبارات میں سے اگر اُس دَور میں میرے والد محترم جناب محروم، منشی مہاراج بہادر برق، میلا رام وفا اور وقار انبالوی کی نظمیں خارج کر دی جائیں تو شاعری کے نام سے جو کچھ باقی رہ جائے گا وہ پوچ گوئی سے بہتر سطح کا نہیں ہوگا۔ اب جو میں نے "بھارت ماتا" میں گوپال متل کی نظم دیکھی۔ اور اتنی بلند پایہ نظم، تو میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے وہ دو تین بار پڑھی اور مجھے زبانی یاد ہو گئی۔ غالباً اُسی روز یا دوسرے روز گوپال متل سے راہ چلتے ملاقات ہو گئی۔ اُن کے ساتھ اُس وقت چودھری نذیر احمد اور باری علیگ بھی تھے۔ میں نے اس نظم کا تعریفی ذکر کیا۔ ظاہر ہے کہ ہر شاعر اپنی نظم کا تعریفی ذکر سُن کے خوش ہوتا ہے خواہ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ گوپال متل کو بھی نظم کی تعریف پسند آئی ہوگی۔ متل نے مجھ سے پوچھا اس وقت کہاں جا رہے ہو۔ میں نے جھوٹ موٹ کہا کہ آریہ سماج کا سالانہ جلسہ ہو رہا ہے وہاں جا رہا ہوں۔ چودھری نذیر احمد بولے، لیکن تمھارا آریہ سماج سے کیا تعلق ؟ میں نے کہا اس وقت تک تو کوئی تعلق نہیں تھا لیکن متل صاحب کی نظم نے اتنا متاثر کیا ہے کہ میرا سویا ہوا ایمان بیدار ہو گیا ہے۔ متل صاحب نے فوراً ہی کڑک کر کہا :

BUT MAN I AM NOT AN ARYA SAMAJIST

مَیں نے کہا، لیکن اس کا کیا علاج کہ مَیں نظم سے بے حد متاثر ہوا ہوں - اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب آریہ سماج مندر جا رہا ہوں - اب بسمل کو کوئی جواب نہ سوجھا، جس پر چودھری نذیر احمد اور باری علیگ نے قہقہہ لگایا اور باری نے ہنستے ہوئے بسمل سے کہا: "اور نظمیں لکھو آریہ سماج کی تعریف میں" یہ غالباً پہلا موقع تھا اور شاید واحد موقع تھا جب مَیں نے بسمل کو لاجواب ہوتے ہوئے دیکھا - ورنہ گوپال متل اور ہری چند اختر کو جواب سے مجبور شاید ہی کبھی کسی نے دیکھا ہو۔

زبان اور اُس کی باریکیوں پر گوپال متل کی بڑی گہری نظر ہے - علمی اور ادبی دُنیا میں متل کی ایک مسلمہ حیثیت ہے۔ اُس زمانے میں بھی جس کی مَیں بات کر رہا ہوں، مولانا صلاح الدین احمد، میاں بشیر احمد اور حامد علی خاں ہمیشہ گوپال متل کی نظم و نثر کا ذکر تعریفی الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ میرے استاد آغا بید ار بخت مرحوم تو ان کی نظم و نثر کا اکثر ذکر کرتے تھے اور ہمیشہ تعریفی انداز میں:

قیامِ لاہور کے دوران میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مَیں اور گوپال متل ایک ہی مکان کے دو مختلف حصّوں میں مقیم رہے - ادبی تعلقات پر مبنی دوستی اور چیز ہے اور ایک ہی مکان میں رہنا دوسری بات - اکبرِ الٰہ آبادی نے ایسے ہی موقعوں کے لیے تو کہا ہے:

اکبر کی بھلائی اور بُرائی سُن پوچھ محلّے والوں سے
دیوان تو ہم نے بھی دیکھا ہے شعر تو اچھے کہتا ہے

اور اس طرح کے قیام کا جو تاثر آج تک باقی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مختصر سا دور میری زندگی کا انتہائی خوش گوار دور تھا - دوسری جنگِ عظیم اسی زمانے میں شروع ہوئی تھی۔

میری تنخواہ اُس وقت بہت کم تھی - مَیں تیس روپے ماہانہ سے ترقی کرتے کرتے سو روپے ماہانہ تک پہنچا تھا - تنخواہ کے اضافے کے لالچ میں مَیں نے کسی ایسی ملازمت کے لیے درخواست دے دی جو جنگ سے وابستہ تھی - شاید لاہور سے باہر یا مُلک سے باہر بھی جانا پڑتا - میری بیوی کو یہ بات بہت ناپسند تھی - اُس نے گوپال متل سے بات کی - گوپال متل نے مجھے بہت سمجھایا کہ جس ملازمت کے لیے تم نے درخواست دی ہے وہ لغو قسم کی ملازمت ہے - انٹرویو وغیرہ کے لیے بلاوا آئے تو نہ جانا - مَیں نے ان کی بات نہ مانی - اپنی ضد پر اڑا رہا - والد محترم اُن دنوں راولپنڈی میں تھے - متل نے انھیں لکھا - وہ آئے اور انھوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر کے مجھے انٹرویو میں جانے سے روکا - معلوم نہیں مجھے انٹرویو میں کامیابی ہوتی یا نہ ہوتی، لیکن بعد میں جب جنگ نے طول پکڑا اور مُلکی حالات واضح طور پر سامنے آئے تو گوپال متل کی اصابتِ رائے پر مجھے ایمان لانا پڑا۔

صحافت گوپال متل کا پیشہ رہا ہے - اس میں ادبی صحافت بھی شامل ہے - تقسیمِ ملک سے قبل "نوائے وقت" ہفتہ وار جب "نوائے وقت" روزانہ میں تبدیل ہوا تو حمید نظامی مرحوم نے انھیں "نوائے وقت" کے عملے میں شریک ہونے کی دعوت دی جو متل نے منظور کر لی - وہاں متل ایک شفٹ کے انچارج مقرر ہوئے۔

حمید نظامی مرحوم کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ ایک بار جب شفٹ کے انچارج کی حیثیت سے متّل صاحب نے اسٹاف کے ایک رکن کے خلاف فیصلہ دیا تو حمید نظامی نے ان کے فیصلے پر مہرِ تصدیق ثبت کی۔ یہ واقعہ مجھے حمید نظامی مرحوم نے خود سنایا تھا۔ واضح رہے کہ "نوائے وقت" میں متّل کے علاوہ تمام اراکین مسلمان تھے۔

تقسیمِ ہند کے بعد کچھ مدت ایسی بھی گزری کہ میں اور گوپال متّل ایک ہی اخبار کے دفتر میں ملازم رہے۔ اس میں مجھے اور گوپال متّل کو زیادہ دیر تک کام نہیں کرنا پڑا۔ مجھے تھوڑی ہی مدت میں پبلی کیشنز ڈویژن کے شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی اسامی مل گئی اور گوپال متّل نے ماہنامہ 'تحریک' جاری کیا۔ اس تھوڑی ہی مدت میں مجھے گوپال متّل کی ایک اور صلاحیت کو بہ نظرِ غائر دیکھنے کا موقع ملا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انگریزی سے اردو میں بامحاورہ ترجمے پر گوپال متّل کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ میں خود اگر کہیں ترجمے میں اٹکتا تھا یا کسی ترجمے کے متعلق مجھے شک ہوتا تھا تو میں جب تک گوپال متّل سے بات نہیں کر لیتا تھا مجھے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ اس دفتر میں باقی تمام حضرات بس واجبی قابلیت کے تھے۔ زبان کی باریکیاں تو خیر ایک طرف رہیں، معمولی باتیں بھی اُن کے حدودِ علم سے باہر تھیں۔ بات چیت میں بھی سوائے ایک دو کرارے "اعتراضات" کے یہ لوگ اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس ماحول میں میری اور گوپال متّل کی قربت میں مزید اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن نہ جانے ایک دن کیا ہوا میں اور گوپال متّل آپس میں جھگڑ پڑے۔ اب مجھے اس وقت بالکل یاد نہیں کہ اس کا سبب کیا تھا۔ اس بات کو تو تیس برس بھی تو ہو گئے ہیں اور بات بھی کوئی بہت معمولی ہو گی لیکن اتنا مجھے یاد ہے کہ نتیجۃً ہم دونوں میں بول چال بند ہو گئی اور تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ اب میری دقت یہ تھی کہ سارے دفتر میں علمی یا ادبی موضوع پر بات کرنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ کسی لفظ کی سند تلاش کرنے کے لیے اگر کسی شعر کا خیال آتا تھا تو کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ یاس یگانہ یا مولانا ظفر علی خاں یا حسرت موہانی کے فلاں شعر کا پہلا مصرع کیا ہے یا دوسرا مصرع کیا ہے، یا فلاں غزل کا مطلع یا مقطع کیا ہے، جوش کی فلاں نظم کا عنوان کیا ہے۔ عجیب گھٹن کی فضا تھی۔ غالباً گوپال متّل بھی یہی محسوس کر رہے تھے کہ ہم نے آپس میں بول چال بند کر کے خواہ مخواہ اپنے لیے ایک ضیق النفس کی فضا پیدا کر لی ہے۔ کوئی تین چار دن کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ ہم دونوں اسی دفتر میں تنہا بیٹھے تھے۔ دونوں خاموش، کہ گوپال متّل نے قہقہہ لگایا اور اپنے ASSERTIVE لہجے میں بولے:

MAN, WHY DON'T YOU SAY CLEARLY THAT WE HAVE MADE
A MISTAKE IN QUERELLING WITH EACH OTHER

اس پر مجھے بھی ہنسی آ گئی کیونکہ متّل نے میرے دل کی بات کہی تھی۔ چنانچہ بات ختم ہو گئی اور میں نے اس قیدِ تنہائی سے نجات پانے پر اطمینان کا سانس لیا۔

یہاں متّل نے ایک اور عجیب و غریب بات بھی کہی اور وہ یہ کہ: "آزاد! اس سارے دفتر میں اور کوئی آدمی اس قابل بھی تو نہیں کہ اس کے ساتھ جھگڑا کیا جائے۔"

متّل اُس زمانے میں اپنے مخاطب سے بات کرتے ہوئے اکثر اُسے لفظ MAN سے مخاطب کیا کرتے

تھے۔ معلوم نہیں اب کیا صورت ہے کیونکہ گزشتہ تیرہ برس میں تو ملاقات محض گاہے گاہے کی رہی ہے۔ میں ۱۹۶۸ء میں دلی سے سری نگر چلا گیا۔ وہاں سے جموں آگیا۔ مِتّل صاحب بھی آج کل دریا گنج کو چھوڑ کر راجندر نگر جا چکے ہیں لیکن اب یہ پریم گوپال کے ماڈرن پبلشنگ ہاؤس کی بدولت پھر ملاقاتوں کی ایک صورت پیدا ہونے لگی ہے —— خدا پریم گوپال مِتّل کو تندرستی اور طویل عمر کی دولت سے نوازے اور ماڈرن پبلشنگ ہاؤس کو روز افزوں ترقی نصیب ہو۔ یہاں میں ایک بار آیا تو گوپال مِتّل وہاں موجود تھے۔ تین چار گھنٹے اُن کے ساتھ بسر ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے لاہور کا زمانہ واپس آگیا ہو۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں ۱۹۵۸ء میں پبلی کیشنز ڈویژن میں آگیا اور گوپال مِتّل نے ماہنامہ تحریک جاری کیا۔ نیشنل اکیڈیمی مِتّل کا ایک پُرانا اشاعتی ادارہ تھا جو انھوں نے لاہور میں جاری کیا تھا۔ دلی میں اس کی بھی تجدید ہوئی۔ اُس وقت ہم دونوں میں ایک طرح کا ادبی صحافتی رشتہ پیدا ہوگیا۔ مِتّل 'تحریک' سے وابستہ تھے بلکہ اس کے ایڈیٹر تھے میں "آج کل" "بساطِ عالم" اور "نونہال" سے متعلق تھا۔ اگرچہ ان رسائل اور "تحریک" میں ایک بعد المشرقین تھا لیکن یہ ماحول ایک بار پھر باہمی ملاقاتوں کا ایک اچھا ذریعہ بن گیا۔ جوش ملیح آبادی شعبۂ اُردو کے ایڈیٹر تھے۔ عرش ملسیانی اور بلونت سنگھ بھی اسی دفتر میں تھے۔ کچھ مدت بعد ہری چند اختر بھی اس برادری میں شامل ہو گئے۔ عرش اور مِتّل پرانے دوست تھے۔ دونوں لدھیانے میں ایک مدت تک اکٹھا رہ چکے تھے۔ (غالباً مِتّل نے لدھیانے سے اس زمانے میں "صبح امید" نامی ایک ماہنامہ نکالا تھا) اس لیے مِتّل کبھی کبھار "آج کل" کے دفتر کا پھیرا کر لیا کرتے تھے۔

سیاسی خیالات کے اعتبار سے میں اس وقت تک اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کا پورا پورا حامی بن چکا تھا، اور مِتّل اس کے پورے مخالف۔ لیکن خیالات کا یہ اختلاف ہماری دوستی کے رستے میں کبھی حائل نہ ہوا۔ اور میں تو خیر اس قسم کا اشتراکی تھا جو حکومتِ ہند کا ایک افسر ہونے کے باعث اپنے خیالات کا اظہار بہت کھلم کھلا نہیں کرتا تھا۔ ساحر لدھیانوی تو کھلم کھلا اشتراکی تھے۔ ساحر کے ساتھ مِتّل کی دوستی اور بہت گہری دوستی ساحر کی زندگی تک رہی اور ساحر کی موت پر مِتّل نے "تحریک" میں جو اداریہ لکھا وہ ایک تحریر نہیں ہے بلکہ خونِ دل کی بوندیں ہیں جو مِتّل کے قلم سے انتہائی شدتِ غم کے عالم میں کاغذ پر ٹپکی ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مِتّل اور میں جوش صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے علمی اور ادبی باتیں ہو رہی تھیں۔ نہ جانے جوش کو کیا سوجھی کہ مِتّل کے سامنے اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کی تبلیغ شروع کردی۔ اس معاملے میں مِتّل علم کا سمندر ہے۔ جوش کا لگاؤ سیاست کے ساتھ محض ایک جذباتی قسم کا تھا —— اور جوش ہزار منطق کرتے رہیں، مِتّل ایسے جغادری کے سامنے کہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ آخر اس بات چیت اور مباحثے کی تان یہاں آکر ٹوٹی ——

مِتّل صاحب نے سوشلزم کی ماہیت بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ : جوش صاحب! سوشلزم کی جو تعریف آپ نے کی ہے اور جو خوبیاں آپ نے بیان کی ہیں، اُن کے پیشِ نظر سوشلزم روس میں نہیں بلکہ برطانیہ میں ہے۔ جوش اس وقت بحث ہار چکے تھے۔ کہنے لگے : ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ سوشلزم اپنی صحیح صورت میں برطانیہ ہی میں ملتا ہے۔

اب متل نے ٹرمپ کارڈ پھینکا اور کہا کہ جوش صاحب تو گویا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ روس میں نہ سوشلزم ہے نہ کمیونزم۔ جوش نے جواب میں اُتنا کہا کہ: ہاں صاحب یہ تو صحیح ہے کہ روس میں نہ سوشلزم ہے نہ کمیونزم۔ یہ تھی جوش صاحب کی ترقی پسندی اور ترقی پسندی کے بارے میں اُن کا علم۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ متل کے ساتھ بحث کرنا آسان نہیں۔

جب متل چلے گئے تو میں نے جوش صاحب سے کہا: جوش صاحب! آج ساری بات چیت بہت غلط لائنوں پر چلی۔ کہنے لگے کیسے؟ میں نے کہا یہ آپ نے کیا کہہ دیا کہ روس میں نہ سوشلزم ہے نہ کمیونزم، اور صحیح سوشلزم اگر کہیں ہے تو برطانیہ میں ہے۔ جوش بولے، ہاں مجھے بھی کچھ خیال رہا کہ میں غلط بات کہہ رہا ہوں لیکن جب میں ایک غلط بات کہہ رہا تھا تو آپ نے مجھے ٹوکا کیوں نہیں، اور آپ نے متل سے کیوں نہیں کہا کہ سوشلزم روس میں اپنی صحیح صورت میں موجود ہے۔ میں نے کہا: متل سے بحث کرنا آسان نہیں۔ اور سیاسیات میں بحث محض ایک ذہنی جمناسٹک ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ سوشلزم کی صحیح ترین صورت روس میں ہے اور سوشلزم دُنیا کے تمام دُکھوں کا علاج ہے۔ ہندوستان ایسے ملک کی جہاں انفرادی سطح پر بد دیانتی کی لعنت سے بہت کم لوگ محفوظ ہیں، نجات صرف کمیونزم کو اپنانے میں ہے۔ اس پر جوش طیش میں آگئے اور بولے کہ: میں بھی یہی سمجھتا ہوں اور آپ کا ہم خیال ہوں لیکن آپ نے اس موضوع پر متل کے ساتھ بحث کیوں نہیں کی۔

میں : محض اس لیے کہ اس بحث کے لیے جو حقائق اور DATA ازبر ہونا چاہیے وہ میرے حافظے میں نہیں اور یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر بحث صرف FACTS AND FIGURES کے زور ہی سے ہوسکتی ہے اور پھر میرے یا آپ کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو بحث مباحثے کے لیے بھی ہمیشہ تیار رکھیں۔ میرے لیے میرا یہ عقیدہ ہی کافی ہے کہ میں اس وقت تک جو کچھ ہوں اس کی تشکیل میں میرے اشتراکی خیالات کا بڑا حصہ ہے۔

جوش : ہاں، لیکن اپنے خیالات کو مدلل طور پر پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ (جیسے وہ تھوڑی دیر قبل خود کر چکے تھے)

میں : صحیح ہے لیکن اس کے لیے اور لوگ ہیں۔ ہم آپ اس طرح کی سیاسی بحثوں کے لیے پیدا نہیں ہوئے 'ہر کسے را بہر کارے ساختند'۔

جوش : کون لوگ؟

میں : مثلاً بنّے بھائی، سردار جعفری، فیض احمد فیض، مُلک راج آنند، یش پال، آل احمد سُرور (سرور صاحب اُس وقت تک ادب میں ترقی پسند تحریک کے ایک رہنما تسلیم کیے جاتے تھے) احتشام حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، جنھوں نے اس موضوع کا اس طرح مطالعہ کیا ہے کہ یہ اب ان کا جزوِ مزاج بن چکا ہے۔

آخر اللہ کر نام جوش صاحب کو پسند نہیں آیا۔ اس نام نے ان کے چہرے پہ تکدر کے آثار پیدا کر دیے لیکن اپنی دلی کیفیت کو چھپاتے ہوئے بولے : یہ آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ اب جب احتشام یا سردار یہاں آئیں تو مجھے یاد دلائیے۔ اس وقت ہم متل کو دعوت دیں گے کہ آ کر ان سے بحث کریں۔ مَیں نے عرض کیا جوش صاحب، چھوڑیے اس بات کو، یہ مشتے بعد از جنگ والی بات ہے اور پھر : ——— 'کار دنیا کسے تمام نہ کرد' ——— سردار اور احتشام جہاں ہیں وہاں اپنے اپنے دائرے میں یہ کام بخوبی انجام دے رہے ہیں ——— اور یہ موضوع اس طرح ختم ہو گیا۔

بات مَیں گوپال متل کی کر رہا تھا اور درمیان میں ایک بہت ہی محبوب شخصیت کا ذکر آ گیا ——— جوش ملیح آبادی کا ——— اور : لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

تو اُن دنوں "آج کل" کے دفتر میں ترقی پسند ادیبوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ سردار جعفری، ساحر، احتشام حسین آل احمد سرور، ظ انصاری جب کبھی دہلی آتے تو آج کل کے دفتر میں ضرور آتے تھے۔ اُن کو یہاں کھینچ لانے کا سبب جوش صاحب کی شخصیت تھی جن کی ترقی پسندی محض رومانوی انداز کی ہونے کے باوجود اُردو شاعری کو جلا بخش رہی تھی۔ ان محفلوں کا نتیجہ یہ تھا کہ مَیں اپنے اشتراکی خیالات کی حمایت میں پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میرے پہلے مجموعۂ کلام بکھراں میں تو ان خیالات کی ہلکی سی جھلک موجود ہے لیکن دوسرا مجموعۂ کلام ستاروں سے ذرّوں تک انھی خیالات سے مملو ہے۔ ستاروں سے ذرّوں تک کے بعد میرا تیسرا شعری مجموعہ چھپا۔ اس میں ایک باب ہے 'چند ملاقاتیں عالم خیال میں' اور یہ ملاقاتیں ہیں بنّے بھائی فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ظہیر حسین اور ممتاز حسین کے ساتھ ہیں جو اُن دنوں جیل میں تھے۔ گوپال متل نے اس نظم پر "تحریک" میں ایک شدید قسم کا ادارتی مقالہ لکھا۔ اب اس وقت یہ ایڈیٹوریل تو میرے سامنے نہیں ہے اس لیے لفظ بہ لفظ یہاں لکھنے سے تو قاصر ہوں لیکن لب لباب اس ایڈیٹوریل کا یہ تھا کہ یہ اشتراکی خیالات رکھنے والا پبلی کیشنز ڈویژن (حکومتِ ہند) میں نائب مدیر ہے اور حکومت اس طرح کے سیاسی خیالات کی اجازت کیوں دے رہی ہے۔ اصولاً متل کی بات ٹھیک تھی۔ حکومت کے کسی ملازم کو اپنے سیاسی خیالات کی نشر و اشاعت کی اجازت نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن متل کی تحریر کی زد چونکہ مجھ پر پڑتی تھی اس لیے قدرتی طور پر متل کی بات مجھے ناگوار گزری۔ متل نے اس کے ساتھ ایک اور "زیادتی" یہ کی کہ چند ماہ بعد اپنے اس ایڈیٹوریل کو دوبارہ شایع کر دیا۔ مَیں نے عرش سے کہا کہ متل نے اصولِ دوستی کے خلاف بات کی ہے۔ عرش نے کہا کہ یہ متل کے سیاسی CONVICTION کی بات ہے جب وہ اس موضوع پر جواہر لعل نہرو اور نور الحسن کے خلاف لکھتا ہے تو تمھارے خلاف لکھنے سے کیوں گریز کرے گا۔ تمھیں چاہیے کہ تم اپنے خیالات کو اپنے تک ہی محدود رکھو۔ کسی وقت حکومت کی زد میں آ جاؤ گے اور اس وقت چھٹکارا مشکل سے ہو گا۔

آخر ایک دن آیا کہ مَیں حکومت کے عتاب کی زد میں آ گیا۔ لیکن اس کے لیے متل کا ایڈیٹوریل ذمہ دار نہیں تھا۔ وہ معاملہ ہی دوسرا تھا۔ متل نے جو بات لکھی تھی کھلم کھلا لکھی تھی۔ مجھ پر چھپ کر وار نہیں کیا تھا اور کچھ مدت بعد جب

میں حکومت کے عتاب کا ہدف بنا تو اس کے پیچھے بعض دوستوں کی خفیہ اور درپردہ کوشش کارفرما تھی، وہ نظمیں ہی اور تھیں جن کے حسبِ منشاء ترجمے حکومت تک پہنچائے گئے تھے لیکن یہ واقعہ ایسا ہے جس کا تعلق میری ذات اور میرے سوانح حیات سے ہے۔ موجودہ مقالے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

تو کہہ میں یہ رہا تھا کہ میں نے متل کے اس اڈیٹوریل کا برا مانا اور متل سے میری ملاقات قریب قریب ختم ہو گئی لیکن اس قسم کے واقعات انسان کی زندگی پر کوئی پائدار اثر نہیں چھوڑتے۔ پائدار اثر چھوڑنے والی شئے ہم سخنی اور ہم مزاجی ہے۔ آخر یہ کیفیت میرے تکدر پر غالب آئی اور میں اپنی تشنگیِ شوق مٹانے کے لیے متل صاحب سے اسی طرح ملنے لگا جس طرح پہلے ملا کرتا تھا۔

آج میں حکومت کا ملازم یا افسر نہیں ہوں۔ اور اپنے سیاسی خیالات کے اظہار میں کسی احتیاط یا مصلحت سے کام لینے پر مجبور نہیں۔ اور متل کو یہ سب معلوم ہے لیکن متل نے میرے اس عمل پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اعتراض اس وقت کیا تھا جب میں نے حکومت کا ایک افسر ہوتے ہوئے اُن سیاسی خیالات کا اظہار کیا تھا جو حکومت کے خیالات نہیں تھے۔ گویا گورنمنٹ سرونٹس کانڈکٹ رولز کی خلاف ورزی کی تھی۔ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ متل اپنے اظہارِ خیال میں حق بجانب تھا اور یہی سبب ہے کہ یہ بات اُسی زمانے میں رفت وگزشت ہو گئی تھی اور اس کی جگہ اس کیفیت نے لے لی تھی جو ہم سخنی، ادبی ہم خیالی اور ہم مزاجی پر مبنی ہے۔ رہی اختلافات کی بات تو اس کے متعلق ڈاکٹر تاثیر مرحوم ایک بہت خوبصورت شعر کہہ گئے ہیں:

ہزار ہم سخنی ہو ہزار ہم نظری
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

ابھی کچھ مدت ہوئی استادِ محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک مقالہ میری نظر سے گزرا جس میں انھوں نے چلتے چلتے تقسیمِ ہند کے زمانے کا بالخصوص نگینہ بیکری کا ذکر کیا ہے۔ اس میں گوپال متل کا ذکر انھوں نے خاص طور سے کیا ہے۔

اسی ماہ مئی کی بات ہے میں بزمِ تعمیرِ ادب کراچی کے مشاعرے میں اور کراچی یونیورسٹی میں ایک مقالہ پڑھنے کے لیے پاکستان گیا۔ وہاں ابوالاثر حفیظ جالندھری سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت دیر تک گوپال متل کا ذکر کرتے رہے اور ان کے متعلق پوچھتے رہے۔ صرف ڈاکٹر سید عبداللہ اور حفیظ جالندھری ہی پر موقوف نہیں ہے، مجھے پاکستان جانے کا اتفاق جب بھی ہوتا ہے اور وہاں لاہور، کراچی، پشاور، اسلام آباد اور راولپنڈی میں نئے پرانے دوستوں سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ لوگ ہندوستان کے اہلِ قلم کا یا اپنے ان دوستوں کا جو ہندوستان میں ہیں ذکر کرتے ہیں تو اس میں گوپال متل کا ذکر خاص طور سے شامل ہوتا ہے اور:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

۲۳ نومبر ۱۹۸۱ء

مخمور سعیدی

کھلی کتاب کے چند ورق

گوپال مِتّل صاحب کا نام مَیں نے پہلے سے سُن رکھا تھا، انھیں پڑھا بھی تھا لیکن دیکھا ۱۹۵۳ء کے وسط میں۔ جب ابھی دلّی میں نووارد تھا اور یہاں کے جن ادیبوں اور شاعروں کے نام سے کان آشنا تھے، انھیں دیکھنے اور اُن سے ملنے کا مجھے اشتیاق رہتا تھا۔ شام کو مَیں اُردو بازار میں کتب خانۂ عزیزیہ پر جا بیٹھتا۔ اس کتب خانے کے مالک مولوی سمیع اللہ قاسمی تھے۔ وہ شعر فہم تو بالکل نہیں تھے مگر شاعروں اور ادیبوں سے بڑی انسیت رکھتے تھے۔ کتب خانے کے سامنے لکڑی کی ایک پُرانی بنچ پڑی رہتی تھی جو ہندوستان بھر کے مشہور و ممتاز شاعروں اور ادیبوں کی نشست گاہ رہ چکی تھی۔ مِتّل صاحب سے میری پہلی ملاقات اسی بنچ پر ہوئی۔ مولوی سمیع اللہ قاسمی مرحوم نے جب شاعر کے طور پر اُن سے میرا تعارف کرایا تو مِتّل صاحب کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ اُبھری اس میں تمسخر کا شائبہ تھا اور یہ مجھ جیسے بساطِ ادب کے ایک نووارد کا حوصلہ پست کر دینے کو کافی تھا۔ جب انھوں نے دو گھڑی بعد مجھ سے کچھ سُنانے کو کہا تو مَیں اور بھی بے حوصلہ ہو گیا لیکن پھر اچانک ہی میری خود اعتمادی لوٹ آئی اور مَیں نے بے دھڑک انھیں ایک نظم سُنا ڈالی۔ خوش قسمتی سے نظم انھیں پسند آئی اور پھر وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ رخصت ہونے سے پہلے قریب کے ایک چائے خانے میں لے جا کر چائے بھی پلائی۔

مِتّل صاحب تقسیم سے پہلے لاہور میں مقیم تھے، وہیں سے دلّی آئے۔ لاہور کے جن دیو قامت ادیبوں اور شاعروں کے

ساتھ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا تھا، اُن کے مقابلے میں وہ لوگ انھیں شاید بونے نظر آتے ہوں گے جو دلّی کی اُجڑی ہوئی بساطِ ادب پر اس وقت باقی رہ گئے تھے۔ مجھ جیسے کم عمر اور غیر معروف شاعر سے ان کا سوئے ظن تعجب خیز نہ تھا لیکن جیسا کہ میں نے اس وقت بھی محسوس کیا اور پھر بعد میں بھی مجھے اس کا تجربہ ہوتا رہا، اگر کسی نئے لکھنے والے میں انھیں کوئی صلاحیت نظر آ جائے تو وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور حتی الوسع اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

جب میں متین صاحب سے پہلی بار ملا، وہ اپنا رسالہ 'تحریک' جاری کر چکے تھے اور اس کے دو تین شمارے منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ ادبی حلقوں میں اس جریدے کا زبردست چرچا تھا۔ 'تحریک' نے ادب کے ترقی پسند نظریے کے خلاف آواز اُٹھائی تھی اس لیے ترقی پسند اس کے اجرا سے سخت ناخوش تھے۔ رسالہ "شاہراہ" میں جو ترقی پسندوں کا ترجمان تھا، ہنس راج رہبر کا ایک مضمون چھپا۔ رہبر متین صاحب کے قریبی دوستوں میں تھے مگر اپنے اس مضمون میں انھوں نے متین صاحب پر بڑے رکیک ذاتی حملے کیے اور ان قلمکاروں کو بھی طرح طرح کی گالیوں سے نوازا، جو اُن سے تعاون کر رہے تھے۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ میں بھی ٹونک سے، محدود پیمانے پر ہی، کچھ اسی طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرتا ہوا دلّی آیا تھا۔ میرے ایک قریبی شاعر دوست نے، جو اب اس دُنیا میں موجود نہیں، ٹونک میں پہلی بار انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قایم کی اور اس کے جلسوں میں مجھے بھی بلایا جانے لگا۔ میں اُن دنوں ترقی پسندی کے مفہوم سے تقریباً نابلد تھا، میرا شعری اور ذہنی رویّہ بھی ابھی کوئی واضح شکل اختیار نہیں کر سکا تھا، پھر بھی وہاں شعر و ادب کے بارے میں جن خیالات کی تبلیغ کی جاتی، کبھی کبھی میں اُن سے اختلاف کر بیٹھتا اور اس اختلاف کی وجہ غالباً میری وہ تھوڑی بہت ذہنی تربیت تھی جو کلاسیکی ماحول میں ہوئی تھی۔ میں جو کچھ کہتا خلوصِ نیت کے ساتھ کہتا لیکن میری اختلافی باتوں کا بہت بُرا منایا جاتا اور جلسہ برخاست ہو جانے کے بعد میرے بارے میں عجیب و غریب قسم کی چہ میگوئیاں کی جاتیں۔ میرا جواں مرگ شاعر دوست گو ہر ٹونکی اکثر مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا کہ اگر میں نے ان لوگوں کا ساتھ نہ دیا تو میرا کوئی ادبی مستقبل نہ ہوگا۔ پھر دھیرے دھیرے وہ مجھ سے دُور ہوتا گیا اور انجمن کے جلسوں میں مجھے بُلانا بھی اس نے ترک کر دیا۔

خیر، پہلی ملاقات کے دو ڈھائی مہینے بعد ایک شام ظفر ادیب کی زبانی جنھوں نے اپنے مکتبۂ قصرِ اُردو میں مجھے رہنے کو جگہ دے رکھی تھی، متین صاحب کا یہ پیغام مجھے ملا کہ میں کسی وقت ان کے دفتر میں ان سے مل لوں۔ میں اگلی دوپہر جا پہنچا۔ دفتر، دریا گنج میں انصاری مارکیٹ کی بالائی منزل پر تھا اور زینے کے ساتھ 'تحریک' کے نام کا بورڈ آویزاں تھا۔ زینہ چڑھ کر میں اوپر گیا، متین صاحب ایک بڑی سی میز کے آگے، ایک معمولی سی کرسی پر تنہا بیٹھے تھے۔ تپاک سے پیش آئے اور باتوں باتوں میں مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی۔ میں اُن دنوں آزاد ہند ہوٹل کی ایک شاخ میں منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس ہوٹل کے مالک افضل پشاوری خود بھی شاعر تھے اور شاعروں کی قدر کرتے تھے۔ اُن سے میرا تعارف استادِ مرحوم بسمل سعیدی صاحب نے کرایا تھا اور انھی کے کہنے پر افضل صاحب نے مجھے یہ ملازمت دی تھی۔ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ مشاہرہ اور چائے ناشتہ اور کھانا ہوٹل کی طرف سے۔ ۱۹۵۲ء میں اچھا خاصا ذریعۂ معاش تھا۔ متین صاحب نے صرف چالیس روپے ماہانہ کی پیشکش کی، اور میں نے ان کی اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ہوٹل میں کام کرنا مجھے پسند نہیں تھا اور یہاں جو کام مجھے سونپا

جا رہا تھا وہ میرے ذہن و ذوق سے مطابقت رکھتا تھا۔ اس طرح تحریک سے میری اس وابستگی کا آغاز ہوا جو چوتھائی صدی سے زیادہ تک قایم رہی۔ درمیان میں ایک ایسا وقفہ آیا کہ دفتر کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی۔ اس وقت تک عملے میں دو تین آدمیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ انھیں حالات کا علم ہوا تو انھوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ بسمل صاحب نے افسردہ خاطری کے ساتھ مجھ سے بھی کہا کہ چاہوں تو میں بھی کسی دوسری جگہ ملازمت ڈھونڈ لوں، خود وہ بھی اس معاملے میں تعاون کریں گے لیکن میں نے انھی کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی اور کئی ماہ تک میں گھر سے رقم منگوا کر اپنا خرچ پورا کرتا رہا۔ میری اس وفاداری بشرطِ استواری، نے بسمل صاحب کو بہت متاثر کیا۔ دھیرے دھیرے حالات بدلے بسمل صاحب نے 'تحریک' کے ساتھ ساتھ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی بحال کیا۔ اب وہ تمام دفتری بلکہ غیر دفتری امور میں بھی مجھ پر اتنا ہی بھروسہ کرنے لگے جتنا اپنے خاندان کے کسی فرد پر کیا جا سکتا ہے۔ میری تنخواہ میں بھی میرے کہے بغیر وہ وقتاً فوقتاً خود ہی اضافہ کرتے رہے اور جب 'تحریک' بند ہوا تو میری تنخواہ دو ہندسوں سے بڑھ کر چار ہندسوں تک پہنچ چکی تھی۔

۲۶، ۲۷ سال کی طویل مدت میں بسمل صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کی شخصیت کو سمجھنے کے مجھے بہت سے مواقع حاصل رہے ہیں۔ بظاہر وہ ایک پُراسرار شخصیت کے مالک نظر آتے ہیں لیکن ایسا ہے نہیں۔ ان کے نزدیکی لوگوں کے لیے ان کی زندگی ہمیشہ ایک کھلی کتاب کی طرح رہی ہے۔ اپنے قیامِ لاہور کے زمانے کی یادیں انھوں نے کاغذ پر محفوظ کر دی ہیں۔ یہ یادداشتیں "کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی" کے عنوان سے ابتداءً 'تحریک' میں قسط وار شایع ہوئیں۔ پھر 'لاہور کا جو ذکر کیا' کے عنوان سے کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئیں۔ اس کتاب میں بسمل صاحب نے جہاں دوسرے کئی مشاہیر کو ان کے اصلی روپ میں پیش کیا ہے وہاں اپنی شخصیت کے کسی پہلو کی پردہ پوشی کی بھی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ بالکل نجی باتیں بھی، مثلاً کسی لڑکی سے کوئی جذباتی رشتہ، دوستانہ رقابتیں، آوارہ مزاجی، شراب نوشی وغیرہ، انھوں نے بے کم و کاست بیان کر دی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تمام مشاغل ایک مہذب آدمی کے مشاغل تھے، اور ان کا بیان بھی مہذب پیرائے میں ہوا ہے۔

لاہور میں بسمل صاحب کا حلقۂ احباب وسیع تھا لیکن تقسیمِ ملک کے دو تین مہینے بعد جب وہ شرنارتھیوں کے آخری قافلے کے ساتھ دلی آئے تو یہ حلقہ بکھر چکا تھا۔ ان کے حلقۂ احباب میں مسلمان زیادہ تھے اور وہ پاکستان ہی میں رہ گئے۔ ہندو دوستوں میں سے صرف پنڈت ہری چند اختر اور عرش ملسیانی دلی پہنچے۔ جیسا کہ بسمل صاحب نے 'لاہور کا جو ذکر کیا' میں لکھا ہے، تقسیم کے نتیجے میں جو ہولناک فسادات پھوٹ پڑے تھے، ان سے انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا اور انھوں نے لاہور کو اس وقت خیرباد کہا جب امن بحال ہو چکا تھا، لیکن لاہور اور وہاں کے احباب کی مفارقت کا صدمہ بجائے خود ان کے لیے بہت شدید تھا۔ لاہور کی یادیں اب بھی ان کے لیے عزیز ترین متاع کی حیثیت رکھتی ہیں اور جب یہ یادیں ان کے ذہن میں تازہ ہو جاتی ہیں تو وہ اپنی تمام عقل پسندی کے باوجود انتہائی جذباتی انسان نظر آنے لگتے ہیں۔ بسمل صاحب کو لاہور اور اہلِ لاہور سے جو تعلقِ خاطر ہے اور غیر منقسم پنجاب کے تہذیبی ماحول کے لیے ان کے دل میں جو ترجیحی گوشے ہیں، ان کا بہت خوبصورت اظہار ان کی نظم 'ہر کجا ہستند' میں ہوا ہے۔ پہلی بار یہ نظم 'ایک پاکستانی دوست کے نام' کے عنوان سے شایع ہوئی تھی۔

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں یہ نظم نقل کر دی جائے:

ہر کجا ہستند

گرچہ ساغر بہ دست ہوں امشب
کیف و مستی سے دل ہے بیگانہ
جیسے بے کیف ہو شراب مری
جیسے ویراں ہو بزم میخانہ
دوست! تیرے بغیر بادہ کشی
عیشِ رفتہ کا ایک جرمانہ
ہو گئے گردشِ زمانہ سے
گرچہ اک دوسرے سے بیگانہ
پھر بھی تیری ہی یاد آتی ہے
میں اُٹھاتا ہوں جب بھی پیمانہ
کوئی درد آشنا نہیں تجھ بن
میں کہوں کس سے دل کا افسانہ
کوئی اہلِ جنوں نہیں ملتا
جس کو دیکھو وہی ہے فرزانہ
مے بھی جس کا علاج کر نہ سکے
ذہنیت اس قدر مریضانہ
غائبانہ کلام ہے تجھ سے
یوں بھی ممکن ہے دل کا بہلانا
یاد اب تک وہ قہقہے ہیں ترے
گونج اُٹھتا تھا جن سے میخانہ

سچ بتا ہیبتِ اذاں سے کیا
دب گیا ہے وہ شورِ مستانہ؟
دل پہ رندوں کے کیا گزرتی ہے
بند جب سے ہُوا ہے میخانہ؟
اس خنک رات میں بجُز بادہ
کیسے ممکن ہے دل کا گرمانا
آ کہ اک بار پھر سجائیں ہم
وہی دیرینہ بزمِ رندانہ
ظلمتِ مذہب و سیاست میں
پھر سے روشن ہو شمعِ میخانہ
میں ادھر چھیڑتا ہوں اپنی غزل
تو اُدھر اپنی دُھن میں لہرانا
محتسب کی نگاہ سے بچ کر
مے کہیں سے بھی ہو چُرا لانا
اور اُس کوچۂ ملامت میں
آج ممکن ہو گر تو ہو آنا
چوم لینا وہ کاکل و رخسار
آج تک دل ہے جن کا دیوانہ
میری مجبوریوں کو دیکھ، کہ اب
میری فطرت نہیں رقیبانہ

مِتّل صاحب دلّی میں زیادہ دوست نہیں بنا سکے اور اس کا سبب یہاں کے لوگوں کے بارے میں غالباً ان کا یہی تاثر تھا جس کا اظہار مندرجۂ بالا نظم کے اس شعر میں کھُل کر ہوا ہے:

مے بھی جس کا علاج کر نہ سکے
ذہنیت اس قدر مریضانہ

ورودِ دلی کے فوراً بعد قتیل صاحب کے جن چند لوگوں کے ساتھ مراسم قایم ہوئے ان میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی اور ساحر ہوشیارپوری کے نام نمایاں ہیں لیکن اوّل الذکر دو حضرات سے قتیل صاحب مزاجاً بہت مختلف واقع ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تعلقات میں گرم جوشی برقرار نہ رہ سکی۔

اُس وقت کی دلی کی ایک برگزیدہ شخصیت جوش ملیح آبادی تھے۔ جوش صاحب کی رندمشربی سے دُنیا واقف ہے، قتیل صاحب بھی کوئی صوفی صافی نہ تھے لیکن دونوں آپس میں ٹکرا گئے۔ ہوا یہ کہ لال قلعے کے جشنِ جمہوریت کے مشاعرے میں منتظمین کی طرف سے، جن میں منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی بھی تھے، شاعروں پر پابندی عائد کی گئی کہ وہ شراب پی کر نہ آئیں۔ جوش صاحب کو یہ ناگوار ہوا، وہ نہ صرف شراب پی کر مشاعرے میں تشریف لائے بلکہ شراب اپنے ساتھ بھی لیتے آئے اور مشاعرہ شروع ہو جانے کے بعد اسٹیج کے ایک طرف اپنی الگ محفل آراستہ کر لی۔ اِدھر شعرا کلام سنا رہے ہیں، اُدھر دورِ جام چل رہا ہے۔ رہی سہی کسر انھوں نے اپنی باری آنے پر امتناعِ شراب کے خلاف نظم پڑھ کر پوری کر دی۔ امن صاحب نے بے بسی سے ادھر اُدھر دیکھا اور جوش صاحب کے بعد بسمل شاہ جہاں پوری کے ایما پر انھیں شعرخوانی کی دعوت دی۔ بسمل صاحب نے غزل پڑھی جس میں ایک شعر یہ بھی تھا:

جو رند بد کلام اخلاق کی حد سے گزر جائے
نکلوا دو اُسے اُردو سبھا[1] کی جلد محفل سے

اس شعر کا سامعین پر منفی اثر ہوا اور دوسرے مصرعے میں جو تعقیدِ لفظی ہے، لوگ اسے لے اُڑے۔ قتیل صاحب نے امن صاحب کی پریشانی دیکھ کر ان کی حمایت کا فیصلہ کیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے کچھ شعر موزوں کیے اور مائک پر آ کھڑے ہوئے۔ اشعار میں ایک منطقی اپیل تھی جو سامعین کو چھو گئی۔ تمام اشعار مکرّر، سہ کرّر پڑھوائے گئے اور اتنی داد ملی کہ جوش صاحب احتجاجاً مشاعرہ گاہ سے اُٹھ کر چلے گئے۔

اس دن کے بعد سے جوش صاحب اور قتیل صاحب میں ہمیشہ ٹھنی رہی۔ قتیل صاحب نے یہ اشعار اپنے مجموعے میں جو 'صحرا میں اذان' کے نام سے اس واقعے کے بہت بعد شایع ہوا، شامل نہیں کیے ہیں لیکن جوش صاحب نے اس واقعے پر جو نظم کہی وہ ان کے کسی مجموعے میں شامل ہے۔ نظم کے حواشی میں امن صاحب، بسمل صاحب شاہ جہاں پوری اور قتیل صاحب تینوں کا ذکر ایسے لفظوں میں ہے، جن سے جوش صاحب کا شدید غصہ ظاہر ہوتا ہے۔

"تحریک" کے اجرا کے بعد قتیل صاحب کے گرد نئے لکھنے والوں کا ایک حلقہ بننا شروع ہوا۔ پُرانے لکھنے والوں میں قتیل صاحب بعض لوگوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، سیّد مسعود حسین رضوی ادیب، رشید احمد صدیقی، میرزا یگانہ چنگیزی،

---

[1] مشاعرہ اُردو سبھا کے زیرِ اہتمام ہو رہا تھا۔

اور جگر مراد آبادی کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ 'تحریک' کے ساتویں شمارے میں اثر صاحب کا ایک مضمون چھپا، عنوان تھا: مجھے بھی کچھ کہنے دیجیے' مضمون میں اثر صاحب نے ترقی پسندوں کے بعض مزعومات کو ہدفِ تنقید بنایا تھا اور ایسی کئی باتیں صاف صاف کہہ دی تھیں جنھیں لوگ محسوس تو کرتے تھے، لیکن اس وقت کی ادبی سیاست کے تقاضوں کے پیشِ نظر، مصلحتاً زبان پر نہیں لانا چاہتے تھے۔ اس مضمون نے بہت سے لوگوں کی جھجک دُور کردی اور وہ ترقی پسندوں کے ساتھ برملا اپنے اختلافات کا اظہار کرنے لگے۔ قاضی عبدالودود صاحب، عرشی صاحب، اور جگر صاحب 'تحریک' کے لیے ہمیشہ لکھتے رہے۔ یگانہ نے ایک خط لکھ کر 'تحریک' کے اجرا پر اپنی مسرت کا اظہار کیا تھا اور کچھ رباعیاں بھی بھیجی تھیں، ان میں سے تین یا چار رباعیاں ہی 'تحریک' میں شایع ہو سکیں، باقی اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے ایسی تھیں کہ ان کی اشاعت سے فسادِ خلق کا خوف تھا۔ جگر صاحب کی غزلوں کے سلسلے میں متل صاحب یہ اہتمام کرتے تھے کہ وہ انھی کی تحریر میں شایع ہوں۔ جگر صاحب کا جب بھی دلی آنا ہوتا، 'تحریک' کے دفتر بھی ضرور تشریف لاتے۔ ایک بار وہ ترقی پسندوں کے کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے دلی آئے، ترقی پسند دوستوں نے ان سے متل صاحب کے بارے میں وہ ساری باتیں کہیں جو ان کے تعلق سے وہ اکثر کہتے رہتے ہیں اور انھیں 'تحریک' کے دفتر جانے سے روکنا چاہا مگر جگر صاحب نہیں مانے۔ مشاعرے کے اگلے دن وہ متل صاحب سے ملنے چلے آئے اور مشاعرے والی غزل انھیں بھی سنائی۔ اس غزل کا یہ شعر اب ضرب المثل بن چکا ہے:

اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے!

اوپر جن حضرات کے نام آئے، ان کے علاوہ 'تحریک' اور اس کے ادبی مشن کو پسند کرنے والے بزرگوں میں سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی بھی تھے جو گاہ بہ گاہ خط لکھ کر متل صاحب کے موقف سے اپنے اتفاق کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب کے "جہانِ غالب" کے سلسلے کے کئی مضامین "تحریک" میں شایع ہوئے، عرشی صاحب کا وہ مضمون جس کے ذریعے پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی کہ مولانا فضل حق خیر آبادی کا ۱۸۵۷ء کے فتوائے جہاد سے کوئی تعلق نہیں تھا، 'تحریک' ہی میں شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد اسی مسئلے پر مالک رام صاحب کا ایک مضمون بھی 'تحریک' نے چھاپا، جو عرشی صاحب کے فراہم کردہ شواہد کی توثیق کرتے ہوئے ان پر مزید شہادتوں کا اضافہ کرتا تھا۔

فراق صاحب برسوں ترقی پسندوں کے ساتھ رہے لیکن ایک مرحلے پر آکر ترقی پسندی کے حقیقی مفہوم کے سلسلے میں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے قائد علی سردار جعفری سے ان کی بحث چھڑی۔ فراق صاحب کے ذہن میں ترقی پسندی کا جداگانہ ہی مفہوم تھا اس لیے اس بحث میں اکثر نامور ترقی پسندوں نے جعفری صاحب کا ساتھ دیا اور فراق اکیلے رہ گئے۔ یہ بحث جعفری صاحب کے حق میں اختتام کو پہنچی تو متل صاحب نے اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے 'تحریک' میں لکھا کہ فراق صاحب اگر بحث ہار گئے ہیں تو اس پر انھیں ملول نہ ہونا چاہیے بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ ان کی آنکھوں کے آگے سے ایک پردہ اٹھ گیا اور

ان پر یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ جس تحریک کا ساتھ وہ ادبی تحریک سمجھ کر دے رہے تھے، دراصل وہ ایک سیاسی تحریک ہے۔ جواباً فراق صاحب نے انھیں ایک طویل خط لکھا۔ اس میں ترقی پسندی کے اس تصور سے جس کی وکالت جعفری اور ان کے ہمنوا کر رہے تھے، اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ترقی پسندی کی وہی توجیہیں پیش کیں، جو ان کے ذہن میں تھیں اور اصرار کیا کہ جعفری اور ان کے مؤیدین غلط فہمیوں کے شکار ہیں، حقیقی ترقی پسندی وہ ہے جس کا ترجمان میں ہوں۔ ساتھ ایک غزل بھی منسلک تھی۔ متّل صاحب نے دونوں چیزیں اہتمام سے شایع کیں لیکن خط پر ایک اختلافی نوٹ لکھا۔ نوٹ میں کہا گیا تھا کہ غلط فہمی کے شکار جعفری اور ان کے مؤیدین نہیں خود فراق صاحب ہیں اور اس کے ضمن میں ایسی دلیلیں پیش کی گئی تھیں جن کی تردید آسان نہ تھی۔ اس کے بعد 'تحریک' کے صفحات پر فراق صاحب میں اور متّل صاحب میں خوب بحث چلی اور ہار یہاں بھی فراق صاحب ہی کے حصّے میں آئی۔

نئے لکھنے والوں کی ایک پوری نسل ہے جو متّل صاحب کا احترام بھی کرتی ہے اور ان سے محبت بھی۔ ان میں اکثر وہ ہیں جن کی ادبی زندگی کا آغاز 'تحریک' ہی سے ہوا۔ شاعری اور افسانے میں ایسی تجرباتی تخلیقات جنھیں دوسرے رسالے یا تو شایع ہی نہیں کرتے تھے یا ایک معذرتی انداز میں اپنے صفحات پر جگہ دیتے تھے، 'تحریک' میں اہمیت دے کر شایع کی جاتی تھیں اور کبھی کبھی متّل صاحب علمی انداز میں ان پر اظہارِ خیال بھی کیا کرتے تھے۔ ایسے تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی جو عام ذہنی تحفظات و تعصبات کو صدمہ پہنچاتے ہوں لیکن سچائی کا انکشاف کرتے ہوں 'تحریک' میں خصوصیت کے ساتھ شایع کیے جاتے تھے۔ فیض کی شاعری پر رشید حسن خاں کا وہ مضمون جس نے فیض کے ناقدوں کو پہلی بار اس طرف متوجہ کیا کہ وہ زبان و بیان کے معاملے میں کتنے سہل انگار ہیں اور ان کے ہاں اظہار کی کیسی کیسی خامیاں پائی جاتی ہیں، 'تحریک' ہی میں شایع ہوا تھا۔ "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو" پر رشید حسن خاں کا وہ معرکہ آرا تبصرہ بھی 'تحریک' ہی نے شایع کیا تھا جس کے نتیجے میں زرِ کثیر صرف کر کے تیار کرائی جانے والی یہ کتاب ناشرین کو واپس لینی پڑگئی تھی۔ اس کے مرتبین میں بڑے جغادری لوگوں کے نام تھے مگر پوری کتاب غلطیوں کا پشتارہ تھی۔ دیوندر اسّر، نثار احمد فاروقی، محمود ہاشمی اور پرکاش فکری کے سلسلہ ہائے مضامین بھی 'تحریک' میں شایع ہوئے جن کی بدولت بہت سے اوہام کا ازالہ ہوا اور دُھند میں لپٹے ہوئے حقائق روشنی میں آئے۔

دلّی کے ابتدائی زمانۂ قیام کو چھوڑ کر، یہاں متّل صاحب کے دوستانہ مراسم صرف نئے لکھنے والوں کے ساتھ ہی قایم ہوئے۔ دوستانہ مراسم کے لفظ میں نے روا روی میں نہیں لکھ دیے ہیں، متّل صاحب ہمارے بزرگ تھے لیکن ہم سے بالکل دوستوں کی سطح پر ملتے تھے۔ اگر کبھی کسی کو کچھ سمجھانا بھی ہوتا تو وہ بزرگانہ انداز میں نصیحت کرنے کی بجائے دوستانہ طور پر اشاروں کنایوں میں اپنی بات متعلقہ شخص تک پہنچا دیتے اور ان کا کہا بالعموم رائگاں نہ جاتا۔ ایمرجنسی کے دنوں میں مجھ پر اور کمار پاشی پر جھنجھلاہٹ اور غصّے نے بہت غلبہ پا لیا تھا۔ ہم احتجاج کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے اور اُن پر عمل کرنا چاہتے لیکن متّل صاحب، باوجود اس کے کہ خود بھی ایمرجنسی کے نفاذ کو غلط سمجھتے تھے، بڑی خوش اسلوبی سے ہمیں باز رکھتے رہے۔ میں اور کمار پاشی یہ سمجھتے تھے کہ جبر کا جو ماحول ملک پر مسلّط کر دیا گیا ہے وہ دائمی ہے لیکن متّل صاحب کا خیال تھا کہ یہ صورتِ حال عارضی ہے، زیادہ دن قایم نہیں رہے گی اور ان کا خیال ہی درست ثابت ہوا۔

'تحریک' کا دفتر یوں تو دلّی اور بیرونِ دلی کے بھی لگ بھگ سبھی نئے لکھنے والوں کی زیارت گاہ تھا۔ لیکن دلّی کے کچھ نئے شاعر اور ادیب تو ایسے تھے جو ہر شام وہاں پہنچتے۔ ان روز کے آنے والوں میں کمار پاشی کے علاوہ بانی، کنور سین، پروانہ اور حیات لکھنوی اور امیر قزلباش کے نام تھے۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی متل صاحب کام چھوڑ دیتے۔ اور دفتر کے دوسرے کمرے میں جوان کی شام کی نشست گاہ تھا جا بیٹھتے۔ پھر گپ شپ اور ناؤ نوش کا سلسلہ شام ڈھلے تک جاری رہتا۔

متل صاحب کا علم ٹھوس اور ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ ادبیات کے علاوہ سماجی اور سیاسی علوم پر بھی ان کی گہری نظر ہے اور تاریخ کا بھی وہ بالغ نظرانہ شعور رکھتے ہیں۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ذہنی افق کشادہ ہوتا جا رہا ہو لیکن جس طرح وہ اپنی تحریر میں کفایتِ لفظی سے کام لیتے ہیں، اسی طرح ان کی گفتگو بھی حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے۔ میں نے بسا اوقات یہ دیکھا ہے کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں کوئی بات کہہ گئے اور سننے والا متوقع ہے کہ وہ کچھ اور کہنے والے ہیں۔ لیکن اب وہ کوئی دوسری ہی بات کہہ رہے ہوں گے۔ غالباً وہ گفتگو کا سلسلہ یہ سمجھ کر شروع کرتے ہیں کہ مخاطب موضوعِ زیرِ بحث سے انھی کی طرح واقف ہے، وہ جو کچھ کہیں گے، اس کے مضمرات تک اس کا ذہن خود رسا ہو جائے گا؛ ان کے لیے بس اشارہ کر دینا کافی ہے۔ گفتگو کے کسی مرحلے پر انھیں یہ احساس ہو جائے کہ یہ توقع بیجا تھی تو پھر ان کے لیے سلسلۂ گفتگو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ اچانک اس طرح خاموش ہو جاتے ہیں کہ ان کا مخاطب کچھ حیران کچھ پریشان سا ہو کر ان کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

یہ شاید ان کی پراگندہ طبعی ہے یا پھر مطالعے کی کثرت کا نتیجہ کہ متل صاحب کے ذہن میں بیک وقت کئی کئی سوال سر اٹھاتے رہتے ہیں اور وہ ان سبھی پر بیک وقت غور بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ سوال شعر و ادب سے بھی متعلق ہو سکتے ہیں، صحافت و سیاست سے بھی، اور آپ یقین کریں تو کہوں کہ مذہب سے بھی۔ ادب کے بارے میں ان کے خیالات اردو، فارسی اور انگریزی زبان و ادب کے وسیع مطالعے پر مبنی ہیں۔ ان تینوں زبانوں کی ادبی اور شعری روایات کی آگہی اور عرفان ان کی نثر و نظم دونوں سے ظاہر ہے۔ ادب کو وہ مقصود بالذات سمجھتے ہیں لیکن ان معنی میں نہیں جن کی طرف ادب برائے ادب کی پامال اصطلاح اشارہ کرتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب زندگی کی اس صداقت کا اظہار ہے جسے ادیب اپنی داخلیت کے وسیلے سے دریافت کرتا ہے؛ اور اس صداقت کی پرکھ کی کسوٹی خود اس کا فنی اظہار ہی ہے۔ کسی سیاسی، سماجی یا اخلاقی نظام سے اس کی مطابقت کی کوشش غیر ضروری ہے۔ ان کے نزدیک ایک مہذب معاشرے کو ادیب کی تخلیقی آزادی کا احترام کرنا چاہیے اور اس بنا پر اس سے کوئی باز پرس نہیں کرنا چاہیے کہ وہ فرمائشی چیزیں کیوں نہیں لکھتا۔ اچھے ادب کا سرچشمہ ان کے نزدیک ادیب کی داخلی کیفیات ہی ہو سکتی ہیں کوئی خارجی منشور نہیں۔ ترقی پسندوں سے ان کا بنیادی اختلاف یہی ہے کہ وہ ادب کو کچھ ہدایت ناموں کا پابند بنانا چاہتے ہیں اور ادیب کی تخلیقی آزادہ روی کا ان کے دلوں میں کوئی احترام نہیں۔ ادب کو غیر ادبی فرائض سونپنے کے معاملے میں متل صاحب مولانا حالی کے بھی گلہ گزار ہیں۔ حالی نے شاعری میں سادگی اور واقعیت پسندی پر جو زور دیا، بناوٹی اور آرائشی لوازمات کی جو مخالفت کی، اس کے وہ موید ہیں۔ حالی کی غزل گوئی کے بھی وہ قائل ہیں اور ان کی غزلوں کا یہ وصف انھیں بہت پسند ہے کہ ایک طرف ان سے اردو کی اعلیٰ شعری روایات کا شعور جھلکتا ہے تو دوسری طرف ان میں احساس کی وہ گرمی بھی موجود ہے جو ہم عصر زندگی کی قربت سے پیدا ہوتی ہے لیکن بعد میں حالی نے اپنی اصلاحی

کوششوں میں جو تشدد برتا اور ادب کو جس سطح پر لے جاکر "قومی خدمت" پر مامور کرنا چاہا اسے وہ ان کی کم نظری قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حالی نے مغربی تنقید کے جو حوالے دیے وہ ناقص، نامکمل اور اسی لیے گمراہ کن ہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں ترقی پسند تحریک کا اردو میں جو زیادہ زور رہا، اس کا ایک سبب مِتّل صاحب کے نزدیک وہ ذہنی ماحول بھی تھا جو حالی تیار کر گئے تھے۔

ترقی پسند نظریۂ ادب، اس کی خامیوں اور خطرناکیوں پر جس مفصل اور مدلل انداز میں مِتّل صاحب نے لکھا ہے، اردو میں اور کسی نے نہیں لکھا۔ اس موضوع پر ان کی ایک مستقل تصنیف "ادب میں ترقی پسندی" بھی موجود ہے۔ اس میں انھوں نے صرف ہندوستان ہی میں ترقی پسند تحریک کے آغاز، اس کے پھیلاؤ اور اس کے اثرات کا جائزہ نہیں لیا ہے بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی جہاں جہاں یہ تحریک چلائی گئی اور وہاں کے زبان و ادب میں اس نے جو کردار ادا کیا، اس سے مفصل بحث کی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دراصل یہ ایک سیاسی مُہم ہے جو ادب کو اپنی مقصد برآری کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے، اور اس کی باگ ڈور ایک منظم طاقت کے ہاتھ میں ہے جو عالمی سطح پر سیاستِ اقتدار کا کھیل کھیلنے میں مصروف ہے۔

مِتّل صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی حیثیت سے کیا تھا اور ادب کے علاوہ اس شعبے میں بھی انھیں امتیاز حاصل ہوا۔ ان کی صحافیانہ سوجھ بوجھ کا سلسلہ براہِ راست ان کی سیاسی بصیرت سے ملتا ہے۔ عملی سیاست میں انھوں نے زیادہ حصہ نہیں لیا لیکن قومی سیاست ہو یا بین الاقوامی سیاست، اس کی سمت و رفتار کا جتنا درک انھیں ہے، کم لوگوں کو ہوگا۔ اپنی تحریروں میں بھی، اور دوستوں کے ساتھ گفتگو میں بھی، انھوں نے بیسیوں ایسی سیاسی پیش گوئیاں کی ہیں جن کا پورا ہونا بظاہر ناممکن نظر آتا تھا لیکن کچھ ہی وقت گزرنے پر وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں اور ان سے اختلاف کرنے والوں کو ان کی اصابتِ رائے کا قائل ہونا پڑا۔

مِتّل صاحب اشتراکیت کے جتنے شدید مخالف ہیں، جمہوریت کے اتنے ہی زبردست حامی ہیں۔ اشتراکی نظام کی کلیت کیشی کے مقابلے میں، وہ ایک ناتمام جمہوری نظام کو بدرجہا اچھا سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ ناتمامی کا احساس ہی جمہوریت کی اساس ہے۔ اشتراکی نظام کو وہ اسی لیے رد کرتے ہیں کہ یہ اپنی اکملیت کا دعویدار بن کر سہو و خطا کے ان تمام امکانات کو فراموش کر دیتا ہے، جو ہر انسانی جدّ و جہد کا مقدر ہیں۔ جو لوگ مسندِ اقتدار پر متمکن ہوں، مِتّل صاحب کے نزدیک انھیں حلم، بردباری، فراخدلی اور رواداری کے اوصاف سے متصف ہونا چاہیے۔ مِتّل صاحب کی نظر میں جمہوری نظام کی سب سے اہم خوبی یہی ہے کہ اس میں اربابِ اقتدار کی غلطیوں کی نشان دہی کی کوئی پاداش نہیں، اور ان غلطیوں کی اصلاح کا راستہ کھلا ہے۔

ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں کی آبادی مختلف مذہبی اور تہذیبی فرقوں میں بٹی ہوئی ہے، قومی یک جہتی کا حصول ایک اہم مسئلہ ہے۔ مِتّل صاحب اس مسئلے پر بڑا دور رس نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک، قومی یک جہتی کے عمل کو ایک قدرتی عمل کے طور پر فروغ پانا چاہیے۔ اگر فوری نتائج کی خاطر مصنوعی طریقے اختیار کیے گئے تو صورتِ حال میں غالباً سدھار نہیں، بگاڑ ہی پیدا ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں اقلیتیں چونکہ مذہب کی بنا پر مستقل حیثیت اختیار کر لیتی

ہیں، اس لیے یہاں اکثریت کا یہ فرض ہے کہ وہ زیادہ متحمل مزاج، زیادہ کشادہ دل اور زیادہ روادار بنے۔ اقلیتوں کا دل جیت کر جو نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں، وہ انھیں ان کی کوتاہیاں جتا کر یا بہتر رویے کی تلقین کر کے، حاصل نہیں کیے جا سکتے، خواہ ایسا برملا طور پر اکثریت کی طرف سے کیا جائے یا اس کے ایما پر خود اقلیتوں کے منتخب افراد کے ذریعے۔

ہندوستان میں اُردو کی بقا اور ترقی کے مسئلے سے بھی مِتّل صاحب کو گہری دلچسپی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک جو کچھ ہوا ہے، اس سے وہ مطمئن نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ دَور میں کوئی زبان صرف اپنی خوبیوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی؛ اسے کچھ قانونی تحفظات بھی حاصل ہونے چاہئیں۔ صرف اس لیے کہ اُردو کا ادبی سرمایہ وسیع ہے، کم ہی لوگ اسے پڑھنا چاہیں گے لیکن اُردو پڑھ کر اگر وہ اپنی عملی زندگی میں کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہوں تو پھر ہمیں ان کے سامنے اُردو کی خوبیوں کی دہائی دینے کی ضرورت نہ ہوگی اور وہ خود ہی اسے پڑھنے لگیں گے۔ ان کے خیال میں اُردو کی یہ حیثیت قایم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے اُن صوبوں میں ثانوی سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے جو اس زبان کے حلقۂ اثر میں شامل ہیں۔

شعر و ادب میں نئے تجربات کے مِتّل صاحب ہمیشہ مویّد رہے ہیں۔ ترقی پسندی کے دَور میں بھی موضوع اور ہیئت کے جو تجربے ہوئے، ان کے وہ منکر نہیں۔ البتہ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ تجربات کچھ شاعروں کی نجی اُپج کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے اور جن شاعروں نے یہ تجربات کیے، ان کی راہ میں اگر انجمن ترقی پسند مصنفین کی ڈسپلن رکاوٹ نہ ڈالتی تو وہ اور زیادہ بامعنی تجربات انجام دے سکتے تھے۔ میراجی کے شعری کارنامے کے وہ بطورِ خاص معترف ہیں اور ان کی شاعری کا یہ وصف انھیں بہت پسند ہے کہ ان کے ہاں احساس اور اظہار کا درمیانی فاصلہ کم سے کم ہے۔

مِتّل صاحب کی نثری تحریروں میں جو منطقی استدلال پایا جاتا ہے، اس کی جھلک ان کی شاعری میں شاذونادر ہی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری، ان کی شخصیت کے کسی ایسے گوشے کا اظہار ہے جس پر انھوں نے ضبط کا پہرا بٹھا رکھا ہے۔ گھر کے علاوہ ایک بڑے دفتر کی بھی اُن پر ذمہ داریاں رہی ہیں، جنھیں وہ بطریقِ احسن پورا بھی کرتے رہے ہیں لیکن ان کے اندر کا شاعر اس پر احتجاج کیے بغیر نہیں رہتا:

سر میں ہوائے دشتِ جنوں ہے بھری ہوئی
شہرِ خرد کی خاک مگر چھانتا ہوں میں

ان کا ایک اور شعر یاد آیا:

خوگرِ شہر ہوئے دیوانے | چاکِ دامن بھی سیا ہے اب تو

اور چاکِ دامن سینے کا یہ عمل کافی تکلیف دہ تھا:

یہ جو زخم سینے کا بن گیا ہے اب ناسور | چاک تھا گریباں کا جس کو سی لیا میں نے

ایسا نہیں کہ انھیں زندگی سے یہ گلہ ہو کہ اس نے انھیں کچھ نہ دیا لیکن بہت کچھ پا لینے کے بعد بھی محرومی کا احساس ان کے دل سے زائل نہیں ہوتا:

دیا کیا کچھ نہ تو نے دینے والے | مرا دامن مگر اب بھی تہی ہے

شاید یہ خالص شاعرانہ اور آوارگی کی زندگی ہے جس سے وہ محروم رہے ہیں۔ ان سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ اگر یہ تمھارے بس میں ہوتا تو تم کیا بنتے ؟ انھوں نے بے جھجک جواب دیا —— آوارہ۔

تسّل صاحب نے اپنی کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" میں لاہور کے 'قلندروں' کا ذکر جس تعلقِ خاطر کے ساتھ کیا ہے وہ بھی ان کی اس مزاجی کیفیت کا غماز ہے۔ کتاب میں ایک جگہ چراغ حسن حسرت کی جامع صفات شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس شخص کا مبتلائے پندار ہو جانا تعجب خیز نہ تھا یہ بات خود تسّل صاحب کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ کسی نہ کسی درجے میں ایک خاص قسم کا پندار ان کے مزاج میں بھی شامل ہے۔ ترقی پسندوں کی طرف سے شدید مخالفتوں کی یلغار کا وہ تن تنہا جس طرح مقابلہ کر گئے اس میں کچھ نہ کچھ ان کے اس پندار کو بھی ضرور دخل رہا ہوگا، اگرچہ اس استقلال کا اصل سبب ان کا یہ یقین تھا کہ وہ حق بجانب ہیں۔ بقول یگانہ:

اُمیدِ صلح کیا ہو کسی حق پرست سے   پیچھے وہ کیا ہٹے گا جو حد سے بڑھا نہ ہو

آمنہ ابوالحسن

پہچان

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

یہ معصوم سا مگر معتبر شعر میں کئی سال پہلے بڑے شوق سے گنگنایا کرتی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ کس شاعر کا ہے۔ شعر پسند آیا، یہی وجہ گنگنانے کی تھی ——— جب تک حیدرآباد میں تھی بہت سے رسالوں کے ساتھ 'تحریک' بھی پابندی سے ملا کرتا تھا اور 'تحریک' کا مزاج اس اعتبار سے دوسرے رسائل سے جداگانہ تھا کہ 'تحریک' کے ایڈیٹر جناب گوپال متل کے ذہن و قلم کی صداقت اور جراءت قطعی انفرادی تھی جس کی جھلک دوسرے رسائل میں اول تو نظر ہی نہ آتی تھی، یا آبھی گئی تو بڑی محتاط اور کم کم ———

جری لوگ چونکہ ہمیشہ پسند رہے لہٰذا کئی مرتبہ اس خواہش نے سر اُٹھایا کہ دہلی جاکر ایک بار متل صاحب سے ضرور ملا جائے لیکن بقول کسے اُس وقت میرے لیے "دلی دور تھی" مگر چونکہ میری خواہش صادق تھی لہٰذا کافی عرصے بعد ہی ہی دلی نے خود مجھے بلایا اور جب دلی میں بس ہی گئی تو ملنے کے ابتدائی اور

ضروری ہنگاموں کے بعد فوراً سوچا۔ بس اب متّل صاحب سے مل ہی آؤں پھر خیال ہوا اللہ جانے کیسے ہوں گے جوان، اُدھیڑ، بوڑھے ——— ؟ خوش شکل، خوش گفتار، مرنجان مرنج، معتدل مزاج یا بدصورت۔ برہم مزاج۔ کیونکہ "انتظاروں" کا اجتماع یقیناً ہر جگہ نہیں ہوتا مگر جہاں ہوتا ہے بلاشبہ اپنی علیحدہ فطرت اور خاص مزاج رکھتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی معلوم ہوا کہ اپنا تعارف کرائے بغیر پہلے کسی ادبی محفل میں جناب والا کو دیکھ لیا جائے پھر اُسی حساب سے ملاقات کی جائے۔ اِدھر جیسے جیسے لوگوں کو پتہ چلتا گیا دعوت نامے ویسے ویسے بڑھتے گئے اور ہر محفل میں ہر ہر عُمر کے خوبصورت خوبصورت آدمیوں کو تاکتا ر کر کسی نہ کسی عنوان میری دریافت کہ جناب گوپال متّل صاحب . . . ؟ جب متواتر کوشش پر بھی سب خوبصورت آدمیوں نے یکے بعد دیگرے گوپال متّل ہونے سے انکار کر دیا تو بادلِ نخواستہ میری توجہ مرنجان مرنج آدمیوں کی طرف ہوئی، لیکن آخر کار وہاں بھی کامیابی نہ ملی تب مجبوراً اور اندازاً برہم مزاجوں کی باری آئی ——— میں نے ڈر ڈر کر محتاط انداز میں ٹٹولا لیکن متّل صاحب کو نہ ملنا تھا نہ ملے۔ بہت جی کڑھا۔ حیدرآباد اور دِلّی کا فاصلہ تو مسلمہ ٹھہرا مگر حد ہے کہ دہلی میں ہو کر بھی اس قدر دُوری، اتنے فاصلے، اتنی لاعلمی، تب میں نے ٹھانا کہ چاہے جو ہو سیدھا "تحریک" کے دفتر پہنچوں گی اور اپنی جسارت پر اگر دو ٹوک سننے کو ملے تو وہ بھی خندہ پیشانی سے سُن لوں گی کہ قابلیت تک پہنچنے کے لیے طرح طرح کے پاپڑ تو بیلنے ہی پڑتے ہیں ——— قابلیت کھری ہوتی ہی ہے اور کھرے پن کو برداشت کرنا بھی دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ عین اس وقت جبکہ میں اپنے طور پر یہ پروگرام بنا رہی تھی، ایک ایسی ادبی محفل کا دعوت نامہ مجھے ملا جس کی صدارت گوپال متّل صاحب فرما رہے تھے ——— جی نہال ہو گیا۔ اب متّل صاحب بچنے سے رہے، یہ سوچ کر میں نے محفل کا رُخ کیا۔ ہال میں داخل ہو کر بے حد اشتیاق سے جوں ہی ڈائس پر نگاہ جمائی، مشکل یہ آن پڑی کہ ایک نہ دو، کئی حضراتِ بابرکات اور تقریباً سارے کے سارے ہم عصر نہایت وضع قسم کے پاس پاس براجمان تھے ——— ان سب میں متّل صاحب کی شناخت پھر ایک صبر طلب مرحلہ تھا۔ تحمل کا ایک اور امتحان! خدا خدا کر کے کرسی پر اضطرار سے پہلو بدلتے بدلتے جلسہ ختم ہونے کو آیا اور صاحبِ صدر اپنے بیش بہا خیالات عنایت کرنے اُٹھے۔ تب یک بیک حتمی طور پر متّل صاحب میری تلاش کے ہاتھ آ گئے۔ انھیں دیکھ کر مایوسی بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ مایوسی اس لیے کہ ان کی جو شبیہ ان کی تحریروں سے گزر کر میں نے اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی، حقیقی متّل صاحب اس کے آس پاس کہیں نہ تھے اور خوشی اس امر کی کہ ڈھیروں قابلیت کو وہ کس عمدگی اور آسانی سے خود میں سموئے بے حد ہلکے پھلکے ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے جبکہ بے حد قلیل مدت میں ایسے لوگ بھی میں نے دیکھ ڈالے تھے جو اپنی واجبی قابلیت پر ہی کلف لگے کپڑے کی طرح اکڑے اینٹھے بات بھی کرتے تو گزوں دور محسوس ہوا کرتے تھے۔

الغرض پھر تو بار بار مڈبھیڑ ہوئی اور جلد ہی کچھ ایسے جلسے بھی ہوئے جن میں محترم متّل صاحب صدر اور

میں متفکر رہی - حالانکہ ہر بار میں اُن کے رعب تلے دَبی رہی - مگر ہر بار وہ بے حد خلوص اور بڑی اپنائیت سے ملے۔ ہمیشہ میرے ناچیز خیالات کی پیٹھ ٹھپکی اور ہم دونوں کی عمر اور مرتبے کے انتہائی تفاوت کے باوجود کبھی مجھے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ عظیم اور میں ناچیز ہوں - بلکہ خلوص کی ایک ایسی فضا ہمیشہ قایم رکھی کہ عمر اور مرتبے کا فرق ہر بار بھولا گیا اور صرف احساسِ دوستی پائیدار ہوتا گیا - یہ بھی اُن کے مزاج کا ایک رُخ اور وصف ہی ہے کہ نہ وہ کسی پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں نہ کسی کو خود پر حاوی ہونے یا خود سے کمتر ہونے کا احساس ہونے دیتے ہیں، نتیجتہً بڑی بڑی خوش گوار اور متوازن فضا میں مُلاقات سرانجام پائی اور چونکہ طویل ملاقات کے مواقع نہیں ملے - لہٰذا اُن کے ذخیرے سے صرف وہی حاصل کر سکی جو "تحریک" کے توسط سے ملا -

ادبی محفلوں کی ان مختصر مختصر ملاقاتوں کے بعد ویسے محترم مِتّل صاحب نے کئی بار کہا بھی . . . دو بدو اور فون پر کہ :

"آپ تیار رہیے گا - دفتر ختم کر کے آپ کو اپنے ساتھ لیتا چلوں گا . . ." مگر کئی بار کی معذرت کے بعد میں صرف ایک بار ہی ان کے گھر جا سکی - پھر یہ بھی اُن کے خلوص کا ثبوت ہی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً مجھ سے کہے بغیر اپنی ہی مرضی سے مختلف محفلوں کے لیے میرا نام اپنے طور پر تجویز کرتے رہے - اور میں ہمیشہ سرِ تسلیم خم کیے ان کا حکم بجالاتی رہی - اس طرح کم ملاقاتوں کے باوجود ایک مربوط اور مستحکم ربط ہمارے درمیان بنا رہا اور بنا رہے گا -

اس وقت کمار پاشی صاحب کی اس خواہش نے مجھے خاصہ پریشان کر رکھا ہے کہ جو خصوصی تحریری کام مِتّل صاحب کے متعلق وہ ترتیب دے رہے ہیں اس میں مجھے "بہر صورت" مِتّل صاحب پر کچھ نہ کچھ لکھنا ہے -

یہ صریحاً ایسی ہی بات ہے کہ کوئی کسی سے کہے ، ذرا روشنی دیکھ کر بتاؤ کیسی ہے . . . ؟ ارے صاحب روشنی تو روشنی ہی ہوتی ہے - جبلّی طور پر اِرد گرد کو بھی چمکانے کی صلاحیت سے مالا مال . . . یوں وقت اور موقعے کے حساب سے خواہ کیسی بھی ہو ہری ، نیلی ، نارنجی ، دودھیا ، سُنہری ، لیکن مشکل یہ ہے کہ اپنوں کا کہا ٹالنا مجھے آج تک تو آیا نہیں - لہٰذا سوال یہ ہے کہ لکھوں تو کیا لکھوں . . . ؟ جو شخص خود اتنا بڑا لکھاری ہے اور جس کی بابت نہایت وثوق سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اُس پر اب میرا لکھنا کیا سورج کو چراغ دکھانا نہیں . . . ؟ لیکن میں چونکہ دوستوں کو بہت بڑی اخلاقی قوت مانتی ہوں ، لہٰذا لکھ رہی ہوں کہ لکھنا بجائے خود بھی دلکش ہے - میرے خیالات دلکش ہوں نہ ہوں - طاقت ہے ، میں چاہے طاقتور نہ ہوں تو اب ذرا محترم مِتّل صاحب کا یہ کہا سنیے کہ :

اپنے انجام سے ڈرتا ہوں میں　　دل دھڑکتا ہے کہ سچا ہوں میں

یہ وجیہہ شعر پڑھ کر کیا آپ کو ہر سُولی اور صلیب کے باوجود سچائی کی جیت دوامی نظر نہیں آتی ——— ؟ اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ :

سکوں ہے گھر میں مگر اس کی لذتیں مت پوچھ
وہ زندگی جو سرِ رہ گذار گذری ہے!

تو سچ بتائیے کیا ان کے اندر کا فنکار بہت ایسا نظر نہیں آتا جسے کوئی پہرا اور رکاوٹ اپنے اعتماد و عزم کی راہ سے ہٹا نہیں سکتی۔ تجربے سمیٹنے سے روک نہیں سکتی کہ بغیر تجربات کے کوئی بھی چیز سالمیت تک پہنچ ہی کہاں سکتی ہے۔

اور اسی طرح جب وہ یہ کہتے ہیں کہ :

دل جلانے سے کہاں دُور اندھیرا ہو گا
رات یہ وہ ہے کہ مشکل سے سویرا ہو گا

تو کیا نیک نیتی اور خلوص کی اس سے بھی آسان کوئی شرح ہو سکتی ہے —— ؟ گردشِ دوراں سے خدشات کا کیسا نفیس شکوہ —— ! دوسری طرف

سلام ہو تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
یہ رسم عام ہے جو چاہے سر اٹھا کے چلے

تو غور فرمائیے کہ یہ ننھا سا شعر تمام ہندوستانیوں کے سکون، آزادیٔ زیست اور آسودگی کا کس قدر منظہر —— ؟

یا جب وہ یوں کہتے ہیں کہ :

صبحِ محشر قریب آ گئی ہے تو کیا اس قدر بھی ہو کیوں سرگراں دوستو
رقص جاری رہے، دَور چلتا رہے ایک شب ہے ابھی درمیاں دوستو

تو خطرات کے لیے ان کی آمادگی اور عمل۔ حرمتِ احساس کا سرور و نشہ اور ہر حال میں زندگی سے بے پناہ محبت کیا تصویر کی طرح سامنے نہیں آجائے گی —— ؟ لطف کا سنجیدہ ترین پہلو یہی ہے کہ وہ کسی حساب لینے والے سے گھبرائے ہوئے یا نادم نہیں بلکہ خود میں سرشار و سربلند کہ آؤ اور میرے سر کو جھکاؤ اور جان لو کہ یہ جھکنے کا نہیں ——

اور جب ان کے اس شعر کو پڑھیے کہ :

کیفِ تمام و نور سراسر ہے چاندنی !
کس کے فروغِ حسن کا منظہر ہے چاندنی !

تو آپ علانیہ اس محبوبیت تک جا پہنچیں گے جو آفاقی بھی ہو سکتا ہے اور آسمانی بھی۔ ارمان اور عرفان کی یہ یکجائی کیا ان کی فکری نزاکت اور فنی بصیرت کی دلیل نہیں —— ؟

پھر ذرا ان اشعار سے گزریے کہ :

کج کلاہی کی ادا یاد آئی!
لوٹے قاتل کی ہوا یاد آئی!
دل کے خوں ہونے کی جب بات چلی
اس کی خوشبوئے حنا یاد آئی

دیکھیے نا - ارضی محرومیوں اور آزمائشوں کی طرف کتنا خوبصورت اور بلیغ اشارا ہے یہ ——
اور پھر یہ کہ ——

شعر کہنے کا مزہ ہے اب تو
دل کا ہر زخم ہرا ہے اب تو
اتنا بے صرفہ نہ تھا دل کا لہو
باغ دامن پہ کھلا ہے اب تو

صبر آزمائیوں سے سرخرو نکل آنے کا کتنا حوصلہ - قطرہ قطرہ اپنے ہی لہو سے چمنِ اُمید آراستہ کرنے کی کتنی جراٴت مندانا توانا تحریک، کسی بھی طرح نا امید نہ ہونے کی کیسی زبردست ترغیب!
اور مزید یہ کہ لہجے کی کھنک پر حقیقت غالب ——

پورے ملبوس میں اس شخص کو ننگا دیکھو
چشمِ بینا ہے تو پھر یہ بھی تماشا دیکھو

اوپری خوش پوشی اور اندرونی ناپاکی پر کیسا بھرپور احتجاج اور کاری طنز جو نہایت عمدہ پیرائے میں اپنے عہد کی تمام تر سفاکی اور انسانی گراوٹ کو بہ یک جنبشِ خیال و قلم عیاں کیے دے رہا ہے۔
اور یہ کہ ——

سر میں ہوائے دشتِ جنوں ہے بھری ہوئی
شہرِ خرد کی خاک مگر چھانتا ہوں میں!

علم و ہنر اور آزادیِ تمنا دونوں سے ان کے شدید پیار کا بہترین امتزاج —— اور آخر آخر میں ان کا یہ کہنا کہ ——

مفلسی اور عاشقانہ مزاج
دینے والے یہ کیا دیا تو نے

خود ملاحظہ فرمائیے کہ خدا کے حضور کتنا معصوم اور پیارا شکوہ ہے جس میں شکایت کے ساتھ قناعت کا پہلو ذہن پر بڑا لطیف اثر چھوڑتا ہے۔
جہاں مثل صاحب کی نثر ہر غلو اور اغلاط سے پاک بے حد بردبار، منجھی ہوئی، مفصل اور

نہایت برمحل اپنے آپ میں مخمور نظر آتی ہے، وہیں ان کی شاعری مسائل و معنویت سمیٹے سوز و گداز اور حساسیت سے پُر زندگی کے پہلو بہ پہلو چلتی ہوئی، ساتھ ساتھ چلتوں کو نذرانۂ ہمت پیش کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور یقیناً یہی ہر عالم و فن کار کی پہچان ہے کہ جب تک وہ دوسروں کے آنسو نہیں روتا، اوروں کے درد تک نہیں پہنچ سکتا اس کے اپنے آنسو بڑے محدود اور بے معنی ہوتے ہیں۔۔۔ انسانیت کے دکھ درد سے واقف ہوئے بغیر زندگی گزارنے والے سراسر اُن مشینوں کی طرح ہیں جو صرف سوئچ سے چلتی اور سوئچ ہی سے رُک جاتی ہیں جو جذبات، کیفیات اور محسوسات سے عاری یکسر اور محروم ہوتی ہیں لیکن مِتّل صاحب اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی ہمیشہ اعلیٰ اور ارفع مقاصد کے لیے جی اور ہمیشہ باعمل رہے۔

●●

گوپال مِتّل

خُود نَوشت

> "۔۔ خُدا جانے اس کا سبب میرا اپنے مسلمان دوستوں پر کامل اعتماد تھا یا دیوانگی کی کوئی ترنگ تھی کہ میں نے اُسے بتا دیا کہ جس شخص کو وہ یہ رُوداد سُنا رہا ہے، وہ ایک ہندو ہے۔ اُس کا لہجہ فوراً ہی بدل گیا۔ کہنے لگا۔۔۔ اگر تم سے پرسوں ملاقات ہوئی ہوتی تو میں تمھیں ضرور قتل کر دیتا۔ لیکن کل پاکستان قائم ہوگیا ہے، اب تم میرے مہمان ہو۔۔"

میرے مزاج اور ذہن کی تشکیل میں میری ابتدائی زندگی کے ماحول کا بڑا دخل ہے۔ اس ماحول میں جو عوامل کارفرما تھے، ان کی منطقی توضیح میرے لیے ممکن نہیں کیونکہ منطق کو عمل کی کسوٹی ماننے کا ان دنوں رواج تھا ہی نہیں کفر و ایمان میں کوئی واضح خطِ امتیاز موجود نہیں تھا۔

میری ولادت ریاست مالیرکوٹلہ کی ہے۔ یہ غالباً واحد ریاست تھی جس کی بنیاد کسی صاحبِ سیف و سناں نے نہیں بلکہ ایک مجذوب حیدر شیخ نے رکھی تھی۔ شیخ وہ اپنے روحانی مرتبے کی وجہ سے کہلاتے ہیں۔ ویسے نسبتاً وہ پٹھان

تھے۔ میرے والد کا کہنا تھا کہ مجذوبیت کی شان حکمراں خاندان میں بدستور برقرار ہے۔ خاندان کے افراد میں سے کسی نہ کسی میں مجذوبیت کی ادا ضرور ہوتی تھی۔ اتنا میرے ذاتی علم میں بھی ہے کہ نواب احمد علی خاں مرحوم کے ایک بھائی تعویذ تقسیم کیا کرتے تھے۔ شیخ حیدر کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کا مقبرہ راتوں رات خود بخود تعمیر ہوگیا تھا اور اس میں چونے یا گارے کا مطلق استعمال نہیں ہوا۔ ایسا ہوا کہ نہیں، اس سے بحث نہیں، لیکن ریاست کے ہندو مسلمان سبھی اس پر متفق تھے کہ یہ محض روایت نہیں۔

یہ بھی مشہور تھا کہ حیدر شیخ کے نام پر جو شخص بھی اولادِ نرینہ کے لیے منت مانتا ہے، خدا اُس کی مُراد ضرور پوری کرتا ہے۔ منت پوری ہونے کے بعد شیخ کے مزار پر بکرے کی قربانی دینا ہوتی تھی لیکن منت ماننے والوں میں بہت سے ہندو بھی ہوتے تھے جن کے لیے قربانی دینا آسان نہیں تھا۔ درمیانی راہ یہ نکالی گئی تھی کہ منت ماننے والا ہندو بکرے کی گردن میں سُرخ دھاگا باندھ کر اسے مقبرے میں چھوڑ دیتا۔

کہا جاتا ہے کہ جب سرہند کے صوبہ دار نے گورو گوبند سنگھ کے بیٹوں کو دیوار میں چنوانے کا حکم جاری کیا تو ریاست کے اس وقت کے حکمراں نے احتجاج کیا تھا اور "آہ" کا نعرہ بلند کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سکھ ریاستوں میں گھرا ہونے کے باوجود ریاست مالیر کوٹلہ کی سرحدوں پر کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ریاست کے نوابوں نے اپنی شانِ کج کلاہی کو بھی برقرار رکھا۔ والد سُناتے تھے کہ ایک بار ریاست پٹیالہ کا کوئی ہندو اہلکار مہاراجہ کے عتاب سے بچنے کے لیے مالیر کوٹلہ بھاگ آیا۔ پٹیالے کی پولیس نے ریاستی حکام کی اجازت سے ریاست کی حدود میں داخل ہوکر اسے گرفتار کرلیا۔ جب اسے گرفتار کرکے لے جایا جارہا تھا تو اس کی زبان سے نکلا: "افسوس! مالیر کوٹلہ والوں نے بھی پناہ نہیں دی۔" یہ لفظ کسی مسلمان لکڑہارے نے سُن لیے، وہ کلہاڑی لے کر پٹیالہ پولیس کے مقابل آکھڑا ہوا۔ اور اہلکار سے کہا: "لالہ! بیٹھ جا" بات نواب صاحب تک پہنچی تو فرمایا کہ: "مہاراجہ پٹیالہ سے کہنا، ہم نے ان کا ایک مفرور رکھا، وہ ہمارے دو مفرور رکھ لیں۔ اتنی سی بات پر میں بھائیوں سے کیا جھگڑا کروں؟" چنانچہ لالہ جی مالیر کوٹلے ہی میں رہے اور اپنی باقیماندہ زندگی وہیں بڑے مزے میں بسر کی۔

حکمراں خاندان کے افراد پگڑی سکھوں کی طرح باندھتے تھے لیکن ان کی باقی عادات پاس پڑوس کے مہاراجاؤں سے کافی مختلف تھیں۔ رعایا کی بہو بیٹیوں کو اپنی بہو بیٹی سمجھتے تھے۔ قدیم دَور کے بارے میں مَیں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن نواب احمد علی خاں مرحوم نے شادیوں کے معاملے میں بھی شرعی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ ان کے معالج خصوصی میرے کرمفرما تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نواب صاحب کی شراب نوشی بھی صرف اس حد تک تھی کہ رات کے کھانے کے بعد برانڈی کا ایک پیگ لے لیا کرتے تھے۔

اپنے مذہب کے احترام کے باوصف، حکمراں خاندان میں مذہبی تعصب بالکل نہیں تھا بلکہ انتہا درجے کے روادار لوگ تھے۔ محل میں صرف عیدین ہی نہیں، ہولی اور دیوالی کے تہوار بھی منائے جاتے تھے۔ جو رواداری حکمرانوں میں تھی وہی رعایا میں بھی تھی۔ محرم کے دنوں میں ہندوؤں کی سبیلیں، مسلمانوں کی سبیلوں سے کچھ زیادہ ہی ہوتی تھیں۔

فرقہ وارانہ فساد ریاست میں کبھی نہیں ہوا۔ ایک بار کشیدگی ضرور پیدا ہوئی تھی جو باہر سے آنے والے پرچارکوں اور مولویوں کی رقابت کا نتیجہ تھی۔ مولویوں نے مسلمانوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ وہ ریاست کے حکمراں ہیں۔ نواب صاحب نے بہت سمجھایا کہ بھائی حکمراں تو میں ہوں، باقی لوگ خواہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا سکھ ہوں، میری رعایا ہیں۔ لیکن کچھ مسلمانوں کا گرمایا ہوا خون اعتدال پر نہ آسکا۔ آخر نواب صاحب کو سختی کرنا پڑ گئی۔ اس پر ایک مولوی صاحب نے مالیر کوٹلے کو دارالحرب قرار دے کر ہجرت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ ظاہر ہے جن مسلمانوں نے اس فتوے پر عمل کیا انھیں کافی پریشانیوں کا سامنا ہوا لیکن پھر رفتہ رفتہ سب واپس آ گئے۔

۴۷ ۱۹ء کے ہنگامے میں بھی مالیر کوٹلے کی زمین انسانی خون سے آلودہ نہیں ہوئی۔ جو مسلمان مالیر کوٹلے کی سرحد میں داخل ہو جاتا تھا، فسادی اس کا تعاقب چھوڑ دیتے تھے۔ یہ انتظام نواب صاحب نے ہی کر رکھا تھا کہ ان کی ہندو رعایا کو مہاجرین کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچے۔

ریاست کے ہندو مسلمانوں کے مراسم کچھ اس قسم کے تھے کہ بے تعصبی کا لفظ بھی ان کی پوری وضاحت نہیں کرتا۔ ایک دوسرے کے عقائد کا احترام وہ اس حد تک کرتے تھے کہ بعض صورتوں میں خود اپنے عقائد کا احترام بھول جاتے تھے۔ مثلاً شب برات کے موقع پر ہمارے گھر مسلمان احباب حلوہ لے کر آتے تھے۔ حلوے کا تھال ہندو حلوائی کے سر پر ہوتا۔ آنے والا دوست دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتا، والد صاحب باہر نکلتے تو ان سے مصافحہ کر کے ایک طرف کھڑا ہو جاتا۔ حلوہ گھر میں پہنچانا ہندو حلوائی کا کام تھا۔ انھیں کبھی خیال نہیں گزرتا تھا کہ اس طرح وہ ہندوؤں کے چھوت چھات برتنے کے حق کو تسلیم کر رہے ہیں۔ اس ماحول میں پلنے بڑھنے والا مذہبی منافرت اور تعصب کے مرض کا شکار کیوں کر ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اب لوگ جب میری بے تعصبی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ مجھے کوئی سند عطا کر رہے ہوں، تو مجھے حیرت بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔

میری ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلے ہی میں ہوئی۔ اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ ممنون میں منشی کریم بخش کا ہوں جنھوں نے مجھے فارسی پڑھائی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی لڑکا "گلستاں" اور "بوستاں" صحیح ڈھنگ سے پڑھ لے تو سمجھو اسے پوری فارسی آ گئی اور یہ بھی کہ "گلستاں" اور "بوستاں" صحیح ڈھنگ سے صرف وہی پڑھا سکتے ہیں۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ میں شام کے وقت پڑھنے جاتا، کبھی ایک گھر پر کبھی دوسرے گھر پر۔ ان کا طریق درس واقعی نرالا تھا۔ کبھی ایک شعر کی وضاحت میں پورا گھنٹہ صرف کر دیتے اور اس دن کا درس اسی شعر پر ختم ہو جاتا، اور کبھی صفحے کے صفحے پڑھا دیتے۔ شعروں کی تشریح وہ کچھ اس انداز سے کرتے تھے کہ اس میں زیر درس شعروں کے علاوہ بھی بہت کچھ آ جاتا تھا۔ مثنوی مولانا روم تک ظاہر ہے جس لڑکے کو "گلستاں" "بوستاں" اس ڈھنگ سے پڑھائی جائیں گی وہ وہاں قناعت نہیں کرے گا۔ اس لیے ان کا یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ جو لڑکا ان سے یہ دونوں کتابیں پڑھ لے اسے پوری فارسی آ جاتی ہے۔

منشی جی کے عقائد عجیب و غریب تھے۔ گوشت خوری کے وہ سخت خلاف تھے لیکن اسلامی طریقۂ ذبح کو وہ

دنیا میں افضل ترین مانتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جو طریقۂ طبخ گوشت جیسی چیز کو اتنا لذیذ بنا دیتا ہے وہ سبزیوں کو تو اور بھی لذیذ بنا سکتا ہے۔ اپنے سبھی ہندو دوستوں کو وہ اسلامی طریقۂ طبخ سے آگاہی حاصل کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ گوشت کے معاملے میں تو میں ان کی رائے کا قائل نہ ہو سکا لیکن یہ صحیح ہے کہ اگر بعض سبزیاں اسی طریقے سے پکائی جائیں جس طرح گوشت پکایا جاتا ہے تو لذیذ تر ہو جاتی ہیں۔

مذہباً وہ شیعہ تھے، اتنے کٹر شیعہ کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتیں صرف مرثیوں پر ہی نہیں بلکہ سرسیتوں[1] پر بھی صرف ہوتی تھیں۔ کبھی موج میں ہوتے تو سرسیہ بھی سنانے بیٹھ جاتے۔ ظاہر ہے کہ "گلستاں" کے باب پنجم کی تشریح وہ جس تفصیل سے کیا کرتے تھے اس کے بعد سرسیہ سنانے میں کوئی حجاب مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے بیٹے کا نام محمد جان تھا جو میرا ہم عمر بھی تھا اور دوست بھی، لیکن عجیب بات ہے کہ جو لطف منشی صاحب کی معیت میں میسر آتا تھا وہ محمد جان کی صحبت میں کبھی میسر نہیں آیا۔

مالیر کوٹلے میں سنیوں کی اکثریت تھی۔ اس سے منشی جی اتنے چڑے کہ ایک وقت ایسا آیا جب وہ اسلام ہی سے بیزار ہو گئے اور اپنے لڑکے کا نام محمد جان سے بدل کر گیان چند رکھ دیا۔

نویں جماعت میں میں لاہور چلا گیا۔ وہاں میرے اردو اور فارسی کے معلم جناب مولراج تھے۔ ششماہی امتحان میں اردو کے پرچے میں میرا مضمون انھیں اتنا پسند آیا کہ اسے دسویں جماعت کے لڑکوں کو جا کر سنایا اور یہ پیش گوئی کی کہ بڑا ہو کر یہ لڑکا ادیب اور شاعر بنے گا۔ لاہور سے میرا دل کچھ ہی مہینے میں اُچاٹ ہو گیا اور میں پھر مالیر کوٹلے پہنچ گیا۔ یہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر قریشی صاحب کا کرم تھا کہ انھوں نے مجھے نویں جماعت ہی میں داخلہ دے دیا۔ ورنہ میں ایک سال پیچھے رہ جاتا۔ قریشی صاحب ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے۔ لیکن جہاں تک ان کی ضابطہ پسندی کا تعلق تھا، وہ اس میں کسی رعایت کے قائل نہیں تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بار صرف پانچ منٹ دیر سے پہنچنے پر انھوں نے مجھے ساری کلاس کے سامنے بید لگائے تھے۔

مالیر کوٹلے میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ذوق تھا۔ شیخ بشیر حسین بشیر جو ریاست کے اعلیٰ اہلکار بھی تھے، اپنی کوٹھی پر مہینے میں دو بار طرحی مشاعرے کا اہتمام کرتے تھے اور ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی فوج موجود تھی۔ شیخ بشیر داغ کے انداز میں شعر کہتے تھے۔ دلی ان کا آبائی وطن تھا اور ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اچھی ملازمت کی تلاش میں دلی نہ چھوڑتے تو داغ کو واقعی ایک جانشین مل جاتا۔ دوستوں کے کہنے پر ایک بار ان کے مشاعرے میں میں بھی شریک ہوا۔ جو غزل پڑھی تھی اس کا ایک شعر آج تک یاد ہے:

جو بظاہر کشتگانِ شیوۂ تسلیم ہیں
ایک چنگاری نہاں ان کے بھی آب و گل میں ہے

---

[1] ایک صنفِ سخن جس میں حضرت علی کے سوا باقی خلفا کی قدح کی جاتی ہے اور بہت دانشگاف ہجے ہیں۔

اس شعر پر مجھے داد تو ملی لیکن اس کے بعد مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ کبھی نہیں ملا۔ غالباً شعر کے مفہوم میں کوئی خطرناکی تلاش کر لی گئی تھی۔ بہر حال میں نے جلال میرزا خانی سے مل کر جو تقریباً میرے ہم عمر تھے، ایک متوازی انجمن قائم کر لی۔ اور اس انجمن کے زیر اہتمام مالیر کوٹلے میں پہلی بار غیر سرکاری طور پر کل ہند مشاعرہ ہوا جس میں اختر شیرانی اور اس دور کے متعدد دوسرے نامور شاعروں نے شرکت کی۔

ایف۔ اے۔ امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے پھر لاہور جانا پڑا کیونکہ مالیر کوٹلے میں ایف۔ اے۔ کے بعد تعلیم کا انتظام نہیں تھا۔ لاہور پہنچ کر طبیعت کا لاابالی پن کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا۔ ذوقِ شعری کی وجہ سے شاعروں اور ادیبوں میں گھِر جانا تو قدرتی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کشتی رانی اور برج کھیلنے کا چسکا بھی پڑ گیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر میں بی۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہو گیا تو اسے ایک اتفاقی حادثہ سمجھنا چاہیے۔

بی۔ اے کرنے کے بعد فکرِ معاش لاحق ہوئی تو لدھیانے جا کر "صبحِ امید" کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کر دیا ریاست مالیر کوٹلہ کا باشندہ ہونے کی وجہ سے مجھے براہِ راست ڈیکلریشن چونکہ نہیں مل سکتا تھا اس لیے ڈیکلریشن ایک مقامی دوست منصور لدھیانوی کے نام پر لیا گیا۔ منصور بہت اچھے غزل گو تھے اور شعر و ادب، بالخصوص غزل پر بھی ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ "صبحِ امید" کے پہلے شمارے میں انھوں نے حالی کی غزل گوئی پر مضمون لکھا تھا وہ بہت پسند کیا گیا تھا۔ منصور کے علاوہ لدھیانے میں جن دوستوں کا قرب حاصل ہوا، ان میں نظیر حسین خاں نظیر لدھیانوی، بال مکند عرش ملسیانی اور ایم۔ حسن لطیفی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نظیر لدھیانوی اور عرش ملسیانی نے دفتر اور رہائش کے لیے مجھے اپنے پڑوس ہی میں جگہ لے دی تھی۔ گلی کے ایک کونے میں عرش کا مکان تھا اور دوسرے نکڑ پر نظیر کا۔ نظیر مدیر اعزازی کی حیثیت سے میرے شریکِ ادارت بھی تھے اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے میری سرگرم مدد کی۔

"صبحِ امید" شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو پسند آیا۔ لاہور سے اختر شیرانی اور دوسرے دوستوں نے اس کے لیے اپنی چیزیں بھیجی تھیں اور اسد ملتانی نے خیر مقدمی رباعی کہی تھی جو مجھے آج تک یاد ہے:

برخیز کہ گردوں بہ مرادت گردید
برخیز کہ رُخ نمود صبحِ اُمید
تا جوشش زندخوں بہ رگ و ریشۂ تو
برخیز و بخور بادہ ز جامِ خورشید

سب سے بڑی داد مجھے اس شمارے کی یہ ملی کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اپنے سہ ماہی رسالے "اردو" میں اس پر تبصرہ کیا۔ تبصرہ مجموعی طور پر ہمارے حق میں تھا البتہ دو ایک مضامین کے طرزِ نگارش کو (جو میری یا نظیر کی تصنیف نہیں تھے) زیادہ شوخ قرار دیا گیا تھا۔ تبصرے میں "صبحِ امید" کے اغراض و مقاصد پر بحث تھی۔ پرچے کا ایک مقصد ہم نے اُردو زبان کا تحفظ قرار دیا تھا۔ بابائے اُردو نے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور اس پر مسرت کا اظہار

کیا تھا کہ ابھی ایسے ہندو موجود ہیں جو اُردو زبان کے تحفظ و ترقی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مَیں اس تبصرے پر بہت خوش تھا، لیکن اپنے ہندو ہونے کا ذکر مجھے پسند نہیں آیا تھا کیونکہ زندگی ایسی رہی تھی کہ ان خطوط پر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

لدھیانے میں جن لوگوں سے اس زمانے میں تعلق رہا ان میں ایم۔ حسن لطیفی کی شخصیت انتہائی دلچسپ ہی نہیں بلکہ عجوبۂ روزگار تھی۔ موصوف مغرب سے صحافت کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ اچھے شاعر تھے اور علم کی بھی ان کے پاس فراوانی تھی۔ لیکن صحافت کی ڈگری کے ساتھ ساتھ وہ یورپ سے یہ خبط بھی لے کر آئے تھے کہ وہ مہدیٔ موعود ہیں۔ وہ تنہا نویسی کے اصول پر ایک پندرہ روزہ پرچہ نکالتے تھے۔ اس میں ان کی نظمیں بھی شایع ہوتی تھیں اور مضامین بھی۔ پرچے میں وہ اپنے مہدیٔ موعود ہونے کا پروپیگنڈہ کرتے تھے اور "نظریۂ مہدویت" کے نام سے انھوں نے ایک کتابچہ بھی لکھا تھا۔ پرچے پر مقامِ اشاعت لدھیانے کی بجائے ارضِ لُد لکھا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بشارتوں کے مطابق مہدیٔ موعود ارضِ لُد سے اُٹھے گا اور لدھیانہ ہی ارضِ لُد ہے۔ کتابچے سے ان کا مہدیٔ موعود ہونا خواہ ثابت نہ ہوتا ہو لیکن ان کے کثیر المطالعہ ہونے کا ثبوت ضرور ملتا تھا۔ انھوں نے ماضی کی بشارتوں کا سہارا لے کر بڑے پُرپیچ استدلال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان کی ذات میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو مہدیٔ موعود میں پائی جانی چاہئیں۔ اپنے دعویٔ مہدویت کی تائید میں وہ اقبال کا یہ شعر بھی استعمال کیا کرتے تھے:

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

اس سے خیال ہوتا تھا کہ مہدویت ان کے نزدیک وہبی نہیں بلکہ اکتسابی چیز تھی اور ان کے دعوے میں صرف جنون ہی کو دخل نہیں تھا۔ شاید انھوں نے اپنے طور پر ایک چال چلی تھی جو ناکام ہو گئی۔ اسباب خواہ کچھ ہوں نتیجہ عبرت ناک تھا۔ مہدویت کے پرچار میں ان کی دولت بھی ٹھکانے لگ گئی اور صحت بھی۔ جب مَیں اُن سے ملا تھا تو وہ دھان پان سے رہ گئے تھے۔ سُنا ہے کہ تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ پھر ان کا کیا حشر ہوا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

"صبحِ اُمید" کا صرف ایک شمارہ نکلا۔ اس کے بعد مَیں کچھ دن تک لدھیانے میں آوارہ گردی کرتا رہا پھر مالیر کوٹلے میں چند روزہ قیام کے بعد لاہور کا رُخ کیا۔ لاہور پہنچ کر ایک گونہ اطمینان ہوا کہ میرے ادیب اور شاعر دوست "صبحِ امید" کی ناکامی پر میرا مذاق نہیں اُڑا رہے تھے۔ انھیں مجھ سے ہمدردی تھی اور وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ مجھ میں ادبی کام کرنے کی صلاحیت ہے لیکن اس پر وہ سبھی متفق تھے کہ شعر و ادب کو ذریعۂ معاش بنانا ممکن نہیں۔ ایک اچھا مضمون لکھ کر یا اچھا شعر کہہ کر داد وصول کی جا سکتی تھی، معاوضہ نہیں۔ میرزا عظیم بیگ چغتائی کے چچیرے بھائی فہیم بیگ چغتائی اور احسان دانش میرے اچھے دوست تھے لیکن وہ دونوں خود پریشان حال تھے۔ اختر شیرانی کا معاملہ یہ تھا کہ:

مَیں تو خود اپنے بھی کوئی کام آسکتا نہیں!

صرف حفیظ جالندھری تھے جن سے کچھ توقع کی جاسکتی تھی۔ انھوں نے میری مدد میں کسی بخل سے کام بھی نہیں لیا۔ اس دور کے بہترین ادیبوں سے میرا تعارف کرایا جن میں محمود دین تاثیر، پطرس بخاری، صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم، عبدالمجید سالک، پنڈت ہری چند اختر بھی شامل تھے۔ یہ لوگ مروّت سے پیش آئے لیکن معاش کا مسئلہ اُن دنوں تھا ہی ٹیڑھا۔ آخر روزناموں کے دفتروں کا رُخ کیا اور وہاں کام مِل بھی گیا لیکن طبیعت لگی نہیں۔ ادبی زندگی کو ازسرِنو شروع کرنے میں احسان دانش میرے معاون ہوئے۔ انھوں نے میرا تعارف مولانا تاجور نجیب آبادی سے، جنھیں بعد میں شمس العلماء کا خطاب ملا، کرایا۔ غالباً تیسری یا چوتھی ملاقات میں مولانا تاجور نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کے ادبی جریدے "شاہکار" کی ادارت سنبھالوں۔ یہ پیش کش میرے لیے نعمت سے کم نہیں تھی اور میں نے اسے شکرگزاری کے ساتھ قبول کرلیا۔

"شاہکار" میں میری تنخواہ صرف تیس روپے تھی لیکن دفتر میں میرے لیے باقاعدہ حاضری ضروری نہیں تھی۔ میری ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ پرچہ مرتب کرکے اسے بروقت شایع کردوں۔ "شاہکار" کے بیشتر لکھنے والے ایسے تھے جن کی تحریروں پر نظرِثانی کی ضرورت نہیں تھی۔ خانہ پُری کے لیے ابو محمد امام الدین رام نگری کے مضمون ہر وقت موجود رہتے تھے جو آٹھ آنے فی صفحہ کے حساب سے چھپتے تھے۔ ابو محمد امام الدین کے علاوہ آسی رام نگری کے مضامین بھی انھیں شرائط پر چھپتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے بھیجے ہوئے بیشتر مضامین ہندی جرائد سے ترجمہ شدہ ہوتے تھے۔ ان کی طرف سے یہ اجازت بھی تھی کہ یہ مضامین کسی بھی نام سے شایع کیے جاسکتے ہیں۔ اگر کسی مہینے مضامین کی قلت ہوتی تو ان حضرات کے مضامین مختلف ناموں سے شایع کردیے جاتے۔ یہ نام زیادہ تو فرضی ہوتے لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا تاجور نے کسی کو نوازنا چاہا تو مضمون اس کے نام پر شایع کردیا۔ ادارتی نوٹ "مختصرات" کے عنوان سے مولانا خود لکھتے تھے لیکن مجھے ہدایت تھی کہ اگر بروقت یہ مجھے نہ ملیں تو میں خود ہی لکھ دیا کروں۔

مجھے ملازم رکھتے وقت مولانا نے یہ وعدہ بھی فرمایا تھا کہ تنخواہ کے علاوہ مجھے منافع میں بھی ۵۰ فیصد کا شریک سمجھا جائے گا لیکن جتنی مدت میں وہاں رہا، مولانا کے بیان کے مطابق پرچے میں خسارہ ہی ہوتا رہا۔ ۔ ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے نہ تو ان کے وعدے پر کبھی سنجیدگی سے بھروسہ کیا اور نہ کبھی اس کی یاددہانی ہی کرائی۔

تنخواہ کی کمی کے مسئلے کا حل جلد ہی نکل آیا۔ "شاہکار" کے دفتر کے قریب ہی ایک مکان پر "جگت لکشمی" کا سائن بورڈ نظر آیا۔ یہ ایک ہفت روزہ فلمی جریدہ تھا جسے کرن دیوان، جو آگے چل کر فلمی ہیرو بنے، نکال رہے تھے۔ کرن دیوان سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ انھیں کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو اُن کے اخبار کے لیے اڈیٹوریل وغیرہ لکھ دیا کرے۔ میں نے تیس روپے ماہوار پر یہ ذمہ داری قبول کرلی۔

"جگت لکشمی" باقاعدہ شایع نہیں ہوتا تھا اور کرن دیوان اکثر مالی مشکلات میں مبتلا رہتے تھے۔ مجھے تنخواہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی تھی اور اوسطاً بیس پچیس روپے ماہوار ہی پڑتے تھے۔ لیکن دفتر کو کرن دیوان خوب سجاکر

رکھتے تھے۔ میں اپنا زیادہ وقت وہیں گزارتا اور "شاہکار" کا کام بھی وہیں بیٹھ کر کرتا تھا۔ ملنے والوں کا بھی، جو اکثر "شاہکار" کے سلسلے میں آتے تھے، وہیں جمگھٹا رہتا۔

مولانا تاجور کا سلوک میرے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔ انھوں نے "شاہکار" کے قارئین سے میرا تعارف بہت اچھے لفظوں میں کرایا اور میری نثر اور میری شاعری کی دل کھول کر تعریف کی۔ ایک مرتبہ انھوں نے میرے ایک شعر پر ایک اچھا خاصا مضمون لکھ دیا۔ شعر تھا:

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

میرا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت میں مولانا کی تحریر کا بڑا دخل ہے۔

ادارتی معاملات میں بھی مولانا تاجور نے مجھے پوری آزادی دے رکھی تھی۔ میرا نام پرچے پر مدیر معاون کی حیثیت سے چھپتا تھا لیکن مضمون نگاروں کو خطوط میں اپنے ہی نام سے لکھتا تھا اور مضامین کو رد یا قبول کرنے کا بھی مجھے پورا اختیار تھا۔

مولانا تاجور کا دل مذہبی اور علاقائی تعصب سے بالکل پاک تھا۔ پنجاب میں اُردو کے فروغ میں ان کا حصّہ مولوی محمد حسین آزاد کے بعد غالباً سب سے زیادہ ہے۔ ان کے دوستوں اور نیاز مندوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندو اور سکھ تھے اور یو۔پی والوں سے کہیں زیادہ پنجابی۔ ایک بار اپنے نوٹ میں اُردو کے پنجابی اہلِ قلم کے متعلق انھوں نے کچھ سخت باتیں لکھ دیں۔ یہ نوٹ مجھے ملا تو میں نے احتجاج کیا کہ جس رسالے کا مدیر معاون پنجابی ہو اس رسالے میں یہ تحریر شایع نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا کا فوراً جواب ملا کہ آپ رسالے کے ایڈیٹر ہیں اور میں آپ کا مضمون نگار، آپ کو میری تحریر مسترد کرنے کا حق بھی ہے اور اس میں ترمیم کا بھی . . . یہ اُن کی کشادہ دِلی کی ایک مثال ہے۔

دفتری امور کے سلسلے میں مولانا سے کچھ زیادہ ملنا نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے فیضانِ صحبت سے محروم رہا۔ جب بھی کوئی اہم ادیب یا شاعر ان سے ملنے آتا تو وہ مجھے بھی بلا لیتے۔ شام کے بعد یوں بھی میں اکثر ان سے ملنے چلا جاتا تھا۔ اگر میں یہ اعتراف نہ کروں تو بڑی ناشکر گزاری ہوگی کہ میرے ادبی ذوق کی نشوونما میں ان صحبتوں کا بڑا دخل ہے۔

مولانا دھڑلے کے آدمی تھے اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی دوستوں کے ساتھ دشمن بھی بناتا ہے۔ اور دشمن دوستوں سے زیادہ بااصول اور سرگرم ہوتے ہیں۔ مولانا کے سب سے بڑے حریف حفیظ جالندھری تھے . . . دونوں میں ہمیشہ چپقلش رہی۔ لاہور کے تقریباً سبھی ادیب اور شاعر ان میں سے کسی ایک کے دوست اور دوسرے کے دشمن تھے۔ میں اُن معدودے چند لوگوں میں تھا جن کے اُن دونوں کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے "شاہکار" کی ملازمت اختیار کی تو اس کے بعد پہلی ہی ملاقات میں حفیظ نے پوچھا تھا:

"تم وہاں بیٹھ کر میری برائی کرتے ہوگے . . . ؟" جواب میں میں نے کہا تھا:

"کیا کبھی مَیں نے تمھارے سامنے تاجور کی بُرائی کی ہے؟" میرے اس جواب نے حفیظ کو مطمئن کردیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے یہ اصول بنائے رکھا کہ ان کی باہمی چپقلش سے الگ رہ کر دونوں ہی کے ساتھ اپنے نیازمندانہ تعلقات قایم رکھوں۔

مولانا تاجور کا یہ کہنا تھا کہ جن لوگوں نے ان کی ملازمت کی وہ ان کی ملازمت چھوڑنے کے بعد گردشِ روزگار کا شکار ہی رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا شمار ان لوگوں میں نہیں لیکن میں اُن سے لڑ کر الگ نہیں ہوا تھا۔ ملازمت کا تعلق ختم ہونے کے بعد بھی وہ مجھے اپنے نیازمندوں کے زمرے میں شمار کرتے رہے۔ اور میرے دل میں بھی آج تک ان کے لیے ویسا ہی احترام ہے۔

کرن دیوان کے ساتھ بھی میرا اچھا نباہ ہوا۔ مَیں ان کی مالی مشکلات سے آگاہ تھا اس لیے جس ماہ وہ مجھے پوری تنخواہ نہ دے سکتے تھے میں کوئی احتجاج نہ کرتا تھا۔ "جگت لکشمی" سے وابستگی کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ایک آراستہ کمرہ اُٹھنے بیٹھنے کے لیے میسر آگیا تھا۔ سنیما کے پاس بھی مجھے مل جاتے تھے۔ خود بھی دیکھتا اور کبھی کبھی اپنے ادیب دوستوں کو بھی ساتھ لے جاتا۔ ادارتی صفحات پر میری اجارہ داری تھی۔ دوستوں کے حق میں اور دشمنوں کے خلاف جو چاہتا لکھ دیتا۔ صرف فلمی معاملات میں مجھے کرن دیوان کی مصلحتوں کا ساتھ دینا ہوتا تھا۔

فلمی جرائد میں اُن دنوں یہ عام رواج تھا کہ افسانے اور نظمیں غزلیں وغیرہ ادبی جرائد سے نقل کر لی جاتی تھیں۔ "جگت لکشمی" میں بھی یہی ہوتا تھا اور ادیب یا شاعر اس پر معترض نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ اُلٹے خوش ہوتے کہ انھیں ایک اور حلقے میں شہرت مل رہی ہے۔ کرشن چندر میرے دوست تھے۔ ان کا ہر افسانہ مَیں "جگت لکشمی" میں نقل کردیا کرتا تھا۔ ایک بار انھوں نے "قبر" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔ مَیں نے اس افسانے کو "سچی کہانی" کے عنوان سے شایع کردیا اور کچھ ضمنی عنوان بھی قایم کردیے۔ جس روز "جگت لکشمی" کا یہ شمارہ شایع ہوا اس کے دوسرے یا تیسرے دن کرشن چندر اور کنہیا لال کپور سے ملاقات ہوئی تو کپور بُری طرح برہم تھے۔ ہوا یہ تھا کہ کرشن چندر نے کہانی میں ان کا ہی نہیں، ان کے گاؤں کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ یہ کہانی "سچی کہانی" کے عنوان سے شایع ہوئی تو رشتہ داروں اور جان پہچان کے لوگوں میں پروفیسر صاحب کی کافی رسوائی ہوئی۔ بہر حال کپور کا غصہ دیرپا نہیں تھا وہ جلد ہی من گئے۔ کہنے لگے جب مَیں نے یہ پرچہ دیکھا تو پہلے جی میں آیا کہ اس کی تمام کاپیاں خرید کر جلا ڈالوں۔ لیکن پھر سوچا کہ اس سے تو "جگت لکشمی" کو اُلٹا فائدہ پہنچے گا۔ مقدمے کی سوجھی تو خیال آیا کہ اور رسوائی ہوگی۔ تمھاری پٹائی اس لیے نہیں کرسکتا کہ تم مجھ سے طاقتور ہو، لہٰذا معاف ہی کیے دیتا ہوں۔

"شاہکار" کے دفتر کے قریب ہی ایک ریستوران تھا جو عرب ہوٹل کہلاتا تھا۔ یہ لاہور کے آڑے ترچھوں کا اڈہ تھا۔ ان میں زیادہ تر ادیب، شاعر اور صحافی تھے جو ایسے اداروں میں کام کرتے تھے جہاں تنخواہ

قلیل ملتی تھی، بر وقت نہیں ملتی تھی اور کسی ماہ ناغہ بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ اپنے حال میں مست رہتے تھے اور اپنی زندہ دلی پر غمِ زمانہ کی پرچھائیاں نہیں پڑنے دیتے تھے۔

عرب ہوٹل بڑا ہی غریب نواز تھا۔ دو کبابوں، نصف نان اور چائے کی ایک پیالی میں صبح کا ناشتہ ہو جاتا تھا اور بھنے ہوئے گوشت کی نصف پلیٹ اور ایک نان میں ایک وقت کا کھانا۔ وہاں کے بیٹھنے والوں میں بھائی چارہ بھی بہت تھا۔ اگر کسی کی جیب میں پیسے نہیں ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ چائے سگریٹ یا کھانے سے محروم رہے۔ . . چراغ حسن حسرت اس مجلس کے میر تھے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ "الہلال" میں کام کیا تھا۔ "زمیندار" میں وہ فکاہات کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔ جس کی اُن دنوں بڑی دھوم تھی۔ اس کالم میں اتحاد پارٹی کا انھوں نے جو قصیدہ لکھا تھا وہ زبان زدِ خاص و عام تھا۔

تیرا یار زمیندار ناتھ - اتحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے ساتھ - اتحاد پارٹی

اپنے اسی انداز میں انھوں نے پنجاب کا سیاسی جغرافیہ بھی لکھا جس میں پنجاب کی سیاسی شخصیتوں پر بہت دلچسپ چوٹیں کی تھیں۔ زبان پر انھیں بلا کا عبور تھا۔ کچھ دیومالائی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ یہ کہانیاں انھوں نے سٹیٹ اردو میں لکھی تھیں لیکن اگر اس کتاب کو دیوناگری میں چھاپ دیا جاتا تو ہندی والے انھیں ہندی کا بڑا لکھاڑی ماننے پر مجبور ہو جاتے۔ ادب اور سیاست میں ان کی معلومات وافر تھیں۔ قدرتی تھا کہ ایسا آدمی مبتلائے زعم ہو جائے چنانچہ وہ اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور قول و فعل کے ہر تضاد کو اپنے لیے روا رکھتے تھے۔ یہ ان کا عام شیوہ تھا کہ رمضان کے دنوں میں عرب ہوٹل میں چائے کی پیالی سامنے رکھ لیتے، چسکیاں لیتے رہتے اور روزے کے فضائل بیان کرتے جاتے۔ ان کے کمال کے سبھی معترف تھے اس لیے کوئی حرف گیری نہیں کرتا تھا۔

میری ان کی ملاقات کی ابتدا نوک جھونک سے ہوئی۔ مجھے اُن دنوں نزلہ اکثر رہتا تھا۔ کسی نے مجھے بہکا دیا کہ دائمی نزلے کا تیر بہدف علاج کسی مشہور ڈاکٹر نے یہ بتایا ہے کہ آدمی سر پر پگڑی باندھنے لگے۔ میں نے اس نسخے کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ انھی دنوں عرب ہوٹل میں میری آمد و رفت شروع ہوئی۔ دوسرا تیسرا دن تھا کہ حسرت صاحب نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا: "جوتشی جی! ذرا میرا ہاتھ تو دیکھیے"۔ میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چند منٹ غور سے دیکھنے کے بعد جواب دیا: "حسرت صاحب! میں مجبور ہوں، آپ نے تو کثرتِ استعمال سے اپنے ہاتھ کی لکیریں ہی مٹا ڈالی ہیں"۔ عرب ہوٹل کے قلندر غالب کے طرفدار بھی لیکن سخن فہم بھی تھے۔ میرے فقرے پر اس زور کا قہقہہ پڑا کہ چھت ہل گئی۔ خود حسرت صاحب نے بھی بات کا مزہ لیا اور اس کے بعد ان کی میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔

عرب ہوٹل کے حاضر باشوں میں ایک انتہائی دلچسپ شخصیت باری علیگ کی تھی جو خود کو اشتراکی ادیب لکھتے تھے۔ اصلی نام غالباً عبدالباری تھا۔ اشتراکی بنے تو عبدیت پرسے ان کا ایمان اُٹھ گیا اور صرف باری رہ گئے۔ "کمپنی کی حکومت" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو کئی بار چھپی۔ کچھ کتابچے بھی انھوں نے لکھے اور مختلف اخباروں میں بھی کام کرتے رہے تھے۔ بڑے ہی آزاد خیال اور قلندر صفت آدمی تھے۔ جن دنوں وہ "شہباز" میں کام کرتے تھے، کچھ دوستوں نے کہا کہ اگر وہ بنیٹ اُتار کر "شہباز" کے دفتر سے عرب ہوٹل تک ہو آئیں تو، ایک شاندار دعوت ہوگی۔ باری واقعی تیار ہوگئے اور جو کہا تھا کر گزرے۔ اس کا طریقہ انھوں نے یہ اختیار کیا کہ چلتے چلتے سینہ کوبی کرتے جاتے تھے اور یا علی یا علی کے نعرے بھی لگاتے جاتے تھے۔ راہ گیروں نے مجذوب سمجھ کر نظر انداز کردیا اور وہ شرط جیت گئے۔

سیاسی بحث میں قلندروں کے درمیان تلخی پیدا ہوتے کبھی نہیں دیکھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ وہ اپنے محدود دائرے سے باہر کی ہر جگہ کو غیر حقیقی سمجھتے تھے۔ اگر کبھی کوئی ناواقفِ آدابِ قلندری محفل میں آدھمکتا اور کسی بات پر مشتعل ہو اٹھتا تو رنگِ محفل دیکھ کر اس کی طبیعت از خود اعتدال پر آجاتی تھی ——

احسان دانش کے ایک شاگرد نے موچی دروازے کے پاس "منزل" کے نام سے ایک ریستوران کھول رکھا تھا۔ کبھی کبھی قلندروں کا قافلہ ادھر بھی جا نکلتا۔ ایک دن محفل وہاں جمی ہوئی تھی اور حسبِ معمول دُنیا کی ہر چیز کا مذاق اُڑایا جارہا تھا کہ یکایک پاس کی میز سے ایک نوجوان اُٹھا اور خالی کرسی پر بیٹھ کر جوتوں سمیت اپنے دونوں پاؤں قلندروں والی میز پر دے مارے۔ وہ خاکسار تحریک میں نیا نیا شامل ہوا تھا اور یہ دیکھ کر اسے بڑا اشتعال آیا تھا کہ یہ لوگ سیاسی لیڈروں کا ذکر اس بے حرمتی سے کر رہے ہیں۔ چھوٹتے ہی بولا: "تم کفر بک رہے ہو، میں تمھیں قتل کردوں گا۔" اس سے پوچھا گیا کہ آخر اسے یہ یقین کیوں ہے کہ وہ قاتل ہی ہوگا، مقتول نہیں۔ تو اس نے جواب دیا۔ . . "میں سچا مسلمان ہوں۔ اگر قتل ہوا بھی تو جنت میں جاؤں گا۔" اس مرحلے پر میری رگِ ظرافت پھڑکی اور ملتجیانہ انداز میں میں نے اس سے کہا: "صاحبزادے! اس عمر میں جنت میں نہ جانا، جنتی کہیں آپ کو غلمان نہ سمجھ لیں۔" اس فقرے پر قلندروں کا جو حال ہوا وہ تو ظاہر ہے لیکن اس نوجوان کا ردِ عمل بھی مزید اشتعال کی بجائے مجذوب سی ہنسی میں ظاہر ہوا۔ کوئی تین چار ہفتے کے بعد مجھے انارکلی میں ملا تو بالکل بدلا ہوا تھا۔ بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔ . "بسمل صاحب میں نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اب میں شراب پیتا ہوں، گانا سنتا ہوں۔ . . " یہ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ انتہا پسند طبائع جب ایک انتہا پسندانہ روش کو خیرباد کہتی ہیں تو فوراً ہی وہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتی ہیں۔ کیا انسان بنیادی طور پر کبھی بدلتا ہی نہیں؟

اختر شیرانی کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ وہ اپنے دور کے مقبول ترین شاعر تھے۔ ایک امیر اور انتہائی ذی وقار باپ کے بیٹے تھے۔ ادب اور شاعری ان کے لیے پیشہ نہیں شغلہ تھے۔ ان کی شاعری کے رومانی ماحول،

ان کی مے نوشی اور آوارہ مزاجی نے انھیں شعر و ادب کی دُنیا کا رُومانی شہزادہ بنا دیا تھا۔ رُومانی شہزادہ بننا آسان ہے لیکن بنے رہنا اتنا آسان نہیں۔ لوگ رومانی شہزادے سے ہمہ وقت مافوق الفطرت کارناموں کی اُمید رکھتے ہیں۔ اور یہ کسی گوشت پوست کے انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

اپنے والد حافظ محمود خاں شیرانی سے قریب قریب ان کا قطع تعلق ہو چکا تھا۔ جو شخص دوسروں کو پانی کی طرح شراب پلاتا تھا وہ اب شراب کے لیے دوسروں کا دستِ نگر تھا۔ اس بنا پر لوگ اختر سے کنی بھی کترانے لگے تھے لیکن جو لوگ اُن پر اس قسم کے الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے باقاعدہ دریوزہ گری شروع کر دی تھی، وہ غالباً ذاتی تجربہ بیان کرنے کی بجائے سُنی سُنائی باتیں دہراتے ہیں۔ اختر نے شرافتِ نفس کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ رُوپے پیسے کو وہ آخری وقت تک حقارت سے دیکھتے رہے۔ اور بے تکلف دستِ سوال بڑھا دینا ان کے بس ہی میں نہیں تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے —— دوپہر کے وقت میں اپنے گھر پر لیٹا ہوا تھا کہ کرشن اتر نے آکر کہا کہ نیچے اختر شیرانی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ نیچے گیا تو اختر شیرانی تانگے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے —— آؤ چلیں۔ میں نے کہا اُوپر جا کر کپڑے بدل آؤں۔ کہنے لگے نہیں ایسے ہی چلو۔ میں ان کی بات کو کم ہی ٹالتا تھا۔ تانگے میں بیٹھ گیا۔ جب تانگہ آدھ گھنٹے کے قریب چلتا رہا تو میں نے پوچھا کہ آخر جانا کہاں ہے؟ تانگہ رُکواتے کیوں نہیں؟ بولے پیسے جو نہیں۔ میں نے کہا —— اختر صاحب! جب میں نے کپڑے بدلنے کی بات کی تھی تو مطلب یہی تھا کہ کچھ پیسے لے لوں۔ آپ کے انکار سے میں سمجھا ضرورت نہیں۔ بہر حال تانگہ اس وقت انار کلی سے گزر رہا تھا۔ وہاں میرے ایک عزیز کی دکان تھی، میں نے اس سے پندرہ رُوپے اُدھار لے لیے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر "ملاپ" اخبار کا دفتر تھا۔ اچانک اختر کی نظر زبیر پر پڑ گئی۔ زبیر انھیں اپنے دفتر میں لے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کی جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا لیکن شام تک یہ سب روپے خرچ ہو چکے تھے۔ جو بھی ملا اختر نے اس کی دعوت کر ڈالی۔

اختر بلانوش بھی تھے، آوارہ گرد بھی۔ لیکن طبعاً انتہائی شریف تھے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی خاتون کے لیے نازیبا کلمہ کبھی نہیں سُنا اور اُن کی عشق کی داستانیں بھی اکثر قیاسی ہیں۔ سلمیٰ، عذرا، ریحانہ، ایک شاعر کے ذہنی ہیولے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا پرتو اختر نے کہیں دیکھ لیا ہو لیکن وہ پوری طرح مادی طور پر متشکل کبھی نہیں ہوئے۔ اختر تصوف کی شاعری کے سخت خلاف تھے اور ایک مرتبہ ان کے کسی شعری مجموعے میں سے میں نے تصوف کا ایک شعر ڈھونڈ نکالا تھا تو سخت برہم ہوئے تھے۔ لیکن محبت کی جسمانیت کے وہ ذرا قائل نہیں تھے۔ ان کی شاعری سے محبت کا جو پہلو ابھرتا ہے وہ اس کی الوہیت کا ہے، جس کا ایک ثبوت وہ نظم ہے جو انھوں نے "ایک شاعرہ کی شادی پر" کہی ہے۔ اس نظم میں شکایت یہ نہیں ہے کہ وہ اختر کی بجائے کسی اور کی ہو گئی بلکہ انھیں غم اس بات کا ہے کہ شاعرہ جیسی مطہر شخصیت جسمانی محبت میں ملوث ہو گئی:

۱؎ تقسیم کے بعد دلّی آ گئے تھے، یہیں انتقال کیا۔ صحافت کے علاوہ شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

ظلمتِ حرص و ہوس حور کو بہکا ہی گئی
تیرے بستر پہ بھی آخر کو شکن آ ہی گئی

میں نے اختر کو اچھی بُری ہر جگہ دیکھا ہے - طوائف کے کوٹھے پر بھی میں نے انھیں کبھی ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا - اگر بہت زیادہ پیے ہوتے تو اس کا ہاتھ سینے سے لگا کر رونا شروع کر دیتے - ایسے موقعوں پر یہ مصرعہ اکثر ان کے وردِ زبان ہوتا تھا:

کیسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ

بلانوشی اور لاابالی پن کی روایت کے نئے وارث عبدالحمید عدم تھے - اختر شیرانی کی طرح وہ بھی چلتی پھرتی بوتل تھے - طبیعت ان کی انتہائی موزوں تھی - بلا کے زود گو تھے اور بہت عمدہ شعر بے تکلفی سے کہہ جاتے تھے - شراب سے انھیں بہت تعلق تھا - ہر وقت پیتے تھے، بے تحاشہ پیتے تھے - لیکن شراب بالعموم ان پر کوئی ناگوار اثر نہیں ڈالتی تھی - ان کے بہترین اشعار بھی شراب ہی کے موضوع پر ہیں -

عرب ہوٹل کے بعد ادیبوں کا دوسرا اڈہ نگینہ بیکری تھی - نیلا گنبد لاہور میں چائے کی یہ مختصر سی دکان یو - پی کے ایک قوم پرست مسلمان چلا رہے تھے - شروع شروع میں یہاں آنے والوں میں زیادہ تر کانگریسی مسلمان ہی تھے - لیکن پھر مسلم لیگی بھی آنے لگے اور اس طرح یہ دُکان سیاسی مناظرہ بازی کا اڈہ بن گئی - ادیبوں کا اڈہ یہ تب بنی جب چراغ حسن حسرت جو عرب ہوٹل کی مجلس کے میر تھے، سرکاری ملازمت میں چلے گئے - **ان کے جاتے** ہی مجلس بھی درہم برہم ہو گئی اور وہاں سے اُٹھ کر نگینہ بیکری میں آ جمی -

باری علیگ جو پہلے عرب ہوٹل کے نواح میں رہتے تھے، اب پُرانی انار کلی میں رہنے لگے تھے اور ان کا مکان نگینہ بیکری سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا - خود میں نے بھی انار کلی میں مکان لے لیا تھا - عرب ہوٹل یہاں سے کافی دُور تھا اس لیے میں نے اور باری علیگ نے نگینہ بیکری ہی میں ڈیرے ڈال دیے - باری علیگ کی کشش مولانا صلاح الدین کو بھی کھینچ لائی جن کے جریدے "ادبی دُنیا" کا دفتر بھی قریب ہی مال روڈ پر تھا - مولانا صلاح الدین کے ہمراہ عاشق بٹالوی اور کچھ ادیب بھی آنے لگے - ڈاکٹر سید عبداللہ جو اُن دنوں اورنٹیل کالج لاہور میں تھے، پہلے ہی سے وہاں بیٹھا کرتے تھے - اس طرح اچھی خاصی محفل جمنے لگی - جو ادیب وہاں باقاعدگی سے نہیں بیٹھتے تھے وہ بھی ہفتے میں ایک دو بار ضرور اُدھر آ نکلتے - ڈاکٹر سید عبداللہ اُن دنوں داڑھی رکھتے تھے اور شیروانی پہنتے تھے - سیاست میں قوم پرستانہ اندازِ نظر رکھتے تھے اور اُن کے متعلق یہ مشہور تھا کہ مجلسِ احرار کے بہت قریب ہیں - مسلمانوں کی اس روش پر وہ اکثر چوٹ کیا کرتے تھے کہ اپنی ساری کوتاہیوں کا الزام وہ ہندوؤں کے سر ہی ڈال دیتے ہیں - ان کا مخصوص نعرہ تھا: "سب گوپی چند[1] نے کیا ہے۔"

---

[1] ڈاکٹر گوپی چند بھارگو جو پنجاب اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے -

مولانا صلاح الدین سیاسی بحث میں اگرچہ شریک نہیں ہوتے تھے لیکن ادبی گفتگو میں ضرور حصہ لیتے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ تشویش اُردو کے مستقبل کے بارے میں تھی۔ شروع شروع میں ان کا خیال تھا کہ تقسیمِ ملک سے اُردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا لیکن پھر وہ محسوس کرنے لگے کہ تقسیم میں اُردو کی فلاح کے لیے ایک اشارۂ غیبی ہے۔ جب اہلِ زبان پنجاب پہنچیں گے تو پنجابیوں کو مفت کے استاد میسّر آجائیں گے اور اُردو کو فروغ حاصل ہوگا۔ ملک تقسیم ہوا، لاہور جلنے لگا اور مسلمانوں کے لٹے ہوئے قافلے وہاں پہنچنے لگے لیکن مولانا کی گفتگو کا محور ایک ہی رہا۔ . . پنجاب میں اُردو کا کیا بنے گا؟

اس قسم کی باتیں سُن کر شروع شروع میں ان پر شقاوتِ قلب کا گمان گزرتا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب سارا ملک مقتل بنا ہوا تھا کوئی شخص انسانی مصائب سے اتنا بے پروا ہو جائے کہ اسے اُردو کے مستقبل کے سوا اور کچھ سوجھے ہی نہیں؟ ستم بالائے ستم یہ کہ مولانا کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور غم و غصّے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

ہندوؤں کو لاہور سے بھاگتے دیکھ کر انھوں نے صرف اسی قدر کہا۔ . "متل صاحب! یہ لوگ آخر کیوں بھاگ رہے ہیں؟ اس بار مجھے اور بھی عجیب سا لگا۔ لیکن اسی شام مجھے باری علیگ کی زبانی ایک ایسی بات معلوم ہوئی کہ میں حیرت میں ڈوب گیا۔ مولانا کا اپنا مکان لاہور کے ایک ہندو محلے میں تھا اور جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مکانوں کو آگ لگا رہے تھے تو ان کا مکان بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا اور ان کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں اُبھری تھی۔

جب مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مصائب سے بے پروا صرف اُردو کے مستقبل کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا کرتے تو وہ دوسروں کے مصائب ہی سے نہیں، اپنے مصائب سے بھی بے نیاز ہوتے تھے۔ انھوں نے اُردو کے غم کو اتنا اپنا لیا تھا کہ باقی غموں سے وہ بے نیاز ہو گئے تھے۔

مولانا صلاح الدین کی برہمی دیکھنے کا اتفاق صرف ایک بار ہوا۔ فسادات کے دنوں میں بھی میرے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ میں نیلا گنبد کی اسی دکان پر چائے پیتا رہا، اور مسلمانوں کے ریستورانوں میں کھانا بھی کھاتا رہا۔ شبانہ آوارہ گردی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایک رات تقریباً ایک بجے مال روڈ کے کسی ریستوران سے نکل کر گھر آرہا تھا اور نشے میں دُھت تھا۔ نیلا گنبد کے قریب پہنچا تو سامنے سے باری علیگ اور مولانا صلاح الدین آتے دکھائی دیے۔ سامنا ہوا تو مولانا نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ اور جو کچھ بُرا بھلا کہہ سکتے تھے کہہ ڈالا۔ بس پٹائی ہی نہیں کی۔ اس کے بعد باری علیگ مجھے گھر تک چھوڑ آئے۔

دوسرے دن بھی ملاقات ہوئی تو مولانا صلاح الدین برہم تھے اور جب تک میں نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ اب رات کے وقت گھر سے باہر نہیں نکلا کروں گا، ان کے چہرے پر مسکراہٹ واپس نہیں آئی۔

باقی بہت سی چیزوں کی طرح قلندروں نے فسادات کو بھی کافی دنوں تک غیر حقیقی ہی سمجھا جیسے ہی میں نگینہ بیکری میں داخل ہوتا، باری نعرہ لگاتے:

کافر آیا چھری نکالو

فسادات نے انتہائی زور پکڑا تو بھی انارکلی کا علاقہ محفوظ رہا۔ اس لیے نگینہ بیکری کی محفل برہم نہیں ہوئی۔ انارکلی میں فساد نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے ہندو اور مسلمان دکان داروں میں سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ بازار کو تباہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ چنانچہ جب باقی شہر جل رہا تھا، تب بھی انارکلی پر آنچ نہیں آئی۔ کاروبار البتہ یہاں بھی معطل تھا اور کھانے پینے کی اکا دکا دکانوں کو چھوڑ کر کوئی دکان کھلی نظر نہ آتی تھی۔

ایک دن، دوپہر کو میں گھر پر بیٹھا تاش کھیل رہا تھا کہ کسی نے اطلاع دی کہ آتش زنی اور لوٹ مار کا سلسلہ انارکلی میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ کچھ غنڈے راجہ برادرز کی دکان کا، جو میرے گھر کے قریب ہی تھی، تالا توڑ رہے تھے اور آگ لگانے کی کوشش بھی کی جا رہی تھی۔ ان دنوں فائر بریگیڈ اور پولیس کی مدد حاصل کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے یہ یقینی نظر آتا تھا کہ اگر آگ لگ گئی تو سارا بازار جل کر رہ جائے گا۔ لیکن کراکری کی مشہور دکان بیچارل اینڈ سنز کے مالک کی حکامِ رسی آڑے آ گئی۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو، جو ایک انگریز تھا، براہِ راست ٹیلیفون کر دیا۔ وہ کچھ سپاہیوں کو لے کر جائے واردات پر پہنچا اور اپنے ہاتھ سے مشین گن چلا کر تین فسادیوں کو ہلاک کر دیا۔ باقی بھاگ گئے۔ آگ البتہ لگ چکی تھی مگر یہ پھیلی نہیں اور جو واحد دکان جلی وہ کسی ہندو کی نہیں بلکہ مسلمان کی تھی۔

فسادیوں کی لاشیں اگلے دن بھی بازار ہی میں پڑی رہیں۔ شاید لوگوں کو عبرت دلانے کے لیے۔ تینوں لاشیں نچلے طبقے کے مسلمانوں کی تھیں جو لباس اور وضع قطع سے پیشہ ور غنڈے معلوم ہوتے تھے۔

انارکلی کو بچانے میں ایک انگریز افسر کی تنہا فرض شناسی کو دخل تھا۔ لیکن یہ بات بدستور سنی جاتی رہی کہ فسادات انگریز کرا رہے ہیں۔

انارکلی کے دکان داروں کا سمجھوتہ اس واقعے کے بعد بھی برقرار رہا اور خنجر زنی کے اکا دکا واقعات کو چھوڑ کر یہاں فساد نہیں ہوا۔ ہندو بہرحال سہمے ہوئے تھے اور اس سکون کو آنے والے طوفان کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے۔ فسادات کی درپردہ تیاریوں کا شبہ ایک مسلمان رئیس کے بیٹوں پر تھا جس کی انارکلی میں کافی جائداد تھی۔ ان میں سے ایک کبھی کبھی نگینہ بیکری میں بھی آیا کرتا تھا۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد ملا تو کہنے لگا۔ . . "متّل صاحب! کیوں نہ آج چائے گھر چل کر پی جائے"۔ میں ساتھ ہو لیا۔ ان لوگوں کی کوٹھی بہت بڑی تھی اور خود اس کا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا۔ جہاں پہنچنے کے لیے کئی زینوں کو عبور کرنا پڑتا تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی کہنے لگا۔ . . "تم جانتے ہو کہ میں تمھیں یہاں کیوں لایا ہوں؟" میں نے کہا: "قتل کرنے کے لیے"۔ میرے جواب پر ہنس پڑا اور یہ ہنسی اس کی دلی مسرت کی آئینہ دار تھی۔ کہنے لگا کہ میں خوش ہوں کہ کم از کم ایک ہندو مجھے قاتل نہیں سمجھتا۔ میں تمھیں یہاں آج اس لیے لایا تھا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں۔ یہ بتاؤں کہ مجھ پر فساد

کی درپردہ تیاریوں کا جو الزام ہے وہ غلط ہے۔"

انارکلی پرسکون سہی لیکن اندرونِ فصیل قیامت کا عالم تھا اور ہندوؤں کے بازار یکے بعد دیگرے جلائے جا رہے تھے۔ جب تک ہندوؤں کو یہ خیال رہا کہ لاہور ہندوستان ہی میں رہے گا وہ وہاں ڈٹے رہے۔ لیکن جب لاہور کے بارے میں فیصلہ ہو گیا کہ وہ پاکستان میں جائے گا تو ان کے قدم اُکھڑ گئے۔ پھر اونچی سطح پر خواہ مضمر طور پر ہی سہی، تبادلہ آبادی کا فیصلہ بھی ہو گیا اور جانے والوں کے لیے سرکاری ٹرک مہیا کر دیے گئے۔ اب ہندوؤں کے وہاں رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

میرا اُٹھنا بیٹھنا چونکہ زیادہ تر مسلمانوں میں تھا اس لیے وہ مسلمان جو میرے ذاتی دوست یا شناسا نہیں تھے، مجھے مسلمان ہی سمجھتے تھے۔ اور ایک بار ایک دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی۔ ۱۵ اگست کو میں نگینہ بیکری میں صبح کا ناشتہ کر رہا تھا اور محفل جمی ہوئی تھی کہ یکایک دو تین غنڈہ صورت مسلمان داخل ہوئے اور ہماری میز کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ پھر ہماری گفتگو میں بھی شریک ہو گئے۔ اور اپنے قتل و غارت گری کے کارنامے فاتحانہ انداز میں سُنانے لگے۔ ان میں سے ایک خصوصیت سے میری طرف مخاطب تھا اور ایک گوردوارے پر حملے کی روداد سنا رہا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ گوردوارے والوں کے پاس کافی اسلحہ تھا اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے متواتر گولیاں چلاتے رہے۔ لیکن گولیاں آخر ختم ہو گئیں جس کے بعد وہ اور اس کے ساتھی دیوار پھاند کر گوردوارے کے اندر گئے اور سکھوں کو ایک ایک کر کے ذبح کر ڈالا۔

خدا جانے اس کا سبب میرا اپنے مسلمان دوستوں پر کامل اعتماد تھا یا دیوانگی کی کوئی تر نگ کہ میں نے اُسے بتا دیا کہ جس شخص کو وہ یہ رُوداد سُنا رہا ہے وہ ایک ہندو ہے۔ اس کا لہجہ فوراً ہی بدل گیا، کہنے لگا کہ: اگر تم سے پرسوں ملاقات ہوئی ہوتی تو میں تمھیں ضرور قتل کر دیتا۔ لیکن کل پاکستان قائم ہو گیا ہے، اب تم میرے مہمان ہو۔ میرے گھر چلو، میں تمھاری تواضع کروں گا اور اگر کوئی تم پر انگلی اُٹھائے گا تو اس کا سر کاٹ دوں گا۔ اپنی انٹی سے نکال کر مجھے کچھ گولیاں بھی دکھائیں۔ کہنے لگا: یہ اُن میں سے چند گولیاں ہیں جو تمھارے بھائی بند ہم پر چلاتے رہے ہیں۔

قلندروں پر فسادات کا صرف اتنا اثر ہوا کہ اب میری آمد پر باری علیگ "کافر آیا چھری نکالو" کا نعرہ بلند نہیں کرتے تھے، صرف ذمّی بنانے کی دھمکی دیتے تھے جس پر میں کہا کرتا تھا: ابے چل! تو خود کسی نواب ممدوح کا کیمرا ہو گا۔ یہ خوش فہمی ابھی قائم تھی کہ جو ہندو بھاگے بھی ہیں واپس آ جائیں گے اور لاہور ویسا کا ویسا ہی رہے گا۔

لیکن اس خوش فہمی نے زیادہ دن ساتھ نہیں دیا۔ لاہور سے ہندو بھاگ ہی نہیں رہے تھے، باہر سے مسلمان آ بھی رہے تھے۔ لاہور کا نقشہ یکسر بدل رہا تھا۔ مجھے ذمّی بنانے کی دھمکی دینے کی بجائے باری اب اپنے اس ڈر کا اظہار کرنے لگا تھا: یار ستّی! کہیں داڑھی نہ رکھنا پڑے۔

فسادیوں نے اس بستی پر جس میں پروفیسر برج نرائن رہتے تھے، حملہ کیا تو انھوں نے یہ دلیل دے کر فسادیوں کو

آتش زنی اور قتل و غارت سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ جن مکانوں کو تم جلا رہے ہو وہ پاکستان کا اثاثہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فسادی پہلے تو پروفیسر صاحب کی بات مان کر واپس چلے گئے لیکن وہی خود یا فسادیوں کی کوئی دوسری ٹولی دوبارہ آئی تو پروفیسر صاحب انھیں قائل کرنے میں ناکام رہے اور سب سے پہلے خود ہی قتل ہوئے۔

پروفیسر برج نرائن عالمی شہرت کے ماہرِ اقتصادیات تھے جہاں بیشتر ماہرینِ اقتصادیات یہ کہتے تھے کہ پاکستان اقتصادی طور پر کبھی مستحکم نہیں ہو سکے گا اور اس کا وجود بڑا ہی ناپائیدار ہے۔ وہاں پروفیسر برج نرائن نے اس نظریے کی حمایت میں متعدد مضامین لکھے تھے کہ پاکستان اقتصادی طور پر خود کفالتی کا اہل ہوگا۔ وہ پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھے اور ان کی بے تعصبی کا کٹر سے کٹر مسلم لیگی قائل تھا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ زندہ رہتے تو پاکستان کے اقتصادی استحکام کا کام انھی کے سپرد ہوتا۔ لیکن قضا و قدر کو یہ منظور نہیں تھا۔

پروفیسر برج نرائن کی موت میرے لیے زبردست دھچکا تھی۔ وہ میرے استاد تھے اور میرے مزاج کی تشکیل میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ گھر والے لاہور میں رہنے کو پہلے بھی تیار نہیں تھے، اب میرے قدم بھی ڈگمگا گئے اور جب امرتسر جانے والا لاریوں کا آخری قافلہ روانہ ہوا تو اس میں میں بھی سوار تھا۔ مجھے الوداع کہنے کچھ مسلمان دوست بھی آئے تھے۔ ان میں سے دو کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ایک ہمسفر نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا۔ ۔ ”سالے پہلے مار مار کر بھگاتے ہیں پھر روتے ہیں۔ ۔ ۔“ مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا: بکومت۔ یہ فیصلہ میں آج تک نہیں کر سکا کہ یہ جھاڑ میں نے اسے ڈالی تھی یا خود اپنے آپ کو۔ کیونکہ دل اندر ہی اندر کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میں قلندروں کو جُل دے کر جا رہا ہوں۔

قافلہ امرتسر پہنچا تو وہاں بھی جلے ہوئے مکان نظر پڑے۔ لاہور میں پیشانی پر نورِ شہادت پیدا نہیں ہوا تھا لیکن یہاں آ کر ندامت کے قطرے ضرور نمودار ہو گئے۔ پتہ چلا کہ اسی قافلے میں راج بلدیو راج بھی شامل ہیں۔ جہاں قافلہ رکا تھا وہاں اچھا خاصا بازار لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں منہ ہاتھ دھو کر چائے پینے بیٹھ گئے۔ قافلے والے لٹ لٹا کر آئے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لٹیرے خود اُن میں بھی موجود ہیں۔ کسی کا ٹرنک غائب تھا کسی کا بستر۔ ہم اس پر طنزیہ انداز میں تبصرہ کر رہے تھے کہ قریب ہی سے آواز آئی: "اب لاہور پر حملہ کرنے چلیں گے۔ میں نے پوچھا: راج! ہم حملہ کرنے کب جا رہے ہیں؟ کہنے لگا: بھئی! کبھی مشاعرہ پڑھنے چلیں گے۔ ۔ ۔"

راج بلدیو راج کے بارے میں مجھے علم نہیں لیکن میں مشاعرہ پڑھنے لاہور جا چکا ہوں۔

دلّی میں کچھ دنوں تک ”ملاپ“ اور ”تیج“ میں کام کرنے کے بعد مارچ ۱۹۵۳ء میں میں نے ”تحریک“ جاری کیا جس کا حال ہی میں سلور جوبلی نمبر شایع ہوا ہے۔ ”تحریک“ کے بارے میں کیا لکھوں، میری داستانِ رسوائی کا یہ حصہ بے شمار لوگوں کو قریب قریب ازبر ہے۔

نثر

ہم بھی اُردو پہ ناز کرتے ہیں
یہ ہماری زبان ہے پیارے

گوپال مِتّل کے منتخب مضامین

ڈاکٹر مظفر حنفی

گوپال مِتّل : بحیثیت نثر نگار

کئی سال پہلے بھوپال میں میرے ایک دوست نقاد نے ایک پروفیسر کی نثر کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اختصار اور جامعیت اس کا وصفِ خاص ہے اور اس ضمن میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ میں نے فاضل مقرر سے دریافت کیا کہ انھوں نے گوپال مِتّل کی تحریریں بھی دیکھی ہیں یا نہیں؟ حاضرین مجھے حیرت سے دیکھنے لگے کہ اُن میں سے بیشتر کمیونسٹ تھے، ایک نے استہزائیہ انداز میں پوچھا کہ مِتّل صاحب کا ان پروفیسر صاحب سے کیا مقابلہ —— اور میں نے تسلیم کر لیا کہ واقعی کوئی مقابلہ نہیں، گوپال مِتّل کی نثر اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بدرجہا بلند ہے۔ اپنی بات کے جواز میں میں نے عرض کیا تھا کہ اردو نثر میں اختصار اور جامعیت عام طور پر دو متضاد اصطلاحوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ اگر کوئی نثری تحریر مختصر ہوتی ہے تو اس کا گنجلک اور مبہم ہونا تقریباً طے شدہ ہوتا ہے اور واضح و جامع تحریروں میں بے جا طوالت سے اجتناب ممکن نہیں ہوتا۔ بالفرض پروفیسر موصوف کی طرح یہ دونوں وصف اختصار اور جامعیت نثر میں کہیں یکجا بھی ہوتے ہیں تو اس نثر میں ایک خاص نوع کی کاروباری بے کیفی اور غیر تخلیقی خشکی کا عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ . . گوپال مِتّل ان معدودے چند نثر لکھنے والوں میں سے ایک ہیں جو اختصار و جامعیت کے باوصف اپنی تحریر میں شگفتگی اور دلکشی پیدا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

میں غزل کا آدمی ہوں، کچھ مختصر نظمیں بھی کہی ہیں جن میں بات نو دس مصرعوں میں کہہ دی گئی ہے۔ کبھی افسانے بھی لکھتا تھا جن میں بقول کرشن چندر مرحوم : الفاظ کے بخل کا وہ عالم تھا کہ جذبہ تنگیٔ داماں کی شکایت کرتا محسوس ہوتا تھا۔ میرے نزدیک بات کو کم سے کم لفظوں میں ندرتِ ادا کے ساتھ کہنا لکھنے والے کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے خواہ وہ نظم لکھتا ہو یا نثر۔ اُردو والوں نے بدقسمتی سے یہ سمجھ لیا کہ نثر میں وضاحت اور قطعیت اس وقت تک آ ہی نہیں سکتی جب تک بات کو خوب پھیلا کر نہ کہا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم افسانے، تنقید اور انشائیے کے اسالیب میں امتیاز کرنا بھول گئے۔ جہاں ادب کا یہ حال ہو وہاں صحافت کا کیا عالم ہوگا اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں گوپال متّل کی نثر استثنائی صورتوں میں سے ایک ہے۔ انھوں نے 'تحریک' کے شذرات اور سیاسی نوعیت کے مضامین بھی لکھے ہیں، تحقیقی اور تنقیدی مقالات بھی تحریر کیے ہیں، کم و بیش دو درجن کتابیں انگریزی سے اُردو میں منتقل کی ہیں اور 'لاہور کا جو ذکر کیا' جیسی حکایتِ لذیذ بھی قلمبند کی ہے۔ ہر مقام پر انھوں نے آتش کا یہ گُر یاد رکھا ہے کہ بندشِ الفاظ نگوں کے جڑنے سے کم نہیں ہے۔ آتش نے یہ بات شاعری کے حوالے سے کہی تھی، گوپال متّل نے اسے نثر پر بھی منطبق کر دکھایا۔ اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ کرشن چندر کی شاعرانہ نثر ان کے افسانوں میں حشو و زوائد کا فتیٔ جھول بن کر آتی تھی۔ گوپال متّل کے پیراگراف غزل کے اشعار کی طرح مختصر ہو کر بھی جامعیت سے متصف ہوتے ہیں اور اُن کے چھوٹے چھوٹے جملے بالکل وہی مفہوم ادا کرتے ہیں جو گوپال متّل چاہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی وہ باتیں بھی سننے میں بھلی لگتی ہیں جن سے ہم نظریاتی اعتبار سے چاہے متفق نہ بھی ہوں۔ چند مختصر مختصر سی مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

"جب تک آدمی کی ریڑھ کی ہڈی غائب نہ ہو وہ کمیونزم کو تسلیم نہیں کر سکتا۔"

"کرشن چندر اور اُپیندر ناتھ اشک کی آمد اس بات کا اعلان تھی کہ اب ادب کے میدان میں قلندری کا دور ختم ہوا۔"

"ایک دن ترنگ میں آئے تو کہنے لگے، متّل! مجھ سے چوہے تک فائدہ اُٹھا رہے ہیں لیکن تُو کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتا، میں نے جواب میں کہا، میں چوہا نہیں ہوں۔"

"پروپگنڈے کا فن بھی ساحر کو خوب آتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ حصولِ شہرت کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلائی جائیں۔"

"زور جمہوریت پر دیا جانا چاہیے سیکولرازم پر نہیں۔ ایک جمہوری حکومت لازمی طور پر سیکولر ہوگی لیکن سیکولر حکومت کے لیے جمہوری ہونا ضروری نہیں۔"

"سماج سے ادیبوں کا مطالبہ صرف اتنا ہونا چاہیے کہ وہ ان کے تخلیقی عمل میں مخل نہ ہو۔"

"جیسے ہی اپنی ذات کی اصلاح ہو جائے، اصلاح کا عمل شروع ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد صرف صفر بڑھانے کا عمل باقی رہ جاتا ہے۔"

اُن کی نثر کا ایک بڑا وصف اس کا منطقی استدلال بھی ہے، وہ کسی موضوع پر طبع آزمائی کر رہے ہوں، واقعات کا تجزیہ ایسے نظم و ضبط کے ساتھ کریں گے اور بات اتنے مدلل انداز میں کہیں گے کہ متاثر کیے بغیر نہ رہے۔ وہ ایک خاص قسم کا نظریۂ حیات رکھتے ہیں لیکن لکھتے ہوئے ان کے ہاں جو معروضی اندازِ بیان اختیار کیا جاتا ہے وہ اچھے اچھوں کے لیے قابلِ رشک ہوتا ہے۔ باور کیجیے کہ 'لاہور کا جو ذکر کیا' پچھلے برسوں میں فکشن کی طرح بار بار لطف لے لے کر پڑھی گئی ہے اور ایسے لوگوں نے پڑھی ہے جو گوپال متل کا نام لینا بھی کفر سمجھتے ہیں۔ اس کا جائزہ لیتے ہوئے حیات اللہ انصاری نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے:

"اس میں آپ ایسے نوجوان شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں سے ملاقات کریں گے جو آگے چل کر اپنے دور کے ادبی ستون بن گئے۔ یہ ملاقات مختصر سی ہوگی لیکن اتنی گہری اور تہہ دار ہوگی کہ دماغ پر واضح اور کبھی کبھی تو انمٹ نقوش چھوڑ جائے گی . . . متل نے شخصیات پر جو تبصرے لکھے ہیں ان میں عجیب مَن موہن توازن اور دیانت ہے، محبت میں عیوب پر نظر ہے اور ناپسندیدگی میں بھی پسندیدہ پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔"

اس سلسلے میں حیات اللہ انصاری نے بطورِ خاص ایک مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میں نے جانے کتنے مضامین ظفر علی خاں پر پڑھے ہیں اور لوگوں سے ان کے بارے میں باتیں سُنی ہیں، ان میں ہمیشہ ادھورا پن ہی محسوس کیا ہے۔ متل کی کتاب کے ساڑھے پانچ صفحوں میں ظفر علی خاں شخصیت سے بھرپور ملاقات ہو گئی اور پتہ چل گیا کہ وہ کیا تھے اور اُن کی شاعری کیا تھی۔"

گوپال متل کے اسلوبِ نگارش کا ایک کلیدی نکتہ یہ بھی ہے کہ وہ مطلوبہ نتائج کو براہِ راست نہیں بیان کرتے بلکہ اپنی بات ایسے دلائل و براہین کے ساتھ اور اس معروضی انداز میں کہتے ہیں کہ پڑھنے والے از خود وہ نتیجے اخذ کریں۔ اس انداز کی اثر آفرینی کا صحیح اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے خود بھی اچھی نثر لکھنے کی کاوش کی ہو۔ ان کی نثر اپنی رمزیت، پہلوداری، روانی، طنز کی کاٹ، بے تکلفی، گہرائی، شگفتگی اور جامعیت کے ساتھ ایک منفرد ذائقے کی حامل ہے۔ لفظوں کے طوطا مینا بنا کر قارئین کو لبھانے کا کام تو بہت سے کر لیتے ہیں، سیدھی سادی جچی تلی نثر سے تحریر میں تخلیقی اور علمی شان پیدا کرنا گوپال متل کا فن ہے، ان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اکثر الفاظ جو دوسروں کے ہاں نامانوس اور ثقیل نظر آتے ہیں، اُن کی نثر میں برمحل اور مناسب محسوس ہوتے ہیں ——— مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"غدر سے اب تک ادب پر جتنی بحثیں ہوئی ہیں ان میں سے اکثر کا یہ امتیازی وصف رہا ہے کہ ان میں ادب کے ماسوا اور ہر چیز پر بحث کی گئی ہے۔ افسوس کہ یہ طرح ڈالنے کا باعث وہ شخص ہے، جسے قدرت نے ادب کی خدمت کے لیے واقعی بہترین دل و دماغ ودیعت کیے تھے۔ میری مُراد حالی سے ہے"!

——— نئی ادبی تحریک

سادہ سادہ سے فقروں میں طنز کے جو نشتر نہاں ہیں اُن کی چبھن آپ نے ضرور محسوس کی ہوگی۔ ایک مقام پر نقاد کو اُس کا فرض یاد دلانے کی غرض سے رقمطراز ہیں:

"کرکٹ میں ضابطے کی جو کارفرمائی ہوتی ہے اس سے ادیبوں کو بہت کچھ سیکھنا چاہیے کیونکہ اُردو کی ادبی محفل گزشتہ چند سال سے ہر قسم کے ضابطے سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر امپائر کے منصب کو لیجیے، کیا ناقد کا منصب اس سے ملتا جلتا نہیں؟ کیا موجودہ ناقدوں کو اپنے منصب کی حرمت کا اتنا ہی احساس ہے جتنا کرکٹ میچوں میں امپائر کو ہوتا ہے؟ کیا اُردو کے مشہور نقاد (سید احتشام حسین) کی طرح کسی امپائر نے بھی آج تک یہ اعلان کیا ہے کہ اس کے بہت سے فیصلے مجبوری اور مصلحت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور پھر کیا کرکٹ کی کسی ٹیم نے آج تک یہ کہا ہے کہ اس کے کھلاڑی کے آؤٹ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ امپائر کے بجائے تماشائی کریں گے؟ لیکن جو شاعر: "یہ عشق عشق ہے عشق عشق" یا "سی اے ٹی کیٹ، کیٹ معنی بلی" جیسے فلمی گیت لکھ کر عوام میں مقبول ہوتے ہیں اور اس کی بنا پر ادبی محفلوں میں اپنی برتری کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کی اس برتری پر کتنے ادیب معترض ہوتے ہیں۔۔۔؟"

——— ادب اور کرکٹ

کرکٹ، ادب اور فلم کے موازنے سے کیسی کھری بات کتنے مدلل انداز میں کہہ دی گئی ہے، اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لطف یہ ہے کہ موضوع تلخی کے باوجود فکشن کی طرح دلچسپ اور پُرکشش بن گیا ہے۔ حالانکہ گوپال مِتّل نے کہیں بھی غیر ضروری آراستگی اور ترکیب سازی سے کام لینے کی کوشش نہیں کی۔

ماہنامہ "تحریک" گوپال مِتّل نے ۱۹۵۳ء میں نکالا تھا اور اس کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۸۱ء تک جاری رہا لگ بھگ ان اٹھائیس برسوں میں اُن کے قلم سے بلا مبالغہ سینکڑوں شذرات نکلے اور ان سے ہٹ کر درجنوں دوسرے مضامین بھی انھوں نے قلم بند کیے۔ ظاہر ہے کہ بحیثیت صحافی ان میں سے اکثر تحریریں انھیں قلم برداشتہ لکھنی پڑی ہوں گی جن پر زیادہ غور و فکر کی مہلت انھیں حاصل نہ رہی ہوگی، لیکن ان تحریروں کا مطالعہ اس حیرت ناک نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ کوئی بھی بات رواروی میں کہی گئی محسوس نہیں ہوتی۔ ہر جگہ استدلال، جواز، براہین اور شہادت سے کام لیا گیا ہے۔ یہ قدم قدم پر فکر کو انگیخت کرتی ہیں۔ گوپال مِتّل کے موضوعات کا دائرہ بھی بے حد وسیع ہے مثلاً انھوں نے "اردو تحریک" "اردو کا دشمن کون ہے؟"، "یہ اردو کے حمایتی"، "اردو کا مقدمہ: غلط عدالت، غلط وکیل"، "اردو: ایک حقیقت پسندانہ جائزہ" جیسے متعدد مضامین میں زبان اور لسانیات کے مسائل پر بے باکی کے ساتھ دوٹوک اور غیر جذباتی

انداز میں کھُل کر اظہارِ خیال کیا ہے اور اس موضوع کے کئی ایسے تاریک اور اچھوتے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جو اُن سے قبل چھیڑے نہیں گئے تھے۔ "ادب میں جانبداری کے حقیقی مفہوم"، "ترقی پسندی اور تحریک"، "ادب میں فحاشی پر احتساب"، "احیائے ادب کی تحریک"، "سماجی حقیقت نگاری"، "اردو ادب میں ہندوستانیت کا فقدان"، "داخلیت کی اہمیت"، "ادب اور زندگی"، "متحدہ ادبی محاذ" اور "اردو ادب میں جمود کا مسئلہ" وغیرہ گوپال متل کے وہ مضامین ہیں جن سے اُن کی تنقیدی بصیرت، سخن فہمی اور ادب شناسی کا ثبوت ملتا ہے۔ اپنے ان شذرات میں گوپال متل نے بہت سے معتبر اور اہم نقادوں کے مقابلے میں زیادہ گہری فنی مہارت اور ناقدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ باقاعدہ تنقید نگاری پر مائل ہوتے تو آج کے بہت سے ناقدین سے بلند تر مرتبے پر فائز ہوتے۔ بالعموم ادبی تحقیق کا صحافت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا لیکن گوپال متل نے "غالب اور سوویٹ محقق"، "ٹیگور کو خراجِ عقیدت" اور "غالب سخن فہموں کے نرغے میں" جیسی تحریروں سے ثابت کیا ہے کہ ان میں تحقیق کے خار زار سے نبرد آزما ہونے کی قوت بھی موجود ہے۔ تعلیمی مسائل اور درس و تدریس کی پیچیدگیاں بھی اُن کے ذہنِ رسا کی دسترس سے باہر نہ تھیں۔ چنانچہ "مسلم یونیورسٹی علیگڈھ" اور "دانشوری کے تقاضے" جیسے مضامین میں انھیں مسائل کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اُن کے سیاسی نظریات اور خیالات کی جھلک "گاندھی جی کے اساسی تصورات"، "وہ جو پاؤں سے ووٹ ڈالتے ہیں"، "جمہوریت کے تحفظ کا حلف"، "اعتدال پسند کمیونسٹ"، "ہندوستانی ادیب کے فرائض اور اُس کی آزادی"، "سیکولرازم اور جمہوریت"، "مسلمان اور قومی زندگی" اور "دیوار برلن" وغیرہ میں نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی ہماری قومی زندگی اور آزادی کے بعد ہندوستان میں پیدا ہونے والے بے شمار مسائل اُن کے قلم کی زد پر آئے ہیں اور ہر جگہ گوپال متل نے اپنی سادہ، پُر استدلال، باوقار اور طاقتور نثر کے ذریعے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ کہیں کہیں موضوع کے تقاضے کے پیشِ نظر اظہارِ خیال کے لیے مختلف اسالیبِ بیان بھی اختیار کیے گئے ہیں لیکن بہر حال ان کی نثر نے ہر جگہ اپنی اساسی اور امتیازی شان کو کہ جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، برقرار رکھا ہے۔

رسالہ 'تحریک' نے اپنی کم و بیش اٹھائیس برسوں کی عمر میں ترقی پسند تحریک کا جم کر سامنا کیا۔ ابتدائی چند سال اس پر جتنے بھاری گزرے ہوں گے اس کا اندازہ آج اس لیے نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ تحریک اب اپنی آخر سانسیں لے رہی ہے۔ 'تحریک' اُس وقت جاری ہوا تھا جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی اور ہندوستان کے تمام ادبی مراکز میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" نے مضبوطی کے ساتھ قدم جما رکھے تھے۔ عام طور پر ہر لکھنے والا، خواہ وہ کمیونزم اور ترقی پسندی سے کتنا ہی ناآشنا ہو، رجعت اور قدامت پسند ہونے کے الزام سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو ترقی پسندوں میں شمار کرتا تھا۔ "نقوش"، "شاہراہ"، "صبا" اور "فنون" جیسے گرانڈیل اور طاقتور آرگن ترقی پسندوں کے ہاتھوں میں تھے اور ایک سے ایک جید نقاد اور صاحبِ قلم اُن کی صفوں میں موجود تھا۔ رجعت پسندی کی تہمت سے بچنے کے لیے اچھے لکھنے والے 'تحریک' میں چھپنے سے کتراتے تھے۔ ایسے پُر آشوب اور تلاطم خیز دور میں گوپال متل کی نثر 'تحریک' کے صفحات پر سینہ تانے کئی سال تن تنہا کمیونزم اور ترقی پسندی سے ٹکر لیتی رہی حتیٰ کہ ١٩٦٠ء کے

آس پاس اچھے لکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ ' تحریک ' کے ساتھ ہوگیا۔ یہ گوپال مِتّل کی سادہ و پُرکار، شگفتہ و متین نثر کا کرشمہ ہے جس میں نہ جذبات کا وفور ہے نہ صداقتوں سے اجتناب۔ بلند آہنگی اور مبالغے سے پاک یہ نثر اُن لوگوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کرتی ہے جو اس میں پیش کردہ سیاسی نظریات سے اتفاق نہیں کرتے۔ احساسِ تناسب اس نثر کا بڑا وصف ہے۔ کسی خیال کو کس حد تک پھیلایا جا سکتا ہے اور کہاں سمیٹ دینا چاہیے، گوپال مِتّل خوب جانتے ہیں۔ اُن کی نثر موضوعات اور زمانے کے اختلاف کے باوصف ہمیں سرسیّد اور حالی کی یاد دلاتی ہے۔

بلاشبہ گوپال مِتّل ہمارے عہد کے اچھے اور اہم نثر نگاروں میں سے ہیں۔

●●

(۱)

اُردو — ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

آزادی کے بعد ملک میں جن نئے مسائل کا ظہور ہوا ان میں اُردو زبان کی بقا اور اس کے تحفظ کا مسئلہ بھی تھا گزشتہ ۲۵ سال میں جہاں دوسرے بہت سے مسائل کا حل ڈھونڈ نکالا گیا وہاں اُردو کا مسئلہ جوں کا توں اپنی جگہ قائم رہا اور اس کے حل کے لیے جو کوششیں کی گئیں وہ سب کی سب ناکام رہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا سبب یہ تو نہیں کہ اُردو والے حقیقی صورتِ حال کو سمجھ نہ سکے ہوں اور ان کی ساری جدوجہد کسی واہمے پر مبنی رہی ہو؟

۱۹۵۸ء میں دلی میں ایک آل انڈیا اُردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ یہ کانفرنس کل ہند انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام ہوئی تھی۔ مجلس استقبالیہ میں سیکولر کہلانے والی سبھی سیاسی پارٹیوں کے اراکین شامل تھے۔ کانفرنس کے بعض کارکن تو یہ بھی دعویٰ کرتے تھے کہ انھوں نے اُردو کے کئی سرگرم مخالفوں کو بھی اُردو کا حامی بنا لیا ہے جس کا ثبوت ان کے نزدیک یہ تھا کہ انھوں نے چندے کی مقررہ رقم دے کر استقبالیہ کمیٹی کی رکنیت قبول کر لی تھی۔

کانفرنس کے داعیوں میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم بھی شامل تھے ان کے اثر و رسوخ کی بدولت کئی سیاسی لیڈروں نے کانفرنس میں شرکت منظور کر لی تھی۔ اور جب پنڈت جواہر لال نہرو نے کانفرنس کے افتتاح کی درخواست قبول کر لی تو داعیانِ کانفرنس کی پُرامیدی کی کوئی حد نہ رہ گئی۔ آخر ایک کانفرنس جس کا افتتاح ملک کے مقتدر ترین سیاسی رہنما کو کرنا

تھا، اپنے مقاصد میں کیسے ناکام ہو سکتی تھی ؟ علاوہ بریں کانفرنس کو سبھی سیکولر سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل تھی۔ لہٰذا بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اُردو کے ساتھ بے انصافی عنقریب داستانِ پارینہ بن کر رہ جائے گی اور نیم تبراعظم کی اس نفیس ترین زبان کو اس کا مناسب درجہ مل جائے گا۔ برسرِ اقتدار پارٹی کی تائید و حمایت کی موجودگی میں اکا دکا فرقہ پرست پارٹیاں یا افراد اُردو کی ترقی میں کیا رکاوٹ ڈال سکتے تھے ؟

لیکن کانفرنس کے شروع ہوتے ہی ازالۂ سحر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے اپنی افتتاحی تقریر کی ابتدا یہاں سے کی کہ وہ وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ نجی حیثیت میں تقریر کر رہے ہیں۔ ملک کے قومی پریس نے کانفرنس کی کارروائی کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی لیکن زیادہ اہمیت کانفرنس کے اسی ریزولیوشن کو دی جس میں ہندی کو ملک کی مسلمہ قومی اور سرکاری زبان تسلیم کیا گیا تھا۔ وہ ریزولیوشن جن میں اُردو کے تحفظ کے مطالبے پیش کیے گئے تھے، جس کے لیے یہ کانفرنس بلائی گئی تھی، قومی اخباروں کے لیے کچھ زیادہ قابلِ توجہ نہیں تھے۔

تاہم یہ باتیں شاید ایسی نہ تھیں کہ داعیانِ کانفرنس کے حوصلوں کو پست کر سکتیں۔ وہ بدستور یہ باور کیے رہے کہ پنڈت نہرو جلد ہی اُردو زبان کو اس کا حق دلوا دیں گے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بھی پنڈت نہرو کے فوراً بعد شرکائے کانفرنس کو یقین دلایا کہ اُردو کے کاز کی حمایت ملک کے وزیر اعظم ہی نے کی ہے۔ کانفرنس میں کی جانے والی تقریروں کا خاص موضوع یہی رہا کہ اگر اُردو کے حامی برسرِ اقتدار پارٹی اور اس پارٹی کے اندر پنڈت نہرو کے حامیوں کے ہاتھ مضبوط کریں تو اقلیتوں کے تمام مسائل جن میں اُردو کا مسئلہ بھی شامل ہے، بخیر و خوبی حل ہو جائیں گے۔

اس کے بعد ملک میں بہت کچھ ہوا۔ کانگرس بلا شرکت غیرے پورے ملک میں اقتدار کی مالک بن گئی اور پنڈت نہرو کو تو وہ اقتدار حاصل ہوا جس کا کوئی جمہوری لیڈر بمشکل ہی خواب دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اقتدار کے اس ارتکاز سے اردو کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور جب پنڈت جواہر لال نہرو کا انتقال ہوا تو اُردو کی حالت ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں جب انھوں نے آل انڈیا اُردو کانفرنس کا افتتاح کیا تھا، اور بدتر تھی۔

اب شریمتی اندرا گاندھی کو ملک میں اپنے والد مرحوم سے بھی زیادہ سیاسی اثر و اقتدار حاصل ہے۔ اقتدار کے اس درجے تک پہنچنے سے پہلے انھوں نے اور ان کی پارٹی کے دوسرے ذمہ داروں نے بھی اُردو والوں سے خوش آئند وعدے کر کے ان کے ووٹ اپنے اور اپنی پارٹی کے حق میں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور اس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی لیکن انھوں نے بھی اب تک اُردو کی بقا اور اس کے تحفظ و ترقی کے لیے کوئی مثبت قدم نہیں اُٹھایا ہے۔ اس کے برعکس اُردو کے مرکز ہی علاقے اُتر پردیش کے کانگریسی وزیر اعلیٰ پنڈت کملاپتی ترپاٹھی دو ٹوک لفظوں میں اعلان کر چکے ہیں کہ اُردو کو صوبے کی ثانوی سرکاری زبان کی حیثیت دینے کا کوئی سوال نہیں اُٹھتا۔

انجمن ترقی اُردو کا ترجمان "ہماری زبان" اب بھی اُردو والوں کو یہ یقین دلاتا رہتا ہے کہ انھیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ برسرِ اقتدار سیاست دانوں کے زیرِ صدارت منعقد ہونے والی اُردو کانفرنسوں میں اب بھی بلند آہنگ لہجے میں تقریریں کی جاتی ہیں کہ اُردو ہندوستان میں پھولتی پھلتی رہے گی کیونکہ یہ ہندوستان کے تمام فرقوں کی محبوب زبان

ہے اور اس کا ادب بالخصوص شاعری تو باذوق شائقینِ ادب کو بہت ہی عزیز ہے۔ کبھی کبھی حکومت کی سرپرستی کی تعریفیں بھی ہوتی ہیں جو انجمن ترقی اُردو یا اس قسم کی کچھ دوسری تنظیموں کو گراں قدر عطیے دیتی رہتی ہے۔

ان میں کچھ باتیں واقعاتی طور پر صحیح ہیں۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ آج بھی ملک کے مختلف فرقوں میں اُردو بولنے اور لکھنے والے موجود ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اُردو شاعری ملک میں بدستور مقبول ہے اور مشاعروں میں حاضرین کی تعداد کوسی سمپلین سے زیادہ ہوتی ہے لیکن جب ان واقعاتی صداقتوں کو اُردو کے تحفظ و بقا کی ضمانت قرار دیا جاتا ہے تو یہ واقعاتی صداقتیں ایک ناگوار حقیقت کی پردہ پوشی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ یہ ناگوار حقیقت یہ ہے کہ اُردو ہندوستان میں بتدریج ختم ہو رہی ہے۔ اُردو شاعری سے دلچسپی ماضی کا خمار ہے اور کوئی خمار زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ وہ غیر مسلم جو اردو بولتے اور لکھتے ہیں، پرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تعلیم و تربیت آزادی سے قبل کے دَور میں ہوئی تھی۔ یہ بات بہت مشکوک ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بھی اُردو پڑھائیں گے۔

چند برس پہلے کی بات ہے، میں انجمن ترقی اُردو کی دلی شاخ کے ایک جلسے میں شریک تھا۔ وہاں کئی غیر مسلم حضرات نے اُردو کی حمایت میں پرجوش تقریریں کیں اور بعض نے تو یہاں تک کہا کہ وہ اُردو کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادیں گے۔ غیر ارادی طور پر میں ان سے یہ سوال پوچھ بیٹھا کہ کیا وہ اپنی اگلی نسلوں کو بھی اُردو پڑھا رہے ہیں؟ اس سوال کا جو ردّعمل ہوا وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ میں نے کوئی نازیبا حرکت کی ہے۔ بعد میں ایک مسلمان دوست نے مجھ سے کہا کہ اس قسم کے پریشان کن سوال عموماً اٹھائے نہیں جاتے۔

ریاکاری ہمارا عام شیوہ ہے لیکن جو لوگ ان دنوں اُردو کے مجاہد بنے ہوئے ہیں وہ کچھ زیادہ ہی ریاکار ہیں۔ وہ اردو کی حمایت میں پرجوش تقریریں کرتے ہیں اور مضامین لکھتے ہیں لیکن ان تقریروں اور مضامین کے آخر میں چپکے سے ایک ایسی بات بھی کہہ جاتے ہیں جو ان کی تمام ابتدائی باتوں کی نفی کردیتی ہے۔ آنند نرائن ملّا اُردو کے بڑے پرجوش مجاہدین کر سامنے آئے تھے۔ لیکن جب ایک بار وہ اُردو والوں کی سرگرم حمایت سے پارلیمنٹ تک پہنچ گئے اور حکومتی حلقوں تک ان کی رسائی ہوگئی تو فوراً ہی انھوں نے اپنے سابقہ رویے کو خیرباد کہہ دیا۔ جس اُردو اکادمی کی ایگزیکیٹیو کمیٹی کا ملّا صاحب کو اترپردیش کی کانگریسی حکومت نے چیرمین بنایا ہے اس کے افتتاحی جلسے میں وزیراعلیٰ پنڈت کملاپتی ترپاٹھی نے اپنے اس اعلان کو پھر دہرایا کہ وہ اُردو کو دوسری ریاستی زبان کا درجہ نہیں دیں گے۔ ملّا صاحب نے وزیراعلیٰ کے اس بیان کی حمایت کی اور یہ بھی کہا کہ ہندی ہماری قومی زبان ہے اور اس کا مقابلہ کرنا اردو دشمنی ہے۔ گویا ملّا صاحب اُردو کو ثانوی سرکاری زبان کی حیثیت دیے جانے کے مطالبے کے بارے میں اب یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ قومی زبان سے نبرد آزمائی ہے جس کا حوصلہ کر کے اُردو صرف نقصان اٹھا سکتی ہے۔ اس منطق کی رو سے وہ سبھی لوگ اور تنظیمیں اُردو دشمن ٹھہریں گی جو اس غریب زبان کے تحفظ و بقا کے لیے بجا طور پر یہ مانگ کرتی رہی ہیں کہ جن ریاستوں میں اس کے بولنے والوں اور پڑھنے لکھنے والوں کی قابلِ لحاظ تعداد موجود ہے وہاں اسے ثانوی سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ ان تنظیموں میں انجمن ترقی اُردو بھی شامل ہے جسے سرکاری مدد بھی اس مطالبے سے دست کش ہونے پر

آمادہ نہ کر سکی۔

ایک اور مثال جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی ہے۔ چند برس پہلے "ہندوستان ٹائمز" میں ان کا ایک سلسلۂ مضامین نکلا تھا۔ ان مضامین میں فراق صاحب نے اُردو کی پُرجوش حمایت کی تھی اور بعض ہندی والوں کی اس روش پر زبردست حملے کیے تھے کہ وہ اُردو زبان اور کلچر کو مٹا کر جنھیں انھوں نے مشترکہ کلچر کی نشانیاں قرار دیا تھا، اتر پردیش میں تہذیبی خلا پیدا کر رہے ہیں۔

اُردو حلقوں میں ان مضامین کی بڑی دھوم ہوئی اور ہر شخص نے فراق صاحب کی جرأت مندی اور ان کی غیر جانب داری کی تعریف کی لیکن جوشِ ستائش میں ایک اہم پہلو نظر انداز ہو گیا۔ فراق صاحب نے بڑے سلیقے سے اپنے مضامین میں یہ دلیل شامل کر دی تھی کہ اُردو والوں کو اپنی زبان کے تحفظ کے لیے فارسی رسم الخط کو خیرباد کہہ کر دیوناگری لپی کو اختیار کر لینا چاہیے۔ اس طرح اردو کے اس پُرجوش حامی نے جو تجویز پیش کی تھی وہ اس تجویز سے ذرا بھی مختلف نہیں تھی جسے اس سے پہلے شری سمپورنانند اور سیٹھ گوبند داس جیسے کٹر اُردو دشمن پیش کر چکے تھے۔

اگر اُردو والے واقعی اپنی زبان کا تحفظ چاہتے ہیں تو انھیں حقائق کا پاس کرنا چاہیے۔ کوئی تحریک واہموں کے زور پر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ملک میں سیکولر اور سوشلسٹ رجحانات کو تقویت دینا اپنی جگہ خواہ کتنا ہی مستحسن ہو لیکن اس سے اُردو کے تحفظ کی ضمانت ہرگز حاصل نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا سیکولر بھی تھے اور سوشلسٹ بھی لیکن اقلیتی زبانوں کے معاملے میں ان کا رویہ فرقہ پرستوں سے کم معاندانہ نہیں تھا۔ روس کی کمیونسٹ اسٹیٹ سیکولر اور غالی سوشلسٹ ہے۔ لیکن یہ ریاست مسلم اقلیت کی تہذیب اور اس کی زبان کو تہذیبی یک جہتی کے نام پر ملیامیٹ کر رہی ہے۔ معلومہ حقائق اس مفروضے کی تائید نہیں کرتے کہ ایک ایسی ریاست میں جہاں سیاسی اقتدار مکمل طور پر کسی واحد نظریاتی پارٹی کے ہاتھ میں ہو، اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اقلیت کے مسائل کی پاسداری ایک ایسی ریاست میں زیادہ ممکن ہے جہاں رائے عامہ ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں میں قریب قریب مساوی طور پر تقسیم ہو۔

یہ بھی ایک واہمہ ہے کہ معدودے چند بدطینت فرقہ پرستوں کو چھوڑ کر اکثریتی طبقہ مجموعی طور پر اُردو کو اپنی زبان ماننے کے لیے تیار ہے۔ یہ کہنا غالباً صحیح نہ ہوگا کہ ہندوؤں کی اکثریت اُردو زبان سے عناد رکھتی ہے۔ لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اُردو کے تحفظ سے انھیں کوئی خصوصی دلچسپی نہیں۔ کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی جب تک اسے پُرخلوص اور سرگرم لوگوں کی تائید حاصل نہ ہو۔ یہ خلوص اور ولولہ اُردو تحریک کو مسلمان ہی مہیا کر سکتے ہیں کیونکہ اُردو ایک ایسی زبان ہے جو ان کے ذہن و دل کی ترجمانی دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہتر طور پر کر سکتی ہے اور یہ ان کی ثقافت کی علامت بھی ہے۔ میں یہ مشورہ نہیں دے رہا کہ مسلمان اُردو کے بلا شرکتِ غیرے مالک بن بیٹھیں، روشن خیال غیر مسلم افراد کی تائید حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اُردو تحریک کے بنیادی اور سرگرم معاون مسلمان ہی ہوں گے۔

یہ دلیل کچھ زیادہ وزنی نہیں کہ اگر مسلمانوں نے اُردو کو اپنی زبان مان لیا تو غیر مسلم اردو کے اور بھی مخالف

ہوجائیں گے۔ یہ تو ممکن ہے کہ غیر مسلم اپنی زبان کی حیثیت سے اُردو کی حمایت نہ کریں لیکن مسلمان اس کا تحفظ اپنی زبان کی حیثیت سے کرنا چاہیں تو انصاف پسند غیر مسلموں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا یہ جائز حق ہے کہ وہ حکومت سے اُردو کے تحفظ کا مطالبہ کریں یہ مطالبہ بنیادی حقوق کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے، نہ کہ سیکولرزم اور مشترکہ تہذیب کے نام پر —— اس بات کا امکان ہے کہ حکومت اُردو والوں کے جائز حقوق کو مان لے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تب بھی مسلمان اپنی کوششوں سے اُردو کو بچا سکتے ہیں۔ میں یہ باور کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ کروڑوں افراد کا ایک فرقہ اپنی زبان کا تحفظ نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ اس کا مصمم عزم کرلے۔

—— فروری ۱۹۷۳ء

(۲)

اُردو ادب میں ہندوستانیت کا فقدان

حقیقت یا واہمہ؟

اُردو کے کچھ ادیبوں نے جن کے نام ادب کی دُنیا میں کچھ زیادہ معتبر نہیں، ادب کی منصوبہ بندی کا کام اپنے ذمّے لے لیا ہے۔ اُردو ادب میں انھیں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں اور اس کی اور اُردو زبان کی بقا کا انھیں ایک ہی طریقہ نظر آتا ہے کہ اسے ایک منصوبہ بند انداز میں تومیایا جائے۔

اُردو ادب میں خامیاں حالی کو بھی نظر آئی تھیں لیکن انھوں نے صرف ان کی نشان دہی پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ جیسی تبدیلیاں ادب میں وہ چاہتے تھے ان کے مطابق اپنی تحریروں کو تبدیل بھی کر لیا۔ سوال یہ نہیں کہ حالی جو تبدیلیاں ادب میں لانا چاہتے تھے وہ سودمند اور مستحسن تھیں یا نہیں، اہم بات یہ ہے کہ اصلاح کی ابتدا انھوں نے اپنی ذات سے کی اور صرف یہی نہیں کیا کہ لیڈر بن کر دوسرے ادیبوں کو مشورہ دیتے رہیں۔ اُردو ادب کی اصلاح کا منصوبہ بنانے والے نئے لوگ ایسا نہیں کر رہے، خواہ عدم صلاحیت کی بنا پر خواہ کسی اور باعث سے۔

انھیں شکایت ہے کہ اُردو ادب کا نفسیاتی ماحول ہندوستانی نہیں لیکن وہ ایسا ادب پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے جس میں وہ مخصوص قسم کی ہندوستانیت جلوہ نما ہو جس کی عدم موجودگی کے وہ اتنے شاکی ہیں۔ ان کا سارا زورِ قلم اس قسم کی صحافتی تحریروں پر صرف ہو رہا ہے جو یا تو طعن و تشنیع پر ختم ہوتی ہیں یا ہمدردانہ مشوروں پر۔

یہ مشورے اور یہ طعن و تشنیع اگر صرف اپنی گرم بازاری کے لیے ہیں تو ہمیں اس پر کوئی خاص اعتراض نہیں۔ لوگ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کر گزرتے۔ ایک عورت کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہے کہ اس نے اپنی انگوٹھی کی طرف اپنے پڑوسیوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے اپنے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ لیکن اگر یہ مشورے نیک نیتی سے دیے جا رہے ہیں اور انھیں عملی جامہ پہنانے سے وہ صرف اپنی عدم صلاحیت کی بنا پر قاصر ہیں تو ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اپنے مشوروں کی بوچھاڑ کرتے وقت پہلے وہ موجودہ اُردو ادب اور اس کی گزشتہ تاریخ کا تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کر لیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کے خلاف انھیں جو شکایتیں ہیں، ان میں سے اکثر بے جا نظر آئیں گی۔ اس کے علاوہ انھیں اس ذہنی بیماری سے بھی نجات حاصل کرنی چاہیے جس میں مبتلا ہو کر آدمی اپنی ناکامی کے اسباب اپنی ذات میں تلاش کرنے کی بجائے اسے دوسروں کی سازش کا نتیجہ قرار دینے لگتا ہے۔

پہلے ہم دُوسری بات کو لیں گے اور ذرا کھل کر بات کریں گے۔ اُردو والوں (بلکہ کیوں نہ صاف بیانی سے کام لے کر کہا جائے مسلمانوں) کے خلاف انھیں شکایت ہے کہ وہ ہندو ادیبوں کی کتابیں شایع نہیں کرتے بلکہ مسلمان کتب فروش انھیں اپنی دوکان پر فروخت کے لیے رکھنے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔ کچھ ہندو ادیبوں کی یہ شکایت بالکل بجا ہوگی۔ لیکن اس میں کسی سازش یا فرقہ پرستی کا پہلو ڈھونڈنا غلط ہے۔ کیونکہ یہی ناشر اور کتب فروش بہت سے مسلمان ادیبوں کی کتابیں شایع اور فروخت کرنے سے بھی اسی سنگدلی سے انکار کر دیتے ہیں۔ دراصل ناشر وہی کتاب چھاپے گا اور کتب فروش اسی کتاب کو اپنی دکان پر رکھے گا جس کے فروخت ہونے کا امکان نظر آئے۔ اگر ناشر اور کتب فروش آپ کی تصانیف کی طرف راغب نہیں ہو رہے ہیں تو اس کا ایک ہی علاج ہے کہ آپ اپنی تحریر کے معیار کو اونچا کریں ورنہ آپ کی کتابیں چھاپ کر اُردو کے ناشر دیوالیہ تو ہو سکتے ہیں، آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

اب رہی پہلی بات، یعنی اُردو ادب میں ہندوستانیت کے فقدان کی شکایت۔ اس سلسلے میں بھی ہم کھل کر بات کریں گے۔ نظیر اکبر آبادی کے علاوہ بھی جس کی شاعری کا ماحول صرف ہندوستانی ہی نہیں بلکہ ہندوانہ ہے، اُردو کے تقریباً سبھی نامور شاعروں کے کلام میں ہندوستانیت کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود ہم یہ تسلیم کریں گے کہ ہندوستان کی اُردو شاعری کا ماحول کلیتہً ہندوستانی نہیں اس میں نل دمینتی کی بجائے قیس و فرہاد کا زیادہ ذکر ہوتا ہے۔ بھیم وارجن کی جگہ رستم و سہراب کا زیادہ تذکرہ ہے۔ لیکن اس کا باعث وہ نہیں جو اُردو کے نئے نکتہ چیں بتا رہے ہیں۔ اُردو ادب پر اسلامیت کی چھاپ کا شکوہ بے بنیاد ہے۔ قیس و فرہاد اور رستم و سہراب اسلامی ہیرو ہرگز نہیں اُردو ادب پر اگر اسلامیت کی چھاپ ہوتی تو وہ اثرات جن کے ہمارے نئے ناقد شاکی ہیں عربی زبان کے ذریعے آتے۔ لیکن اُردو ادب جس زبان کے ادب سے واقعی متاثر ہے وہ عربی نہیں فارسی ہے اور جن کے ناموں کے بار بار ذکر سے ہمارے ناقد برہم ہوتے ہیں، ان میں سے بیشتر طلوعِ اسلام سے پہلے کے دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ نہ وہ شعائرِ اسلامی کے نمائندے تھے اور نہ اسلام کی تاریخ سے ان کا کوئی تعلق ہے اُردو ادب پر تو اسلامیت کی چھاپ کیا ہوگی یہ چھاپ تو خود ایرانی ادب پر نہیں جس کے بیشتر اُردو شاعر خوشہ چیں رہے ہیں۔

بات صرف اتنی ہے کہ جس دور میں اُردو شاعری کو فروغ ہوا اس وقت فارسی شاعری ہندوستان میں اتنی ہی مقبول تھی جتنا ان دنوں انگریزی ادب ہے۔ جس طرح نئے لکھنے والے اپنی تحریروں میں آج کل انگریزی الفاظ اور انگریزی ادب کے کرداروں کو بار بار استعمال کرتے ہیں، اسی طرح اس زمانے کے شاعر اپنے فارسی شاعری کے مطالعے سے استفادہ کرتے تھے۔ اب جیسے جیسے فارسی کا ذوق کم ہو رہا ہے اُردو ادب اور شاعری پر فارسی کا اثر گھٹ رہا ہے، اور انگریزی ادب اور شاعری کا اثر بڑھ رہا ہے۔ ایک بات اور بھی عرض کر دی جائے کہ یہ صرف اُردو کے شاعر ہی نہیں جن کی شاعری میں مشاہدے کے مقابلے میں مطالعے کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ یہ الزام ملٹن پر بھی لگ چکا ہے جس کی شاعری میں ایسے پھولوں اور پرندوں کے نام بار بار آئے ہیں جن کا برطانیہ میں کوئی وجود نہیں اور جن کا استعمال اس کے لاطینی زبان کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔

ہم اس بات کے خلاف ہرگز نہیں کہ اُردو زبان کو زیادہ رنگارنگ ہونا چاہیئے اور یہ بھی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اس پر بھی دوسری زبانوں کے اثرات کو اتنا حاوی نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ ہندوستانیت پر غالب آجائیں لیکن اگر آپ اُردو ادب کا اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کا واقعی مطالعہ کرتے رہے ہیں تو یہ گوشہ آپ کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہوگا کہ جو مشورے آپ اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو دے رہے ہیں اسی قسم کے مشورے دوسری زبانوں کے لکھنے والوں کو بھی دیے جا رہے ہیں اور سبھی لکھنے والے ان دانشوروں کی پذیرائی کے لیے تیار نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ اُردو شعر و ادب میں مقامیت نمایاں نہیں ہو رہی۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ پاکستان کے شعر و ادب میں بھی ایسے تصورات بار پا رہے ہیں جو خالص دیومالائی ہیں اور جن کا اسلامیات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور ہاں آپ کا جو نظریہ ہے۔ اس کے بہترین ترجمان بھی آپ نہیں بلکہ ایک پاکستانی مسلمان ہے ہماری مراد وزیر آغا سے ہے۔ اور میراجی جس نے اُردو زبان میں ایسی شاعری کی جس پر ہندی شاعروں کو بھی رشک آئے اس کا نام ثناء اللہ تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ تخلیقی عمل کسی منصوبے کے تحت تکمیل نہیں پاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ اُردو ادب کے متعلق منصوبے تو تیار کرتے ہیں لیکن ان کا تخلیقی اظہار آپ کے بس میں نہیں۔

——— فروری ۱۹۷۱ء

(۳)

سماجی حقیقت نگاری

سوویت قاموسِ فلسفہ میں حقیقت نگاری کو "سوویٹ آرٹ اور لٹریچر کا بنیادی اصول" قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ: "آج سوشلسٹ حقیقت نگاری کا طریقہ ان عوامی جمہوریتوں کے فنکاروں کی میراث بن گیا ہے جو سرمایہ داری کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کے بعد سوشلسٹ سماج اور کلچر کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ یہ لٹریچر اور آرٹ کے ان بہترین نمائندوں کی میراث بھی بن گیا ہے جو سرمایہ دار ملکوں کے اندر عوام کی آزادی اور امن کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔"

سوشلسٹ حقیقت نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے سوویٹ قاموسِ فلسفہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ "انقلابی رومانیت کو جسے نئی چیزوں کے جراثیم اور کونپلوں میں مستقبل کے امکانات دیکھنے کا وصف قرار دیا جاسکتا ہے، سوشلسٹ حقیقت نگاری سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انقلابی رومانیت حقیقت پسندی کا جز و لاینفک ہے۔"

قاموسِ فلسفہ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ سوشلزمی حقیقت نگاری سوویٹ روس کے بعد باقی ملکوں کے کمیونسٹ ادیبوں کی میراث بھی بن گئی ہے لہٰذا قدرتی طور پر ہندوستانی کمیونسٹ ادیب بھی اس بنیادی اصول کے پابند ہوں گے۔

ان حالات میں اس بنیادی اصول کو سمجھنا بہت ضروری ہے جسے قاموسِ فلسفہ میں انقلابی رومانیت کا نام دیا گیا ہے اور اسے سوشلزمی حقیقت پسندی کا "جزو لاینفک" بھی قرار دیا گیا ہے۔

مشہور مصنف لوئی فشر نے جسے ایک مدت تک کمیونسٹوں کا ہمسفر رہنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے، انقلابی رومانیت کی بہت واضح مثال پیش کی ہے۔ یہ مثال "سنی سنائی" نہیں بلکہ اس کے ذاتی تجربے سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ جب مندرجۂ ذیل واقعہ رونما ہوا تو لوئی فشر سوویٹ روس ہی میں موجود تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل اسی کی زبان میں سنیے:

"مشہور روسی ناول نگار دسی وولود ایوانوف گورکی کی عظیم آٹوموبائیل فیکٹری کی زندگی کے متعلق ناول لکھنے میں مصروف تھا اس خیال کے پیشِ نظر کہ اسے موضوع سے متعلق بہتر آگاہی حاصل ہو جائے اس نے کچھ دیر کے لیے اس کارخانے میں قیام کر لیا۔ اس قیام کے دوران میں مزدوروں کی ایک میٹنگ میں وہ اپنے مسودے کے کچھ حصے سنانے لگا۔ ایک باب میں اس نے ان مشکلات کا ذکر کیا تھا جو مزدوروں کو دور دراز سے آتے وقت ناقص سڑکوں اور گھٹیا بسوں کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ میٹنگ میں جو کمیونسٹ موجود تھے، انھوں نے اس بنا پر اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"اس ناول کو ختم کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟" انھوں نے دریافت کیا۔

"چھ ماہ۔" ایوانوف نے جواب دیا۔

"اس کے بعد چھ ماہ اسے سنسر کرنے میں لگ جائیں گے اور چند ماہ چھاپنے میں۔ تمہاری کتاب ایک سال سے پہلے شائع نہ ہو سکے گی اور ایک سال میں یہاں اچھی سڑکیں بن جائیں گی اور نئی بسیں آجائیں گی۔ اسی طرح کارخانے کے نزدیک نئے اور مستقل مکان بھی بن جائیں گے۔ ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں کہ تم ان بسوں، سڑکوں اور مکانوں کا یہ سمجھ کر ذکر کرو کہ وہ اس وقت بھی یہاں موجود ہیں۔"

اس واقعہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لوئی فشر رقمطراز ہے:

"بولشویک عظیم خواب کے پیچھے آگیں انتر سے آگاہ تھے اور جب

> مستقبل موعود ماضی میں تبدیل ہونے لگا تو انھوں نے اس کے دور رس نتائج کا امید پرستانہ جال بچھا دیا۔ انھوں نے یہاں تک کیا کہ ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ روسی مصنفوں کے نام یہ حکم نامہ صادر کر دیا کہ وہ حال کے متعلق یہ فرض کر لیں کہ وہ موجود ہی نہیں اور مستقبل کے متعلق یہ فرض کر لیں کہ وہ آچکا ہے۔ اس ادبی شعبدہ بازی کو حقیقت نگاری کا نام دیا گیا۔"

روسی ادیبوں نے اس حکم نامے اور اس شعبدہ بازی کو آسانی سے قبول نہیں کیا۔ کمیونسٹوں نے انھیں تعمیل حکم پر آمادہ کرنے کے لیے ڈکٹیٹرانہ جبر کی مشینری سے پورا پورا کام لیا۔ جن لوگوں نے تعمیل ارشاد سے انکار کیا ان کو طرح طرح کی ایذائیں دی گئیں اور جنھوں نے حکام کا آلۂ کار بننا منظور کر لیا ان پر الطاف و اکرام کی بارش کی گئی۔ گویا اہل مذہب کی طرح کمیونسٹوں کے پاس جنت بھی تھی اور جہنم بھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کی جنت اور جہنم خیالی نہیں بلکہ حقیقی تھی۔

انقلاب روس کے فوراً ہی بعد روسی شاعر میکافسکی کی رہنمائی میں کچھ ادیبوں، شاعروں اور مصوروں نے جو اپنے آپ کو مستقبلی کہتے تھے روسی انقلاب کی تائید شروع کر دی۔ سوویٹ گورنمنٹ نے کچھ دنوں تک ان لوگوں کی سرپرستی کی لیکن پھر اپنی سرپرستی کو واپس لے لیا اور اپنے غیر پرولتاری رویے کی پاداش میں تحریک کے رہنما میکافسکی کو خودکشی کرنا پڑی۔

اس کے بعد ٹراٹسکی کی سرپرستی میں "ہمسفروں" کی تنظیم ہوئی۔ ٹراٹسکی نے ان کے متعلق کہا تھا: "ان کا آرٹ پرولتاری انقلاب کے مکمل طور پر موافق نہیں۔ وہ کچھ دیر تک ہمارے ساتھ جائیں گے۔" یہ وہ زمانہ تھا جب لینن پبلک طور پر یہ تسلیم کرتا تھا کہ: "بورژوائی آرٹ کی روایات کو عجائب گھر میں دفن کرنا ابھی قبل از وقت ہے۔" لیکن یہ زمانہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ کمیونسٹ پارٹی کے اندر ٹراٹسکی اور اسٹالن کے دھڑوں میں کشمکش شروع ہوئی تو اسٹالن نے پرولتاری مصنفوں کی ایسوسی ایشن کے نام سے ایک متوازی انجمن قائم کر دی اور خفیہ پولیس کی مدد سے تمام محررِ قسم کے ادیبوں کو "لڑاکے گروہوں" میں منظم کر دیا۔ اسٹالنی ایسوسی ایشن کے متشاعروں اور نام نہاد ادیبوں نے بہت جلد ہمسفروں کو "غیر جانبدار" کہہ کر ان کی مذمت شروع کر دی۔ اور اعلان کیا کہ ان کا رویہ "پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کے وجود کے منافی ہے۔" اسٹالن کی چالبازیوں کے طفیل اس ایسوسی ایشن نے بہت جلد تمام پبلشنگ اداروں پر قبضہ کر لیا۔ اور ہمسفروں کو میدان سے مکمل طور پر بے دخل کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوئی فشر کے الفاظ میں:

> "ایسوسی ایشن جس مصنف کو بھی ترچھی نگاہوں سے دیکھ لیتی اس کی ادبی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس طرح بہت سے ذہین اور روشن دماغ مصنفوں کو خاموش کر دیا گیا۔ ان لوگوں کی کسوٹی ادبی نہیں سیاسی تھی۔"

ٹراٹسکی پر اسٹالن کے غلبہ پانے کے بعد اس ایسوسی ایشن کو ادبی زندگی پر مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا۔ اور

۱۹۳۰ء میں اس نے مصنفوں کی کانگرس میں جو خارکوف کے مقام پر ہوئی" اپنے پروگرام کو باقاعدہ طور پر منظور کرا لیا۔ اس کانگرس میں بیس ملکوں کے نمائندے شامل ہوئے تھے اور اس میں مصنفوں کے نام باقاعدہ ہدایت نامے جاری کیے گئے تھے۔
اس موقعے پر جو رزولیوشن پاس کیا گیا اس میں درج تھا:

پرولتاری آرٹ انفرادیت کی مذمت کرتا ہے اور اس سے دست بردار ہوتا ہے۔

پرولتاری آرٹسٹ کو جدلیاتی مادیت کیش ہونا چاہیے۔

پرولتاری آرٹ کو اجتماعی ہونا چاہیے۔

پرولتاری آرٹ کو منظم ہونا چاہیے۔

پرولتاری آرٹ کی تخلیق کمیونسٹ پارٹی کی مصلحت اندیشانہ اور کڑی ہدایت کے مطابق ہونا چاہیے۔

پرولتاری آرٹ کو طبقاتی جنگ کا ہتھیار بننا چاہیے۔

معاملہ کمیونسٹ پارٹی کی ہدایت قبول کرنے پر ہی ختم نہیں ہوا بلکہ اس ایسوسی ایشن نے اپنے سرکاری آرگن بیزی مینسکی MEZKH KNIKI میں یہ اعلان کرنا بھی ضروری سمجھا کہ " لٹریچر کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ سوشل میدان میں کامریڈ اسٹالن کی ہدایات کو عملی جامہ پہنا دے۔"

جب ادب کا کام صرف اسٹالن کی ہدایات کو عملی جامہ پہنانا رہ گیا ہو تو یہ بات بالکل قدرتی ہے کہ روسی مصنفوں کا سارا زورِ قلم اسٹالن کی مدح سرائی اور حکومت روس کی ہر کارروائی کا جواز پیش کرنے پر صرف ہونے لگا لیکن "یہ نمرود کی خدائی" تھی جس میں "بندگی میں" بھی "بھلا" نہیں ہوتا۔ اپنی تمام غلامانہ ذہنیت کے باوجود ۱۹۳۴ء میں یہ ایسوسی ایشن اسٹالن کے ہاتھوں ہی ختم ہو گئی، اس کے ممبروں پر ٹراٹسکائی رجحانوں کا الزام لگا، اور ان میں سے متعدد کا مادی وجود ختم کر دیا گیا۔ اسی سال سوویٹ مصنفین کی ایک نئی یونین قائم ہوئی۔ اس یونین کے مصنفوں کے لیے جو نیا ہدایت نامہ تیار کیا گیا اس میں درج تھا:

(۱) لٹریچر کے ارتقا اس کے فنی کمال، اس کی نظریاتی قیمت اور اس کی عملی افادیت کے لیے اوّلین شرط یہ ہے کہ ادبی تحریک کا پارٹی اور سوویٹ گورنمنٹ کی پالیسی کے ساتھ گہرا اور قریبی تعلق ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ مصنفوں کو سوشلزم کی تعمیر میں سرگرم حصہ لینا چاہیے۔"

(۲) سوویٹ مصنفوں کی یونین اس اہم کام کی تکمیل کے لیے تجویز پیش کرتی ہے کہ ایسے اونچے درجے کے فن پاروں کی تخلیق کی جائے جو بین الاقوامی پرولتاریہ کی سورمائی جنگ کا اظہار کرتے ہوں۔ سوشلزم کی فاتحانہ اسپرٹ کے حامل ہوں اور کمیونسٹ پارٹی کی عظیم دانش اور جرأت مندی کا پرتو لیتے ہوئے ہوں۔

اس نئے ہدایت نامے کے بعد اور پرانی ایسوسی ایشن کے ممبروں کے خاتمۂ وجود کے پیش نظر روسی مصنفوں میں اسٹالن کی مدح سرائی کا باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا۔ جاگیردارانہ دور کے مصنف جب تملق پیشگی اختیار کرتے تھے تو ان کی گراوٹ زیادہ سے زیادہ یہاں تک پہنچتی تھی کہ:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن رُوسی مصنفوں نے اسٹالن کو خدائی صفات سے بھی متصف کر دیا۔ ۲۸ اگست ۱۹۳۶ء کو روس کے سرکاری آرگن "پراودا" میں ایک شاعر نے رُوسی ڈکٹیٹر سے اس طرح خطاب کیا ہے:

اے عظیم اسٹالن اے عوام کے رہنما
اے تو جس نے انسان کو جنم دیا
اے تو جس نے زمینوں کو زرخیز بنا دیا
اے تو کہ جس نے صدیوں کو از سر نو جوان کیا
اے تو جس نے بہاروں میں رنگ بھرا

اسی اخبار کی ۲۸ نومبر ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں کاکیشیا کے ایک اور شاعر نے اپنی غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

اے اسٹالن تو دن کی پیدائش کا وقت مقرر کرتا ہے
صبح کے ستارے ترا حکم مانتے ہیں

ہر چند کہ ذلت کا یہ مظاہرہ انسانی گراوٹ کی انتہا ہے اور روس کے اربابِ دانش اسے صرف اپنی جان بچانے کے لیے گوارا کرتے ہیں لیکن ڈکٹیٹرانہ ستم ظریفی اس سے بھی مطمئن نہیں اور ان غلامانِ ازلی کے لیے ہر روز کوئی نہ کوئی نیا امتحان موجود ہوتا ہے مشہور مصنف آرتھر کوئسلر نے اپنی کتاب "ظلمتِ نیم روز" میں اسٹالن کی اس ستم ظریفانہ روش کا ذکر بہت دلچسپ پیرائے میں کیا ہے:

"ایک بار اس نے ماہرین کی اس کمیٹی سے جو پارٹی کے اقتصادی جریدے کو مرتب کرتی تھی یہ مطالبہ کیا کہ وہ امریکہ کے صنعتی بحران کا تجزیہ پیش کرے۔ اسے کئی مہینے لگ گئے۔ آخر بڑی جد وجہد کے بعد اس جریدے کا ایک خاص نمبر نکلا۔ جس میں نمبر ا (اسٹالن) کے اس نظریے کی تائید کر دی گئی جس کا اظہار اس نے کانگرس میں اپنی آخری تقریر میں کیا تھا۔ ان اقتصادی ماہرین نے تین سو صفحے لکھنے کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ امریکہ میں جو خوشحالی نظر آتی ہے وہ صرف نمائشی ہے ورنہ اندر سے امریکہ بدحالی کا شکار ہے اور اس بدحالی کو صرف ایک کامیاب انقلاب سے ہی دور کیا جا سکتا ہے جس روز اس جریدے کا خاص نمبر نکلا اسی روز نمبر ا نے ایک امریکی اخبار نویس سے ملاقات کی اور اس کے توسل سے ساری دنیا کو آگاہ کر دیا

کہ "امریکہ میں اقتصادی بحران ختم ہو چکا ہے اور اب وہاں کاروبار نارمل ہے"۔ ماہرین کی کمیٹی کے ممبروں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ ان کی برطرفی اور گرفتاری لازمی ہے۔ راتوں رات انھوں نے خط لکھ کر اپنی اس بد اعمالی کا اعتراف کر لیا کہ وہ ایک انقلاب دشمن نظریے اور گمراہ کن تجربے پیش کرنے کے مجرم ہیں۔ انھوں نے اس بات پر خاص زور دیا کہ وہ اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور پبلک طور پر اس کی تلافی کا یقین دلاتے ہیں۔ صرف اساکووچ نے جو ایڈیٹروں کے بورڈ کا ایک ایسا رکن تھا جو بوڑھے انقلابیوں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس بات کو ترجیح دی کہ اس قسم کا خط لکھنے کے بجائے اپنے آپ کو گولی مار لے۔ بعد میں خلوتیانِ راز نے اس بات کا انکشاف کیا کہ عمبرا نے یہ سارا کھیل صرف اس لیے کھیلا تھا کہ اساکووچ کو تباہ کر دیا جائے اس شخص پر عمبرا کو مخالفانہ رجحانات کا گمان تھا۔"

جن اربابِ دانش اور اہلِ قلم کو اس اذیت ناک آزمایش کا مسلسل سامنا ہو اور ان کے سر پر احتساب کی تلوار ہر وقت لٹک رہی ہو وہ کسی بھی ادبی شعبدہ بازی کو بڑی آسانی سے قبول کر سکتے ہیں۔ اخلاقی پس و پیش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی سوال ہے تو صرف یہ کہ "جادۂ کفر" سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خفیہ پولیس کے کنٹرول کو بطیبِ خاطر و رغبت قبول کر لیا جائے۔ سوویٹ مصنفوں کی یونین نے یہی کیا۔ ایک ریزولیوشن میں اس نے طے کیا۔

"ہماری بات چیت کا فوری نتیجہ ہمارے کام کی ایک ایسی تنظیم ہونا چاہیے جس کی بنا پر صرف وہ کتابیں ہی سوویٹ مصنفین کی یونین کے سامنے پیش نہ ہوں جو مکمل ہو چکی ہوں بلکہ آئندہ کتابوں کے خاکے اور اس کی اسکیمیں بھی۔ تاکہ یونین یہ اندازہ بھی لگا سکے کہ اس کے ممبر کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

مندرجہ بالا حقائق روسی مصنفوں کی غلامانہ ذہنیت اور کورانہ اطاعت شعاری کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں لیکن ان سے یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ سماجی حقیقت نگاری ان آرٹسٹوں اور مصنفوں کی "میراث" کس طرح بن گئی جو سرمایہ دار ملکوں کے اندر عوام کی آزادی اور امن کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ ہر چند کہ جمہوری ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیاں بھی دہشت پھیلانے کے فن میں ماہر ہیں اور آرٹسٹوں اور مصنفوں کو آنے والے انقلاب سے خوفزدہ کرنے کا ڈھنگ انھیں خوب آتا ہے لیکن صرف یہ بات بھی جمہوری ملکوں کے مصنفوں اور آرٹسٹوں کو سماجی حقیقت نگاری کے نام پر روس کی مدح سرائی اور اپنے ملک کی توہین کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔ ان لوگوں کو رام کرنے کے لیے روسی رشوت سے کام لیتے ہیں۔ یہ

رشوت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ اس کی ایک عام قسم جذبۂ شہرت کی تسکین ہے۔ روس کی مدح سرائی کرنے والا گھٹیا سے گھٹیا ادیب صرف ایک جست میں عظیم فن کاروں کی صف میں جا ملتا ہے۔ اس کے علاوہ خالص مادی انداز میں بھی رشوت دینے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ اس رشوت کی تفصیل آرتھر کوسلر اور آندرے ژید نے بہت اچھی طرح پیش کی ہے۔ یہ رشوت ان دونوں ادیبوں کو راہِ راست سے منحرف کرنے میں اس لیے کامیاب نہ ہو سکی کہ یہ لوگ کسی لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ خالص فدا کارانہ انداز میں سوویٹ روس اور کمیونزم کی طرف مائل ہوئے تھے۔ الطاف و اکرام کی بارش نے ان پر اُلٹا اثر کیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ الطاف و اکرام کی یہ بارش کسی نہ کسی ناگوار حقیقت کو چھپانے کے لیے کی جارہی ہے۔ لیکن عام لوگ چونکہ لالچ اور تحریص سے بلند نہیں ہوتے اس لیے نوازشات کی فراوانی ان کے ضمیر کی آواز کو خاموش کر دیتی ہے۔

آرتھر کوسلر اپنے سفرِ روس کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جب میں کسی صوبے کے صدر مقام پر پہنچتا تو سفارشی خط لے کر مقامی مصنفین کی فیڈریشن کے دفتر میں پہنچ جاتا۔ فیڈریشن کا سکریٹری یہ خط دیکھ کر میرے اعزاز میں دعوت کا انتظام کرتا۔ سیاسی لیڈروں اور اربابِ دانش سے میری ملاقات کا انتظام کرتا، کسی شخص کو میری خبرگیری پر مقرر کر دیتا اور مقامی ادبی میگزین اور اسٹیٹ پبلشنگ ٹرسٹ کے ڈائرکٹر سے میری ملاقات کرا دیتا۔ طفلس کے مقام پر جب میری ملاقات ادبی میگزین کے ایڈیٹر سے ہوئی تو اس نے مجھے آگاہ کیا کہ اس کی کئی سال سے یہ زبردست خواہش تھی کہ میری کوئی کہانی اس کے میگزین میں اشاعت پذیر ہو۔ میں نے ایک کہانی، جو اس سے پہلے جرمن زبان میں شایع ہو چکی تھی اس کے سپرد کی اور اسی شام اس نے دو یا تین ہزار روبل کا چیک میرے پاس ہوٹل میں بھیج دیا۔ اسٹیٹ پبلشنگ ٹرسٹ کے ڈائرکٹر نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ٹرسٹ کو اپنی زیرِ تصنیف کتاب کو جارجیائی زبان میں شایع کرنے کی اجازت دے دوں۔ میں نے معاہدے کے ایک چھپے ہوئے فارم پر دستخط کر دیے اور تین چار ہزار روبل کا ایک اور چیک میرے پاس پہنچ گیا (اس وقت روس میں اوسط درجے کے ایک ملازم کو ۱۳۰ روبل ماہوار تنخواہ ملتی تھی) لینن گراڈ اور تاشقند کے درمیان سفر کرتے ہوئے میں نے ایک ہی کہانی آٹھ یا دس میگزینوں کو فروخت کی اور زیرِ تصنیف کتاب کی اشاعت کے متعدد

معاہدے رہے۔

اُس وقت تک میری کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی جن لوگوں نے مجھے معاوضے ادا کیے وہ میرے کمالِ فن سے بالکل ناآشنا تھے جس کہانی کا انھوں نے مجھے معاوضہ دیا انھوں نے مطلق نہیں پڑھی تھی اور جس کتاب کی اشاعت کے لیے انھوں نے میرے ساتھ معاہدے کیے وہ ابھی میں نے لکھی ہی نہیں تھی وہ ادب کے نقاد نہیں سرکاری ملازم تھے جو اوپر سے آئی ہوئی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔"

اب آندرے ژید کی رُوداد سُنیے:

"روس میں سفر کے دوران جو آسائشیں مجھے حاصل تھیں وہ اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ مجھے ہر جگہ انتہائی آرام دہ کاریں مہیا کی گئیں اور ہوٹلوں میں بھی مجھے بہترین کھانے اور سب سے اچھے کمرے مہیا کیے گئے۔ میرا کتنا شاندار استقبال ہوا ہر جگہ میری آمد پر جشن ہوئے اور خوب خاطر مدارات ہوئی۔ ایسی کوئی نوازش نہیں تھی جس کا مجھے اہل نہ سمجھا گیا ہو۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں اس استقبال اور مدارات کی خوشگواریاں لے کر نہ لوٹوں۔ لیکن یہ تمام نوازشات مجھے مسلسل طور پر یاد دلاتی رہیں کہ یہاں بھی امتیازات اور مراعات کا دور دورہ ہے۔ حالانکہ میں یہاں مساوات کی تلاش میں آیا تھا۔ جب میں افسروں کے ہجوم سے نکل کر مزدوروں کے درمیان پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے بیشتر انتہائی غریبی کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ہر شام میرے اعزاز میں جو رسمی دعوت ہوتی تھی اُس میں اتنی اقسام اور اتنی مقدار میں کھانے پیش کیے جاتے تھے کہ کھانے کا حقیقی دور شروع ہونے سے پہلے صرف ابتدائی چیزوں سے ہی طبیعت سیر ہو جاتی تھی۔ ڈنر کے پورے چھ دور ہوتے تھے اور یہ مکمل چار گھنٹے تک جاری رہتا تھا۔ روس میں بل ادا کرنے کا موقع مجھے کبھی نہیں ملا۔ لہٰذا یہ اندازہ لگانا میرے لیے ناممکن

ہے کہ اِس قسم کی ضیافت پر خرچ کیا اُٹھتا تھا۔ لیکن میرے ایک دوست نے جو رُوس میں قیمتوں کی سطح سے واقف تھا مجھے بتایا تھا کہ اُس دعوت پر تین دو تین سو روبل کے قریب خرچ ہوتے ہوں گے۔ یاد رکھیئے کہ جو مزدور میں نے دیکھے وہ صرف پانچ روبل یومیہ کماتے تھے اور انھیں سادہ روٹی اور خشک مچھلی کے علاوہ کچھ بھی میسر نہ آتا تھا۔ رُوس میں اپنے قیام کے دوران میں ہم حقیقت میں حکومت کے مہمان نہیں، سوویٹ مُصنّفوں کی مالدار سوسائٹی کے مہمان تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ آخر انھوں نے ہم پر کتنی رقم خرچ کی۔ ہم پورے چھ آدمی تھے۔ ہمارے ساتھ گائیڈ بھی تھے اور بعض اوقات میزبانوں کی تعداد بھی اِس سے کم نہ ہوتی تھی۔ انھوں نے یقینی طور پر یہ سمجھا ہوگا کہ میں ان کے رُوپے کا اس سے مختلف مُعاوضہ ادا کروں جو میں نے ادا کیا۔ میرا خیال ہے کہ "پراودا" نے میرے خلاف جس نفرت کا اظہار کیا اس میں اس واقعہ کو بھی دخل تھا کہ مجھ پر جو رُوپیہ صرف کیا گیا تھا وہ اکارت گیا"

آرتھر کوئسلر اور آندرے ژید غیر معمولی اخلاقی جرأت کے مالک تھے کہ الطاف و کرم کی یہ فراوانی ان کے ضمیر کی آواز کو خاموش نہ کر سکی۔ بالعموم ایسا نہیں ہوتا جب ہندوستان کے ایک معمولی صوبائی لیڈر کو بین الاقوامی تمغۂ امن کے ساتھ ساتھ سوا لاکھ روپے کے انعام کا مستحق بھی قرار دے دیا جائے تو یہ بات بالکل قدرتی ہے کہ وہ سوویٹ رُوس میں "مذہبی اور فکری آزادی" کے وجود پر ایمان لے آئے۔ اور یہ بات بھی بالکل قدرتی ہے کہ اس کی "خوش بختی" دوسرے ناکام سیاسی لیڈروں، مصنفوں اور آرٹسٹوں کے دل میں بھی لالچ کی چنگاری روشن کر دے۔ جمہوری ملکوں میں سماجی حقیقت نگاری کی شمع اسی چنگاری سے روشن ہوتی ہے۔

مئی ۱۹۵۴ء ———

(۴)

ادب میں فحاشی پر احتساب

ادب میں فحاشی پر احتساب کا مسئلہ سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ چونکہ اس سلسلے میں مروجہ قانون میں ترمیم کرنے کا ایک بل بھی پارلیمنٹ میں پیش ہونے والا ہے اس لیے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جانا چاہیے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس امر کی صریح وضاحت ممکن نہیں کہ کیا چیز فحش ہے اور کیا نہیں؟ بالعموم ایسے ہر فن پارے کو فحش قرار دے دیا جاتا ہے جس کے متعلق فیصلہ کرنے والے مجسٹریٹ کو یہ گمان گزرے کہ اسے پڑھنے سے قاری کے اخلاق پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی کہ زیرِ احتساب تحریر کو پڑھ کر کسی کا اخلاق واقعی خراب ہوا ہے۔ گویا سزا ارتکابِ جرم پر نہیں بلکہ احتمالِ جرم پر دی جاتی ہے۔ اس طرح یہ انسدادی نظر بندی کے قانون کے مترادف ہے جسے بالعموم ہنگامی حالات ہی میں قابلِ جواز سمجھا جاتا ہے۔

فحاشی کے متعلق کسی مستقل رائے عامّہ کا بھی وجود نہیں جیسا کہ متعدد ہندو مندروں کے نقش و نگار دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے، قدیم ہندو معاشرے میں جنسی افعال کی نقاشی کو فحش قرار دے کر قابلِ احتساب کبھی نہیں سمجھا گیا۔ قدیم سنسکرت تصانیف مثلاً کمار سمبھو، گیتا گووند اور اس قسم کی کئی اور کتابوں میں بھی عملیاتِ وصل کو بڑی بے تکلفی سے بیان کیا گیا ہے۔ نہ کبھی ان کتابوں کو قابلِ مواخذہ

سمجھا گیا اور نہ ان کے مطالعے پر ہی کوئی روک لگائی گئی۔

اسلامی معاشرے میں فنونِ لطیفہ کو کسی خاص احترام کا مستحق نہیں سمجھا گیا لیکن مخربِ اخلاق ہونے کے الزام میں ان پر احتساب بھی نہیں کیا گیا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اس کی زد میں مولانا رومی کی مثنوی ضرور آتی۔ فارسی کی دوسری کتابوں مثلاً گلستاں وغیرہ کو بھی اس ذیل میں لانا مشکل نہیں۔ لیکن یہ وہ کتابیں ہیں جنھیں معلم اخلاق ہی سمجھا جاتا ہے اور بچے بچیوں تک کو ان کے مطالعے کی عام اجازت رہی ہے۔ اُردو کے قدیم شاعروں کے فرمودات میں بھی فحاشی کی مثالیں تلاش کرنا دشوار نہیں۔ میر اور ذوق تک کے کلام میں انھیں بہ آسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ پنجابی میں وارث شاہ کی ہیر کو تاریخی اہمیت کا مستحق سمجھا جاتا ہے لیکن اگر عملیات وصل کے بیان کو فحاشی قرار دے دیا جائے تو یہ کتاب فحاشی کی پوٹ ہے۔

اگر فحش ادب پڑھ کر لوگوں کا اخلاق بگڑتا تو پرانے لوگوں کا اخلاق موجودہ دور کے لوگوں سے زیادہ خراب ہونا چاہئے تھا لیکن انسدادِ فحاشی کے حامیوں کا کہنا ہے کہ موجودہ نسل کا اخلاق پرانی نسلوں کے اخلاق سے خراب تر ہے۔ ہماری بحث اس دعوے کی صحت یا عدم صحت سے نہیں بلکہ اس فکری تضاد سے ہے جس میں ادب پر احتساب کے حامی بالعموم مبتلا ہوتے ہیں۔

اگر ہر اس چیز کو فحش قرار دے دیا جائے جس سے انسان کے سفلی جذبات کی انگیخت ہوتی ہے تو اس میں صرف ادب نہیں بلکہ بہت کچھ آجاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عورتوں کا چست لباس دیکھ کر ان کے جذبات مشتعل ہوجاتے ہیں کچھ اس سے بھی آگے جاتے ہیں۔ ان کے لیے بے پردہ عورت کو دیکھنا ہی سفلی جذبات کی انگیخت کا باعث ہوسکتا ہے۔ اگر ان لوگوں کے اخلاق کے تحفظ کے لیے تمام عورتوں کو پردے میں بٹھا دیا جائے تو بھی مشکل حل نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان کے جذبات تو خوبرو لڑکوں کو دیکھ کر بھی مشتعل ہوسکتے ہیں۔

سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اگر احتساب کا سلسلہ چل نکلے تو کہیں ختم نہیں ہوتا۔ چین میں بیتھوون کی موسیقی اور شیکسپیئر تک کو مخربِ اخلاق قرار دیا جا چکا ہے۔ روس میں سینا وسکی اور ڈینیل کو جیل بھیجتے وقت ان پر مخربِ اخلاق ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ ہندوستان میں جب منٹو کا کمیونسٹ ادیبوں سے بگاڑ ہوا تو ترقی اور انقلاب کے ان حامیوں نے اس پر فحاشی ہی کا الزام چسپاں کیا تھا اور نئے ادیبوں کے خلاف بھی وہ اسی الزام کو دہرا رہے ہیں۔

ہندوستان میں فحش نگاری کے خلاف پہلا قانون ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں بنا تھا اور ظاہر ہے کہ اس میں اس وقت کی مصلحتوں کو بھی کچھ دخل تھا۔ کچھ ترمیموں کے ساتھ یہ قانون بنیادی طور پر آج تک موجود ہے اور سزا دیتے وقت بالعموم برطانوی عدالت کے پرانے فیصلوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ بات البتہ فراموش کردی جاتی ہے کہ اب برطانیہ اور دوسرے یورپی ملکوں میں ماحول بہت کچھ بدل گیا ہے ——— کبھی وہاں "لیڈی چیٹرلی

کا عاشق" کو قابلِ ضبطی سمجھا جاتا تھا لیکن آج ایسا نہیں۔ فحش ادب پر پابندی لگانے کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس سے اس ادب کی کشش بڑھ جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سویڈن میں فحش ادب پر سے پابندی ہٹا لی گئی تو وہاں فحش ادب کی فروخت بتدریج بالکل ہی ختم ہوگئی۔

ہندوستان میں ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ہمارا سماج مختلف ثقافتی گروہوں پر مشتمل ہے۔ آخر کسی تحریر کو فحش قرار دینے کے لیے کس ثقافتی گروپ کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا جائے گا؟ قبائلی بھی تو ہمارے ہی ملک میں آباد ہیں جن میں سے کچھ عورتیں انگیا کا استعمال ضروری نہیں سمجھتیں اور بعض کے یہاں ازالۂ بکارت کا جشن منایا جاتا ہے۔

پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم جدید فحش تحریروں پر تو پابندی لگائیں لیکن قدیم فحش تحریروں کو مواخذے سے بری قرار دیتے رہیں؟ ہمارے قانون کی ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ ریاست، مذہب، نسل، ذات، جنس اور مقام پیدائش کی بنا پر شہریوں میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھے گی۔ کیا یہ بات مختلف گروہوں کے درمیان امتیاز کا باعث نہیں ہوگی کہ ہم فحاشی کے ان مظاہر پر تو کوئی روک نہ لگائیں جو نقش و نگار کی صورت میں مندروں پر موجود ہیں لیکن ایسی نئی ادبی تحریروں کو قابلِ مواخذہ سمجھیں جن پر فحاشی کا گمان گزر سکتا ہے۔

اس معاملے میں گاندھی جی کسی امتیاز کے روادار نہیں تھے۔ ان کے نزدیک اس قسم کے مندر بھی مستحقِ انہدام تھے۔ لیکن گاندھی جی اس معاملے میں انتہا پسند تھے۔ وہ تو افزائشِ نسل کے مقصد کے سوا غالباً جنسی فعل کو بھی غیر اخلاقی سمجھتے تھے اور برہمچریہ کو ان کے نزدیک قدرِ اول کا مقام حاصل تھا۔ کیا موجودہ دور میں بھی جب ہم بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پانے کے لیے آلاتِ مانعِ حمل کو مقبول بنانے کی مہم چلا رہے ہیں، ہم ان کے اخلاقی مفروضوں کو اپنانے کی مدعی ہو سکتے ہیں؟

——— مارچ ۱۹۶۸ء

(۵)

احیائے ادب کی تحریک

اسے ایک نیک فال سمجھنا چاہیے کہ ہند اور پاکستان دونوں ملکوں میں بیک وقت احیائے ادب کی تحریک کا آغاز ہوگیا ہے یا یوں کہا جائے کہ اس تحریک کی ضرورت کا احساس پیدا ہوگیا ہے۔ یہ احساس بھی کم نہیں اور آگے چل کر اس کا ایک تعمیری شکل اختیار کر لینا یقینی ہے۔

گمرہانِ دانش نے دانشوری کا لبادہ اوڑھ کر گزشتہ سات آٹھ برس میں ادب کے نام پر جو دھاندلی مچائی تھی اس کے خلاف اب ردِ عمل شروع ہوگیا ہے۔ ان سات آٹھ برس میں ان گمرہانِ دانش نے کم از کم اردو ادب میں تو اچھی خاصی اجارہ داری قایم کر لی تھی اور ان تمام ادیبوں کو خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا جو ادب کی مستقل قدروں کو خیرباد کہنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ دور کتنا ادب دشمن تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ نیاز حیدر تاریخی قدروں کے نام پر بہترین شاعر بن گئے ہیں اور پرکاش پنڈت ہندوستان کے چیخوف:

وائے گر از پسِ امروز بود فردائے

محفل کا یہ رنگ دیکھ کر سچے ادیبوں اور شاعروں نے چپ سادھ لی۔ اور میدان کرشن چندروں اور علی سردار جعفریوں کے ہاتھ رہ گیا۔ لیکن یہ ہیجانی دور زیادہ دیر تک قایم نہیں رہ سکتا تھا۔ آخر ان لوگوں نے جن کے

دل میں تخلیق کی سچی لگن بھتی یہ محسوس کیا کہ اگر ادب کو زندہ رکھنا ہے توان گندم نما جو فروشوں سے لوہا لینا ہی پڑے گا۔
اس سلسلے میں ہندوستان کے صاحب طرز شاعر اور نکتہ رس نقاد علامہ جعفر علی خاں اثر کے یہ الفاظ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں کہ :

"جب تک اچھی شاعری کے دو قدر داں بھی صفحۂ ہستی پر موجود ہیں اور اس سے کیف اندوز ہو سکتے ہیں شاعری کا انحطاط نہیں ہو سکتا۔ یہ دو اشخاص بھی اپنی آواز بلند نہ کریں اور کس مپرسی کی افسردگی ایک طویل عرصے تک چھائی رہے تو کیا ہوتا ہے۔ جذبہ شاعری دوبارہ جنم لے گا۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت کی ایک اہم ضرورت کو پیدا کرتا ہے۔"

ان لفظوں میں جو عزم موجود ہے اگر وہ چند دلوں کو بھی گرما دے تو احیائے ادب کی تحریک کا آغاز ہو سکتا ہے۔
ہمارے خیال میں ایسے لوگوں کی کمی بھی نہیں جو ادب کے سچے پرستار ہیں لیکن ایک تو غوغائیوں نے ان کو مرعوب کر دیا ہے اور ایک ان میں تنظیم نہیں۔ سچ پوچھو تو ان کی تنظیم اشتراکی "ادیبوں" کی طرح ممکن بھی نہیں کیونکہ سچے ادیب اور شاعر فطرتاً انفرادیت کیش اور تنہا رو ہوتے ہیں۔ بہر حال ان لوگوں کا یہ فرض ضرور ہے کہ وہ اپنی آواز بلند کرتے رہیں۔ اس مقصد کے لیے وحدتِ فکر کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ جب زندگی میں تضاد ہے تو طبایع میں اختلاف کیوں نہ ہو اور اگر طبایع میں اختلاف ہے تو اس کا اظہار ادب میں کیوں نہ ہو۔ ادب تو پنپتا ہی تب ہے اگر ادیب کو دل کی بات کہنے کی کھلی آزادی حاصل رہے۔ ہم سرخ یا زرد فارشسٹ نہیں کہ ادیبوں پر اس قسم کی پابند عائد کریں کہ وہ یہ لکھیں اور وہ نہ لکھیں۔
احیائے ادب کی تحریک کے سلسلے میں محمد حسن عسکری کا وہ مقالہ بھی بہت اہم ہے جو انھوں نے ماہنامہ "ساقی" میں جھلکیاں کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس مضمون کی ابتدا اس فقرے سے ہوتی ہے کہ "بحیثیت مجموعی اُردو ادب اب مر چکا ہے۔" اور خاتمہ اس فقرے پر کہ "اگر موجودہ ادیبوں کو قربان کر دینے سے ادب میں پھر سے جان آجائے تو یہ سودا گھاٹے کا نہیں رہے گا۔"
ہمارے خیال میں مضمون کے ابتدائی فقرے کے مقابلے میں آخری فقرہ زیادہ اہم ہے۔ اگر اردو ادب دائمی مر گیا ہے تو اس کے زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس صورت میں موجودہ ادیبوں کی قربانی دینا صرف خونِ ناحق سے ہاتھ رنگنے کے مترادف ہے ان کے پورے مضمون سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ادب مر گیا ہے۔ ادب کی موت کا اعلان انھوں نے بڑی دردمندی سے کیا ہے اور اس اعلان کی پشت پر ایک تعمیری جذبہ کارفرما ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ تجدید ادب کے لیے موجودہ ادیبوں کو جن میں ان کے ذاتی دوست بھی ہوں گے قربان کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔
ان کی تلخ بیانی کا معاملہ تو انھیں تک ہے لیکن بات انھوں نے بڑے پتے کی کہی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جب

تک موجودہ ادیبوں کو جو ترقی پسند ادب کے علمبردار ہیں، مد فضول سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے گا اس وقت تک اُردو ادب کے احیا کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان لوگوں نے ادب کے نام پر جو کچھ لکھا ہے وہ ادب کے میدان میں دخل در معقولات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ لوگ غالباً خود بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے چنانچہ انھوں نے اپنی عظمت منوانے کے لیے نقادِ قلم کا نہیں بلکہ عوام کے لٹھ کا سہارا لیا اور ادبی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر تاریخی قدروں اور عوام کی ترجمانی کا ڈھنڈورہ پیٹنے لگے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ انھوں نے واقعی عوام کی ترجمانی کی۔ اگر انھوں نے واقعی عوام کی ترجمانی کی ہوتی تو عوام ان سے اتنی بے اعتنائی کا سلوک ہرگز نہ کرتے کہ وہ زندہ درگور ہو جاتے۔ دراصل ان لوگوں کو ادب کی طرح عوام سے بھی کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ یہ تو صرف اپنی شکست کی آواز تھے اور یہ آواز بھی نغمگی سے محروم اور کرخت تھی۔ اب کوئی اسے سنے تو کیوں سنے۔

بعض لوگ تجدیدِ ادب کے سلسلے میں خاکستر کو کریدنے میں مصروف ہیں۔ کبھی یہ لوگ راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے نام خط لکھ کر ان کی غیرت کو اُبھارتے ہیں اور کبھی جوش ملیح آبادی کو تنکوں کا سہارا دے کر انھیں اقبال کے مقابلے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب قبرستان میں آواز لگانے والی بات ہے۔ ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ مردے کبھی زندہ نہیں ہوتے۔ اور پھر یہ بھی تو سوچیے کہ جب یہ لوگ زندہ تھے اس وقت انھوں نے کون سا تیر مار لیا تھا۔

اگر یہ لوگ واقعی ادب کا احیا چاہتے ہیں تو انتظار حسین کے اس مشورے کو اپنا لیں:

مرنے والوں کو مرنے دو

جینے والوں کو اپنا لو

ترقی پسند ادیب مر چکے ہیں۔ یہ دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے۔ ان کی موت ایسی بھی نہیں کہ اس پر آنسو بہائے جائیں۔ ان کی ٹولی کے بعض نقادوں نے بونوں کو دیو قامت ثابت کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام ہو گئی۔ آخر ملمع کب تک قائم رہ سکتا ہے۔

——— نومبر ۱۹۵۲ء

(۶)

ادب کے جدید رجحانات

پچھلے دنوں اُردو ادب میں جمود کا نعرہ بلند ہوا تھا۔ یہ نعرہ فضا میں اگرچہ اب بھی گونج رہا ہے، لیکن گزشتہ چند ماہ کی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اب اس نعرہ کو واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف یہی نہیں کہ جمود کی جو عارضی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی وہ ختم ہوگئی ہے بلکہ ایک نئی سرگرمی اور ایک نئے ولولے کے آثار بھی صاف نظر آتے ہیں۔ شعر، افسانہ، تحقیق اور تنقید، ان تمام شعبوں میں سنجیدہ اور قابلِ قدر کام ہوا ہے۔ اور ادیبوں اور شاعروں کے دل ایک نئی تخلیقی لگن سے سرشار نظر آتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُردو ادب سے دلچسپی صرف اُردو والوں تک محدود نہیں رہی بلکہ دوسری زبانوں کے اہلِ قلم اور اہلِ ذوق بھی اس میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ وہ دن گزر چکے جب اُردو صرف دوسروں کی دریوزہ گر تھی۔ اب یہ دوسری زبانوں کو بہت کچھ دے بھی رہی ہے۔ اب یہ دوسری زبانوں کے ادب سے متاثر ہی نہیں ہوتی انھیں متاثر کر بھی رہی ہے۔ غزل، جس کے متعلق ہر لمحہ یہ گمان گزرتا تھا:

ڈر ہے خبرِ بد مرے مُنہ سے نہ نکل جائے

نئی آن بان سے سامنے آرہی ہے۔ اب یہ صرف اُردو ہی میں پسندیدہ صنفِ سخن نہیں۔ ہندی، گجراتی اور پنجابی کے

شاعر بھی غزلیں کہنے لگے ہیں اور اُردو کی کتابیں ہندی رسم الخط میں وسیع پیمانے پر شایع ہونے لگی ہیں۔ اُردو ادب کی دل موہ لینے والی صفات کا اس سے بہتر اعتراف ممکن نہیں۔ اس سلسلے کی مطبوعات میں ایک تازہ کتاب "شاعری کے نئے موڑ" ہے، جو جناب اجودھیا پرشاد گوپلی کی تالیف ہے۔

انتخاب میں ۲۶۸ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انتخاب سرسری نہیں بلکہ برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ شروع میں ایک مختصر اور جامع دیباچہ بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ معنی خیز کتاب کا انتساب ہے۔ گوپلی جی نے یہ کتاب ایک انجانے محسن کے نام معنون کی ہے جس نے ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء کو انھیں ایک میٹھا طنز دیا تھا۔

گوپلی جی چاندنی چوک سے گزر رہے تھے کہ کانگرس کے ایک اُردو پوسٹر کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھ کر کسی شخص سے پوچھ بیٹھے : "بڑے بھائی اس میں کیا لکھا ہوا ہے ؟"

اُس نے چھوٹتے ہی کہا : "اماں، اندھے ہو۔ اتنا صاف پوسٹر بھی نہیں پڑھا جاتا۔" گوپلی جی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اُن کا کہنا ہے کہ : "گھر آکر غیرت نے تختی اور اُردو کا قاعدہ لانے پر مجبور کردیا۔"

گوپلی جی نے اپنی تالیف اس میٹھے طعنے کی یاد میں اپنے اُسی انجانے محسن کے نام معنون کی ہے۔ اپنے اس انجانے محسن کو مخاطب کر کے وہ کہتے ہیں : "کئی بار سوچتا ہوں کہ کہیں پھر تم سے ملاقات ہو جائے تو میری آنکھوں کی رہی سہی دھند بھی دُور ہو جائے۔"

ہر چند کہ بساطِ شعر پر حکمرانی ابھی غزل ہی کی ہے، لیکن جدید اسالیب میں بھی قابلِ قدر تجربے ہو رہے ہیں جو فکر و نظر کی ندرت کے بھی آئینہ دار ہیں۔

اُردو میں ماحول پرستی کی جو رسم چل نکلی تھی اب اس کے خلاف ردِّ عمل شروع ہو گیا ہے۔ اب ماحول کی عکاسی ہی معیارِ فن نہیں بلکہ شاعر کے دل میں فکر اور جذبے کے زور سے ماحول پر چھا جانے کی آرزو بھی بیدار ہو رہی ہے۔ اس آرزو کا بہترین اظہار مجید امجد کی ایک مختصر نظم "پیشرو" میں ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ نظم آپ کو بھی سُنا دوں :

بت جھڑ کی اُداس سلطنت میں
اک شاخِ برہنہ، تن بہ تنہا
بے برگ مسافتوں میں حیراں
کچھ زود شگفتہ شوخ کلیاں
جو ایک سرورِ سرکشی میں
اعلانِ بہار سے بھی پہلے
انجامِ خزاں پہ ہنس پڑی ہیں

تقدیرِ چمن بنی کھڑی ہیں
اس یخ کدۂ یقینِ غم میں
دیکھو یہ شگفتہ دل شگوفے
ماحول نہ کائنات ان کی
اک نازِ نمو حیات ان کی
عمر ان کی بس ایک پل ہے لیکن
آئیں گے انھیں کی راکھ سے کل
ماتھے پہ حسیں تلک لگائے
پھولوں بھری صبحِ نو کے سائے

بے برگ مسافتوں کے باوجود اور اعلانِ بہار کی دوری کے باوصف انجامِ خزاں پر ہنس دینا انسان کی عظمت کا سب سے بڑا اعلان ہے۔ نازِ نمود ہی ہے جو یخ کدۂ غم میں بھی برقرار ہے۔ یہ نازِ نمو خواہ ایک لمحے کے لیے ہو لیکن وہ ابد تک کی حقیقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی نازِ نمو کا اظہار ادب ہے جو فانی ہونے کے باوجود لافانی اور نرم و نازک ہونے کے باوجود سنگین سے سنگین حقیقت کے مقابلے میں زیادہ پائدار ہے۔

شاعروں کو یہ احساس بھی ہونے لگا ہے کہ کسی ازلی و ابدی موضوع کی تلاش میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا درست نہیں۔ روشنی صرف مہر و ماہ ہی میں نہیں ہوتی۔ جگنو کی چمک بھی دل کو لبھانے کے لیے بہت ہے۔ حسنِ ازل کی دلکشی مسلّم، لیکن اس کی ہلکی ہلکی پرچھائیوں کا ذکر بھی تو دلکش ہے۔ اور پھر جو بات آج کہنی ہے اسے کل پر کیوں ٹالا جائے۔ مُنیر نیازی اپنے ہمعصروں کو مشورہ دیتے ہیں:

آج کا کام نہ کل پر ٹالو
جو کچھ لکھنا ہے لکھ ڈالو
اِدھر اُدھر کی چھوٹی باتیں
ذرا ذرا سی جیتیں ماتیں
جانے پھر کب موت آ جائے
دل کی دل ہی میں رہ جائے

یہ ذرا ذرا سی جیتیں ماتیں زندگی کو زندگی بناتی ہیں اور زندہ رہنے کے ولولے کو قائم رکھتی ہیں۔

لیکن یہ ذرا ذرا سی جیتیں ماتیں اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کے لیے فکر کا تمام تر محور نہیں۔ ان کی نظر زندگی کی مستقل اقدار پر بھی ہے جنھیں خود زندگی کے معرضِ خطر میں ڈالے بغیر خیرباد نہیں کہا جا سکتا۔ عزیز احمد کا ناولٹ "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" اسی حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہے۔ ناول کا پلاٹ تیمور کے زمانے سے

تعلق رکھتا ہے، جب جنگل کا قانون زندگی کا ضابطہ تھا۔ تیمور قاضی زین الدین سے اپنے شکست خوردہ حریف سلطان حسین کے قتل کا فتوائے جواز حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے جس نے نتائج سے بے پروا ہو کر کہہ دیا کہ عدل میں سازش کا مقام نہیں۔ اس کے بعد تیمور جنگل کے قانون کا سہارا لیتا ہے اور اپنے حریف کو بلخ کے امیر کیخسرو کے ہاتھوں قتل کرا دیتا ہے۔

بابا زین الدین نے تہجد کی نماز سے منہ پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کیخسرو سلطان حسین کا کٹا ہوا سر ہاتھ میں لیے تیمور کے خیمے کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے آگے کا بیان خود مصنف کی زبان میں سنیے:

"قاضی زین الدین نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ اور ساری دنیا کے لیے دعا مانگی۔ ان شہروں کے لیے جنھیں اب تک مسمار نہیں کیا گیا تھا۔ ان شہریوں کے لیے جن کا قتل عام نہیں ہوا تھا۔ ان عورتوں کے لیے جن کی عصمت دنیا بھر کے مکانوں میں محفوظ تھی۔ ان بچوں کے لیے جو یتیم نہیں ہوئے تھے اور غلام نہیں بنے تھے۔ اور جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو کوئی اس کے دل میں کہہ رہا تھا، یہ سب بیکار ہے۔ یہ سب بیکار ہے۔ کیونکہ وہ دونوں آنکھیں آہن پوش ہو چکی ہیں۔"

قاضی زین الدین نے تیمور سے صرف یہی نہیں کہا تھا کہ عدل میں سازش کا مقام نہیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ:

"جب جسم کو فولاد کا زرہ بکتر پہنایا جاتا ہے اور سر پر آہنی خود اوڑھا جاتا ہے تب بھی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ حالانکہ آنکھیں جسم کا سب سے نازک حصہ ہیں لیکن جب آنکھیں آہن پوش ہو جائیں تو زرہ بکتر بیکار ہے۔ فولادی خود بیکار ہے۔ تیر و تبر، ڈھال اور تلوار بیکار ہیں۔ عدل میں اتنا ہی خطرہ ہے جتنا آنکھیں کھلی رکھنے میں، لیکن آنکھوں کے آہن پوش ہونے میں زیادہ خطرہ ہے۔"

تحقیق اور تنقید کے شعبے میں بھی زیادہ متانت اور ذمہ داری کا ثبوت ملتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے حالی پر متعدد مضامین لکھے ہیں اور یادگارِ غالب پر ان کا تحقیقی مطالعہ تو خاصے کی چیز ہے۔ انھوں نے شخصیت پرستی کی رو سے ہٹ کر اس کتاب پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور حالی کے بعض ایسے ماخذ کا پتہ لگایا ہے جن سے حالی نے استفادہ تو کیا لیکن ان کا حوالہ نہیں دیا۔ انھیں شکوہ ہے کہ حالی نے جس محنت اور دیدہ ریزی کا ثبوت "حیاتِ سعدی" میں دیا ہے اس کا مظاہرہ "یادگارِ غالب" میں نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ڈاکٹر قریشی حالی کے محاسن کے منکر ہیں۔ اپنے ایک اور مضمون "میں اور حالی" میں وہ کہتے ہیں: "ان کی غزل کے بعض شعر بڑے پُرلطف ہیں۔ ان کا

مرثیۂ غالب اُردو کے بہترین مراثی میں شمار ہونا چاہیئے۔ مسدس حالی کے بعض بند خاصے کی چیز ہیں۔ لیکن شاعر حالی اور شاعر حالی میں بڑا فرق ہے۔" صرف یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر قریشی یہ بھی کہتے ہیں کہ نقاد حالی اور محقق حالی میں بھی بڑا فرق ہے۔

مالک رام کی تصنیف "تلامذۂ غالب" اپنے موضوع پر ایک جامع تصنیف ہے۔ اس میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بہ تلاش بسیار متعدد تصویریں بھی مہیا کی گئی ہیں بعض تصویریں بالکل نئی ہیں اور پہلی بار شایع ہو رہی ہیں۔ مثلاً تفتہ، ذکا، رشکی، رمز، رفعت، رنج، شوکت، وفا وغیرہ۔ مصنف نے ان ذرائع کی تفصیل بھی دے دی ہے جن سے یہ تصاویر دستیاب ہوئیں۔ بیشتر شاگردوں کے حالاتِ زندگی کے ساتھ نمونۂ کلام بھی دیا گیا ہے۔ لیکن بعض شاگرد ایسے بھی ہیں جن کے نہ حالات مل سکے نہ کلام۔ بعض کا تو نام بھی معلوم نہ ہو سکا صرف ان کے تخلص ان کی یادگار ہیں۔

اُردو میں آپ بیتیوں کی بڑی کمی ہے اور اچھی آپ بیتیاں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ دیوان سنگھ مفتوں کی کتاب "ناقابلِ فراموش" نے اس کمی کو کافی حد تک پورا کر دیا ہے۔

آپ بیتی میں جو قدرتی کشش ہوتی ہے اسے بسا اوقات یہ بات زائل کر دیتی ہے کہ مصنف اپنی زندگی کے واقعات بے کم و کاست بیان کرنے کی بجائے اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے مصنوعی اور مثالی شخص کی زندگی بیان کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کے حقیقی گوشے بے نقاب ہونے سے رہ جاتے ہیں اور ایک کٹھ پتلی کی سرگزشت سامنے آجاتی ہے جو نہ دل کے لیے کشش رکھتی ہے نہ دماغ کے لیے۔ ایک اور چیز جو آپ بیتی کی کشش کو زائل کرتی ہے یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے وقت حقیقی تاثرات کی بجائے ایسے خیالات قلمبند کرنے لگتا ہے جو مفروضوں کی چھلنی سے چھن کر نکلتے ہیں۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں کی کتاب اگر موجبِ کشش ہے تو اس کا باعث یہی ہے کہ وہ اپنے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ڈالتے اور اپنی زندگی کے تمام خد و خال بے ریائی کے ساتھ سامنے لے آتے ہیں۔

——— ستمبر ۱۹۵۸ء

مثنوی فریادِ داغ

اُردو کے مشہور ناقد سر عبدالقادر مرحوم نے مثنوی "فریادِ داغ" کے متعلق کہا ہے کہ:

"اگرچہ داغ نے چار ضخیم دیوان چھوڑے ہیں مگر صرف یہ مثنوی بھی ان کی بقائے دوام کے لیے کافی ہے۔"

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو اگرچہ شکایت ہے کہ: "بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں" لیکن انھیں یہ بھی تسلیم ہے کہ: "اس مثنوی کے بہت سے اشعار اعلیٰ درجے کے ہیں اور سادگی، روانی اور عمدگی ان کی قابلِ داد ہے۔"

"فریادِ داغ" داغ کے اپنے وارداتِ قلبی کا بیان ہے۔ یہ ان کی اپنی حیاتِ معاشقہ ہے۔ اس حیاتِ معاشقہ کے متعلق ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ "مجھے تمام عمر میں پانچ عشق ہوئے جن میں دو اب تک میرے رگ وریشہ میں سمائے ہوئے ہیں۔ ایک منی بائی حجاب کا دوسرا عشق خواجہ معین الدین چشتیؒ کا۔" "فریادِ داغ" منی بائی حجاب کے عشق کا بیان ہے جو کلکتہ کی ایک مشہور طوائف تھی اور جس سے ان کی ملاقات قیام رامپور کے دوران میں بے نظیر کے میلے میں ہوئی۔ لیکن صرف یہی بات کہ داغ نے اس عشق کا ذکر خواجہ معین الدین چشتی کے عشق کے ساتھ کیا ہے

اس کا ثبوت ہے کہ انھیں اس پر کوئی ندامت نہیں تھی بلکہ ناز تھا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو تعیش کی جو تصویریں نظر آئیں وہ غالباً اس تصور کا نتیجہ ہیں کہ شاعر کا عشق لازمی طور پر افلاطونی ہوتا ہے۔

داغ افلاطونی عشق کے قائل نہیں تھے جسم کے تقاضوں پر انھیں کوئی ندامت نہیں تھی اور وہ عشق کو تفریح کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے لیکن عشق کو تفریح کا ذریعہ اور جسم کا تقاضا سمجھنے کے باوجود ان کا تصورِ عشق اخلاص و صداقت سے محروم نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو عشق کے یہ مثبت پہلو ان کے ذہن میں نہیں آسکتے تھے:

سب نے کی ہیں برائیاں اس کی
میں نے لکھیں بھلائیاں اس کی
دل بنا ہے اسی مزے کے لیے
میں نے یہ لطف جان دے کے لیے
شیوۂ خاص ہے یہ عام نہیں
جو نکمے ہیں ان کا کام نہیں
عشق سے دل گداز ہوتا ہے
ناز میں بھی نیاز ہوتا ہے
عشق سے آدمیت آتی ہے
آدمی کو مروت آتی ہے
عشق باطن ہو عشق ظاہر ہو
اس سے توبہ کرے تو کافر ہو

جو عشق اس قسم کے جذبات پیدا کر سکے اس کی صداقت سے صرف اس بنا پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موضوعِ عشق ایک طوائف ہے کیونکہ اہم بات بقول نیاز فتحپوری یہ نہیں کہ "عشق کس سے کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ عشق کیسے کیا جائے" اور پھر غالب بھی تو کہہ گئے ہیں:

مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

"فریادِ داغ" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے اپنے یا اپنے محبوب کے چہرے پر کوئی مصنوعی نقاب نہیں ڈالی مثلاً اپنے متعلق اس نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ یہ اس کا پہلا اور ناگہانی عشق نہیں تھا اور وہ تجربہ کار عاشق تھا عشق کی ابتدا کے باب میں کہتے ہیں:

دل ستایا ہوا ہزاروں کا
داغ کھایا ہوا ہزاروں کا

خوب تکلیفِ عشق پائے ہُوئے
بیوفاؤں کا رنج اُٹھائے ہوئے

لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب اس نئی آفتِ جان سے سامنا ہوا تو شاعرِ عشق و عاشقی سے ہاتھ اُٹھا چکا تھا:

توبہ کرلی پیام سے مَیں نے
ہاتھ اُٹھایا سلام سے مَیں نے
اس پیام و سلام سے نفرت
تھی محبّت کے نام سے نفرت
گو طبیعت تو گد گدائی تھی
پر کسی سے نہ میل کھاتی تھی

اور یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کیونکہ جب داغ کو یہ حادثہ پیش آیا تو اُن کی عمر باون سال کی تھی اور انھیں اعصابی امراض نے بھی گھیر رکھا تھا۔

داغ کو یہ بھی احساس تھا کہ ان کی شکل میں ایسی کوئی کشش نہیں جو ان کے محبوب کو ان کی طرف راغب کرسکے۔ عاشق کی تصویر سے معشوق کی مخاطبت کے باب میں وہ حجاب سے اپنے متعلق کہلواتے ہیں۔

ایسی صورت پہ یہ دماغ ترا
خوب رکھا ہے نام داغ ترا
حُسن ہوتا ہے حاصلِ تصویر
روسیہ تو ہے قابلِ تصویر؟
ایسی تصویر کس کو بھاتی ہے
پر بلا سے ہنسی تو آتی ہے
تجھ سے رونق نہیں ہے گھر کے لیے
رکھ لیا ہے نظر گذر کے لیے

لیکن اس سب کچھ کے باوجود داغ کو اپنی طبیعت پر ناز تھا اور ان کا خیال تھا کہ ان کی شاعری آڑے آجائے گی۔ اس بارے میں محبوبہ سے کہلواتے ہیں:

نہ کہیں گے کہ صورت اچھی ہے
ہاں مگر کچھ طبیعت اچھی ہے

پھر داغ کو یہ بھی احساس تھا کہ جس آفتِ جان سے انھیں پالا پڑا ہے وہ کوئی سادہ دل عورت نہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کائیاں اور معاملہ فہم ہے۔ صید نہیں بلکہ صیاد معشوقہ کی تعریف میں کہتے ہیں:

سج دھج آفت غضب تراش خراش
کسی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش
کبھی سائے سے اپنے ڈر جانا
کبھی کچھ بانکپن بھی کر جانا
ہر کسی کو نظر میں رکھ لینا
خوب کھوٹا کھرا پرکھ لینا
نرم باتیں کبھی نزاکت سے
گرم فقرے کبھی شرارت سے
مفت دل دے کے نذرِ جاں لینا
باتوں باتوں میں امتحاں لینا
سادگی میں بنا وٹیں کیا کیا
اُکھڑی اُکھڑی لگاوٹیں کیا کیا
ہر کسی سے اک التفات کی بات
لطف کا لطف اور بات کی بات
سو اگر ہیں کسی سے کام نہیں
پر کوئی شاکیِ کلام نہیں

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام پُرکاری کے باوجود داغ کی کوئی ادا اسے ضرور بھا گئی تھی لہٰذا اس کے لیے اُنھیں یہ یقین دلانا ضروری ہو گیا:

ہم کو کچھ آرزوئے مال نہیں
اس کا واللہ کچھ خیال نہیں
زر سے معمور ہے ہمارا شہر
کون سا دُوسرا ہے ایسا شہر
ہم تو بھوکے ہیں آدمیت کے
آدمیت کے ساتھ الفت کے
ایسے ویسوں سے جی نہیں ملتا
داغ سا آدمی نہیں ملتا

یہ باتیں کتنے ہی رسمی اور پیشہ ورانہ انداز میں کہی گئی ہوں لیکن داغ کو ان پر اعتبار تھا اور بقول میر تقی میر:

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

حجاب رام پور میں قیام کے بعد اور انھیں یہ یقین دلانے کے بعد کہ :

دل سے نزدیک ہم ہیں دُور نہیں
اس قدر دُور رام پور نہیں

کلکتے واپس چلی گئی تو داغ کا جدائی میں بُرا حال ہوا اور ان کے اپنے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حال ایک روایتی عاشق سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس بیان میں انھوں نے خالص شاعری کی ہے یہاں تک کہ ان کے گھر میں اگر کوئی مہمان بھی آیا تو انھوں نے اسے حجاب کا پیامبر ہی سمجھا۔ سنیئے :

کوئی مہماں جو میرے گھر آیا
مَیں نے جانا پیامبر آیا
لیں بلائیں ہزار ہا میں نے
دیں دعائیں ہزار ہا میں نے
اس کو باتوں میں کھوتا تھا مَیں
خط کا مضموں ٹٹولتا تھا مَیں
کبھی پیتا تھا پاؤں دھو دھو کر
کبھی ہنستا تھا خوب رو رو کر
کبھی قدموں پہ اس کے گرتا تھا
کبھی مَیں گِرد اس کے پھرتا تھا

لیکن اس تمام اضطراب کے باوجود حقائق پسندی نے داغ کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اپنے محبوب کا ہرجائی پن ان کی نظر میں رہا :

خبرِ یار پوچھتا تھا مَیں
حالِ اغیار پوچھتا تھا مَیں
رنگ کیا ہے اُمیدواروں کا
ڈھنگ کیا ہے صلاح کاروں کا
کون سے شخص پر عنایت ہے
کس سے دن رات گرمِ محبت ہے
سنتے ہیں داستانِ غم کہ نہیں
یاد آتے ہیں اُن کو ہم کہ نہیں

کس سے ہر وقت ہم کلامی ہے
کون سرکار کا سلامی ہے

داغ تجرّد ہی تو تھے ہی، جب ان سے ہجر برداشت نہ ہو سکا تو حجاب کو دوبارہ رام پور بلانے کی سوجھی اور اس کو بے نظیر کے میلے کا واسطہ دیا:

کچھ رہو رام پور میں آکر
لطف اُٹھاؤ حضور میں آکر
پر یہ ہے شرط آکے میلے میں
پھنس نہ جانا کسی جھمیلے میں

حجاب آئی اور بقول داغ:

جا کے عہدِ شباب کا آنا
تھا دوبارہ حجاب کا آنا
بزم میں شمعِ انجمن آئی
یا بہارِ گلِ چمن آئی
مَیں نے پایا ہے اپنے دلبر کو
آبِ حیواں ملا سکندر کو

معلوم ہوتا ہے کہ حجاب داغ سے ملی ضرور لیکن بے حجاب ہو کر نہیں:

آئے لیکن ہزار ناز کے ساتھ
ملے مجھ سے تو احتراز کے ساتھ
وہم بھی بے قیاس تھا ان کو
پاس والوں کا پاس تھا ان کو

حجاب اس مرتبہ رام پور میں دو مہینے رہی اور معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں اپنی تمام تجربہ کاریوں کے باوجود داغ اس کی برہمیِ مزاج کا باعث بن گئے:

اس شکایت نے یہ قباحت کی
کہ بڑھیں رنجشیں قیامت کی
اپنے حق میں یہ زہر گھول لیا
طعنے دے دے کہ رنج مول لیا
کیا زمانے نے رنگ بدلا ہے
ابتدا کیا تھی انتہا کیا ہے

حجاب کلکتے لوٹ گئی مگر جاتے جاتے اسے داغ کی حالت پر رحم آگیا اور انھیں یہ تسلی دے گئی:

صبر کا پھل ضرور پاؤ گے
اس کی راحت بہت اٹھاؤ گے

کلکتے کو حجاب کی واپسی کے بعد داغ کا اضطراب پھر بڑھا اور ادھر اس ستم پیشہ کو امتحان لینے کی سوجھی۔ اس نے انھیں کلکتے بلوا بھیجا۔ داغ کا اپنا بیان ہے کہ یہ چال اسے رقیبوں نے سکھائی تھی:

ہوئے دس بیس رخنہ گر پیدا
کیے سو فتنے لاکھ شر پیدا
ہے اس کے مشیر وہ انساں
آئے جن کے فریب میں شیطاں
یہ لگایا بلاؤ تو ان کو
تم کبھی آزماؤ تو ان کو
کتنے پانی میں ہیں ذرا دیکھو
وہ نہ آئیں گے تم بلا دیکھو
تم نے دیکھا ہے کیا زمانے کا
داغ ہے جا لیا زمانے کا
یہ ہے کیا بات سوچیے اس کو
منہ لگایا ہے آپ نے کس کو

یہ لگائی بجھائی کام آگئی اور داغ کے نام بلاوا آگیا:

یاد ہے قول اس زمانے کا
تم نے وعدہ کیا تھا آنے کا
کس سے مل کر خوشی میں بھول گئے
تم یکایک جو ہم کو بھول گئے
لوگ کہتے ہیں وہ تڑپتے ہیں
ایسے ہوتے ہیں جو تڑپتے ہیں
چین سے اپنے گھر میں رہتے ہو
بزم والا گھر میں رہتے ہو

بگڑ ہی الفت نباہتے ہو اگر
جان کی خیر چاہتے ہو اگر
اُٹھ کے سیدھے اِدھر چلے آؤ
کوئی روکے مگر چلے آؤ
ریل میں اتنی دُور آنا کیا
کارِ سرکار کا بہانا کیا
ہم بلائیں نہ آئیں آپ چہ خوش
اور اس پر رہے ملاپ چہ خوش
دلبروں سے دغا نہیں کرتے
ایسا اہلِ وفا نہیں کرتے

یہ خط ملا تو داغ کشمکش میں پڑ گئے۔ ایک طرف عشق تھا اور دوسری طرف ملازمت۔ داغ کی یہ ادا قابلِ داد ہے کہ انھوں نے اپنی اس کشمکش کو چھپایا نہیں:

نامۂ دل نواز جب آیا
مَیں نے سوچا یہ کیا غضب آیا
دل تو کہتا تھا سر کے بل چلیے
جس طرح ہو سکے نکل چلیے

لیکن:

کارِ سرکار نے جو آ گھیرا
قدم اُٹھ اُٹھ کے رہ گیا میرا

بہر حال آخر کار:

شوقِ بے اختیار لے ہی گیا
یہ دلِ بے قرار لے ہی گیا
آئی ایسی ہوائے کلکتہ
دل پکارا کہ ہائے کلکتہ

داغ رخصت لے کے کلکتے پہنچ ہی گئے اور اس شان سے کہ:

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا!

قیامِ کلکتہ کا زمانہ داغ نے بڑے مزے میں کاٹا:

بخت بیدار و یار ہے دم ساز
اے شبِ وصل تیری عمر دراز
صبح سے شام تک جمال کے لطف
شام سے صبح تک وصال کے لطف
عیش سا عیش تھا نصیبوں میں
کھلبلی پڑ گئی رقیبوں میں

لیکن آخر کار رخصت کا زمانہ ختم ہوگیا اور دربار رام پور سے ان کی طلبی کا حکم آگیا :

جلد حاضر ہو یہ پیام آیا
اور سر پر مہِ صیام آیا

داغ عشق میں لاکھ مضطرب سہی لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ :

کب میسر ہو روزگار ایسا
اور آقائے نامدار ایسا

داغ رام پور لوٹ آئے اور مثنوی " فریادِ داغ " اس دعا پر ختم ہوتی ہے :

یا الٰہی نجات غم سے ملے
وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

یہ دونوں دعائیں مستجاب ہوئیں - ۲۲ جنوری ۱۹۰۲ء کو جب داغ کی عمر ۷۲ برس کی تھی اور حیدرآباد میں ان کے عروج کا زمانہ تھا منی بائی حجاب ان کے پاس پہنچ گئی اور نکاح کا وعدہ لے کر - لوگوں نے جب ازراہِ تمسخر مرزا سے پوچھا کہ اس عمر میں جب ان کے منہ میں بتیسی لگی ہوئی ہے اور ڈاڑھی کے بال خضاب اور مہندی سے سیاہ و سُرخ کیے جاتے ہیں وہ آخر کس برتے پر حجاب سے نکاح کرنے پر مائل ہیں، تو مرزا نے فرمایا کہ نکاح کرکے میں عام اصطلاح میں حجاب کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گا بلکہ رفیق بناؤں گا - اس عمر میں مجھے بیوی سے زیادہ ایک ہمدرد کی ضرورت ہے - لیکن حجاب صرف رفیق بننے پر قناعت نہیں کر سکتی تھی، وہ ان پر حکومت بھی کرنا چاہتی تھی - اور معلوم ہوتا ہے کہ روپے پیسے کے معاملے میں بھی اس کے مطالبے کچھ ایسے تھے جنھیں پورا کرنے کے لیے داغ تیار نہیں تھے - داغ اسے صرف سو روپیہ ماہوار دیتے تھے، حجاب اسے ناکافی سمجھتی تھی اور بسا اوقات دوسروں سے قرض بھی لے لیتی تھی جس کا بار بالآخر داغ پر پڑتا تھا - آخر داغ نے اسے لکھ دیا :-

"اِس سے زیادہ کی مجھ سے اُمید نہ رکھو، مکان کا کرایہ میرے ذمے، تمہارے ملبوس اور دوسرے متعلقات میرے ذمے، تو پھر سو روپے تمہارے لیے کیوں کافی نہیں ہیں۔ اِدھر اُدھر سے قرض لینا اچھا نہیں، خود ذلیل اور میں مطعون ہوتا ہوں۔ اُن لوگوں سے جو تمہارے سر ہیں کہو کہ وہ خود اپنے کفیل ہوں، دوسرے پر بار بننا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔"

اس طرح یہ والہانہ عشق خالص مادی وجوہ پر ختم ہوگیا اور حجاب پھر کھلتے لوٹ گئی۔ اس موقع پر داغ کا یہ مطلع بے ساختہ یاد آجاتا ہے:

جو سر میں زلف کا سودا تھا سب نکال دیا
بلا ہوں میں بھی کہ آئی بلا کو ٹال دیا

——— اگست ۱۹۶۱ء

(۸)

مولینا آزاد

کی

فی البدیہہ گوئی اور حاضر دماغی

مسٹر آئی۔ پی۔ سنگھ جو کسی زمانے میں پارلیمنٹری مباحثوں کے ایڈیٹر تھے اپنے ایک مضمون میں جو انھوں نے "چند یادداشتیں" کے عنوان سے لکھا ہے، رقمطراز ہیں!

"مباحثوں کے ایڈیٹر کا ایک فرض یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی وزیر یا ممبر اپنی تقریر میں کوئی تبدیلی کرے تو وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ اس تبدیلی کو قبول کیا جانا چاہیے یا نہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ وزیروں اور ممبروں کو ان کی تقریر کی سائیکلوسٹائل کاپی بھیج دی جاتی تھی اور ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے ایڈیٹر کو واپس بھیج دیں گے۔ یہ ضروری تھا کہ جو تبدیلیاں کی جائیں وہ لفظی نوعیت کی ہوں اور ان سے نفسِ مضمون میں کوئی اہم فرق نہ پڑتا ہو۔ اس کے باوجود کچھ ممبروں بلکہ کچھ وزیروں کے لیے بھی یہ مشکل تھا کہ وہ اس ترغیب پر قابو پا سکیں کہ تقریر میں سے کوئی ایسا فقرہ یا پارہ حذف کر دیا جائے جس کے متعلق بعد میں انھوں نے یہ محسوس کیا ہو کہ یہ فضول یا غیر ضروری ہے۔ اسی طرح بعض اوقات وہ اس میں کچھ ایسے فقرے بھی بڑھا دیتے تھے جو موقع پر انھیں نہ سوجھے ہوں۔ اس قسم کی ترمیمات چونکہ ناجائز ہوتی ہیں اس لیے انھیں مسترد کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی بات ہے جس کی وجہ سے ایڈیٹر متعلقہ وزیر یا ممبر کی نظر میں معتوب بن سکتا ہے۔

بہر حال جب تک وہ اپنے فرائض کو جائز اور منصفانہ طور پر انجام دیتا ہے۔ اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اسپیکر پر بھروسہ کر سکتا ہے کہ وہ اس کی امداد اور حفاظت کرے گا۔ اسپیکر ماؤلنکر اس قسم کی حمایت سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے اور ایگزیکیٹو اتھارٹی کے مقابلے میں اپنے ماتحتوں سے سرپرستی کا ہاتھ کبھی نہیں اٹھاتے تھے۔

عظیم ترین آدمیوں میں بھی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ ایک درجن کے قریب وزیر اور تقریباً اتنے ہی لوک سبھا کے ممبر ایسے تھے جو اپنی اس خواہش پر قابو پانے میں ناکام تھے کہ جو کچھ انھوں نے گزشتہ روز جلدی میں کہہ دیا تھا، لمحاتِ فرصت میں اس کی اصلاح کریں اور اپنی تقریر کو جلا دیں۔ اس معاملے میں جو وزیر ضابطے کی مسلسل اور بر ملا خلاف ورزی کرتا تھا وہ مرحوم مولانا آزاد تھے۔ ایڈیٹر کو ان کی اصلاح شدہ تقریر کے چوبیس گھنٹے نہیں بلکہ بسا اوقات پورے چوبیس دن انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پھر جیسے یہ تاخیر بھی بجائے خود کافی نہیں تھی اصلاح شدہ تقریر کی شکل میں جو چیز وصول ہوتی وہ سرکاری رپورٹروں کا ٹائپ کردہ تقریر کا اصل متن نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی جگہ مولینا کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مقالہ ہوتا تھا جسے مولینا اپنے سست اور پُر مشقت انداز میں غالباً ایک صفحہ یومیہ کے حساب سے مکمل کرتے تھے۔

کافی مدت تک مولینا من مانی کرتے رہے۔ عملے کے عام لوگ ان سے اتنے ڈرتے تھے کہ کسی کو ان کے اس ناواجب رویے پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ایک بار جب میں ان کی بجٹ پر کی گئی ایک تقریر کو دیکھ رہا تھا جس میں انھوں نے حسبِ معمول شدید تبدیلیاں کی تھیں تو میں اس سے باز نہ رہ سکا کہ اسے اسپیکر ماؤلنکر کے نوٹس میں لاؤں۔ اسپیکر ماؤلنکر بہت برافروختہ ہوئے۔ "یہ شرمناک ہے" وہ پکارے "اگر ہم رپورٹروں کی لکھی ہوئی تقریر کے بجائے اس اصلاح شدہ تقریر کو قبول کر لیتے ہیں تو یہ رپورٹروں کی صلاحیت کا رپر ایک دھبا ہے۔ وہ قابل اور تجربہ کار آدمی ہیں جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو کچھ ہاؤس میں کہا جاتا ہے وہ اس کی جوں کی توں رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ ان کی رپورٹ اس حد تک غلط نہیں ہو سکتی"۔ چنانچہ اصلاح شدہ تقریر کو مسترد کر دیا گیا اور تقریر کا سرکاری متن ہی مستند ٹھہرا۔"

مولینا کے عقیدتمند ان سے جو صفات منسوب کرتے رہے ہیں ان میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ فی البدیہہ تقریر اور تحریر میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کی حاضر دماغی بھی اسی طرح غیر معمولی تعریف و توصیف کی مستحق قرار دی جاتی رہی ہے لیکن مسٹر آئی۔ بی۔ سنگھ کے بیان کے مندرجۂ بالا اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی دیگر صفات کی طرح ان کی فی البدیہہ تقریر و تحریر کی صلاحیتیں بھی حقیقی کم تھیں اور قیاسی زیادہ۔

(۹)

ڈاکٹر تاثیر: ـــــ چند یادیں

لاہور پہنچنے کے چند ہی دن بعد ایک شام حفیظ نے کہا: "آؤ تمھیں تاثیر سے ملائیں"۔ حفیظ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے، لیکن انارکلی میں مرکزِ تالیف و اشاعت کے نام سے انھوں نے ایک دفتر قائم کر رکھا تھا۔ میرا قیام بھی انارکلی میں تھا اور تقریباً ہر روز ہی ان سے ملنے میں ان کے دفتر پہنچ جاتا تھا۔

تاثیر کا گھر شہر کے دوسرے سرے پر تھا۔ گھومتے پھرتے وہاں پہنچے تو لگ بھگ رات ہو چکی تھی۔ تاثیر گھر پر ہی تھے اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور کچھ دوسرے حضرات بھی وہاں موجود تھے۔ میں شہر میں نو وارد تھا۔ عمر بھی زیادہ نہیں اور ادب کی دُنیا میں بالکل گمنام۔ تاثیر اسلامیہ کالج کے سنیئر پروفیسر تھے اور ادب کی دُنیا میں ان کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ان کا نام احترام سے لیا جاتا تھا بلکہ صحیح معنی میں ان کی ہیبت طاری تھی۔ پھر بھی جب حفیظ نے ان سے میرا تعارف کرایا تو وہ مجھ سے اس طرح نہیں ملے، جیسے کوئی بڑا کسی چھوٹے سے ملتا ہے۔ چھوٹتے ہی بولے کچھ شعر سناؤ۔ شعر سنائے تو صرف یہی نہیں کہ انھوں نے اور دیگر شرکائے مجلس نے کھل کر داد دی بلکہ کچھ ایسا برتاؤ کیا کہ میں واقعی خود کو ان کا ہم نشیں اور ہم صحبت محسوس کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد تاثیر نے حفیظ سے کہا: "اب آپ لوگ کھانا کھا کر ہی جائیے"۔ کھانے کے دوران میں میں نے

ایک مرتبہ اپنا ہاتھ ترکاری کی طرف بڑھایا تو گوشت کی پلیٹ میری طرف بڑھا کر تاثیر بولے : "ارے یہ تو گھر پر بھی مل جائے گی، یہ کھاؤ"

اس کے بعد حفیظ کے دفتر میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ جہاں وہ ہفتے میں دو تین بار ضرور نکل آتے تھے۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، پنڈت ہری چند اختر اور کچھ دوسرے حضرات بھی وہاں ہوتے تھے اس لیے اچھا خاصا ادبی محفل کا سماں بندھ جاتا تھا۔ یہ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ جہاں باقی لوگ ان کی برتری کا اعتراف کرتے تھے۔ وہاں ان کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ اپنی برتری کے احساس کو زائل کر دیں۔ بے تکلفی ان کے مزاج کا خاصہ تھی اور رکھ رکھاؤ کا روگ پالنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

بے تکلفی سے وہ اسلامیہ کالج میں اپنے شاگردوں سے بھی پیش آتے تھے۔ لیکن طلبا کو صرف یہی نہیں کہ ہمیشہ ان کا اطاعت شعار دیکھا بلکہ ایسا لگتا تھا کہ اساتذہ میں سب سے زیادہ متاثر اور مرعوب وہ انھیں سے ہیں۔

ادب کی اقلیم میں ان کا واقعی سکہ چلتا تھا۔ ادب ہی نہیں بلکہ فنونِ لطیفہ کے کسی شعبے میں بھی ایسی کوئی شہرت اُن دنوں قائم نہیں ہوئی جس میں ان کا ہاتھ نہ رہا۔ ڈاکٹر اقبال کو شہرتِ دوام ملی، لیکن جن لوگوں نے ان کے جوہر کو سب سے پہلے پہچانا اور ان کی عظمت کی تبلیغ کی، ان میں سر عبدالقادر کے بعد تاثیر ہی کا نام آتا ہے۔ عبدالرحمٰن چغتائی کو ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے بلند مقام تک پہنچانے میں بھی تاثیر کا بڑا ہاتھ تھا۔

تاثیر جتنے اچھے دوست تھے اتنے ہی خطرناک دشمن بھی تھے۔ اور وار کرتے وقت یہ تک نہیں سوچتے تھے کہ جو شخص ان کی زد میں ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ لوہاری دروازے کے چوک میں ایک معمر شاعر رہتے تھے غالباً اظہر تخلص کرتے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ حکیم لکھتے تھے اور اپنے کمرے کے آگے "شاعری سکھانے کا کالج" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ شامتِ اعمال نے جو گھیرا تو کسی بات پر تاثیر سے بگاڑ پیدا کر لیا۔ تاثیر کہاں بخشنے والے تھے۔ "پارس" میں ایک غزل اشاعت کے لیے بھیج دی۔ اور اُس پر یہ نوٹ لکھ دیا کہ یہ غزل صنعتِ توشیح میں کہی گئی ہے۔ "پارس" کے مدیر لالہ کرم چند کی بلا جانے کہ صنعتِ توشیح کیا ہوتی ہے۔ انھوں نے غزل اسی نوٹ کے ساتھ شایع کر دی۔ حکیم صاحب نے غزل دیکھی تو بھنا کر رہ گئے۔ صنعتِ توشیح کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہر مصرعۂ اول کا پہلا حرف لیا جائے اور پھر ان حروف کو ملا لیا جائے تو بامعنی عبارت بن جاتی ہے۔ اس صنعت کے پردے میں تاثیر نے حکیم صاحب کا نام لے کر انھیں ایک فحش گالی دے ڈالی تھی۔

حکیم صاحب تو خیر شکار مردہ تھے۔ تاثیر کی چوٹ کی تاب لانا تو مولانا تاجور کے لیے بھی مشکل ہو جاتا تھا، جن کے پاس علم بھی تھا اور جوڑ توڑ میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ حلقۂ نیاز مندانِ لاہور جس کی یوپی اور دلی کے ادیبوں سے اکثر ٹھنی رہتی تھی۔ اس کے سرگرم ترین رکن محمد دین تاثیر ہی تھے۔ دلی اور یوپی والوں کو پنجابی ادیبوں کے لہجے پر ہی اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ وہ ان کی تحریروں میں زبان و بیان کی غلطیاں بھی ڈھونڈتے رہتے تھے۔ تاثیر بحث کا دروازہ وا رکھنے کے لیے اپنے کلام میں یوپی اور دلی کے محاورے سے عموماً انحراف کر جاتے۔ مثلاً جب انھوں نے یہ مصرعہ کہا:

تو نے اُلفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لیے

ہمیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ دلّی والے "کرنی اور" تونے" کے استعمال پر بدکیں گے ۔ دلّی والوں کو بدکنا تھا اور بدکے
لیکن تاثیر نے اپنی تائید میں استدلال کی ایک ایسی عمارت کھڑی کر دی جو دلّی والوں کے لیے ناقابلِ نفوذ قلعہ ثابت ہوا۔ شاید
یہ میرا کم عمری کا تاثر ہو لیکن میں اُن دنوں یہی سمجھتا تھا کہ تاثیر اپنے علم کے زور سے جو چاہیں ثابت کر سکتے ہیں ۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود شعر و ادب کے کسی شعبے میں کوئی پائدار کارنامہ انھوں نے سرانجام نہیں دیا ۔ ان کے کلام کی مقدار بہت کم ہے اور نثر میں بھی انھوں نے اپنی کوئی مستقل یادگار نہیں چھوڑی ۔ ان کے اکثر احباب اس بنا پر ان کے شاکی رہتے تھے ۔ بعض اسے ان کی خوئے بے نیازی اور قلندرانہ روش پر محمول کرتے تھے اور بعض یہ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس علم تو ہے لیکن جذبے کی کمی ہے ۔ حفیظ تو اکثر کہہ دیتے تھے کہ یہ شخص بزورِ علم شعر کہتا ہے ۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ۔ ان کے پاس علم بھی تھا اور وہ تنقیدی بصیرت بھی رکھتے تھے ۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ بہت بڑا شاعر بننا ان کے بس میں نہیں اور ان کے علم اور ان کی حیثیت کا آدمی دوم درجے کا شاعر کیوں بنے ۔ پطرس کا خیال بھی کچھ ایسا ہی تھا ۔ بقول ن ۔ م ۔ راشد ان سے ان کی کوتاہ قلمی کا شکوہ کیا گیا تو انھوں نے کہا : "کسی بانجھ عورت سے یہ کہنا کہ اس کے بچہ کیوں نہیں ہوتا ، اس کے زخموں پر نمک چھڑکنا ہے ؟"

تاثیر نظریات کا روگ پالنے والے بھی نہیں تھے ۔ یہ صحیح ہے کہ لندن سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا جو منشور شایع ہوا ان پر ان کے بھی دستخط تھے ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حلقۂ نیازمندانِ لاہور کے اکثر اراکین انہی کی وجہ سے جو نیت امام کی وہی ہماری کہہ کر ترقی پسند صفوں میں شامل ہوئے ۔ لیکن خود تاثیر نے منشور پر دستخط کرنے کے بعد اس تحریک کو بھلا دیا ۔ پاکستان کی حمایت یا مخالفت میں بھی انھوں نے کسی جوش کا مظاہرہ نہیں کیا ۔ البتہ تقسیم کے بعد فوراً کی ان کی ایک غزل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم سے پنجاب کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو جو نقصان پہنچا اس سے انھیں واقعی تکلیف پہنچی ۔ اس غزل کا ایک شعر ہے :

دُنیائے چشم و گوش تو برباد ہو گئی
اب کچھ بغیر معرکۂ خیر و شر نہیں

شعر کسی تاویل و تشریح کا محتاج نہیں ۔ اس کے پیچھے جو کرب ہے اس کا اندازہ انہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے اس جنتِ چشم و گوش کو یعنی تقسیم سے پہلے کے لاہور کو دیکھا ہے ۔ جس شخص کی انسان دوستی کا یہ عالم ہو کہ وہ انسانی مراسم کے مقابلے میں خیر و شر کو اتنا حقیر سمجھتا ہو اس میں مبلّغ یا مجاہد بننے کی صلاحیت کہاں آ سکتی ہے ؟

تاثیر استادی شاگردی کے قائل نہیں تھے ۔ لیکن ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنھوں نے اُن سے ادب میں رہنمائی حاصل کی اور زندگی کا سلیقہ سیکھا ۔ ان میں میں اپنا شمار بھی کرتا ہوں ۔ انھیں آنکھوں سے اوجھل ہوئے مدتیں ہو گئیں لیکن اب بھی بارہا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا چہرہ ، ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ اور آنکھوں میں متانت کی غیر معمولی چمک لیے سامنے ہے اور وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں : "مثلِ ابر زندگی یوں بسر کرتے ہیں ۔"

(۱۰)

مولانا صلاح الدّین — چند یادیں

نیلا گنبد لاہور میں ایک مختصر سی چائے کی دوکان تھی، عرب ہوٹل کے بعد ادیبوں کا یہ دوسرا اڈہ تھا۔ مولانا صلاح الدین، عاشق بٹالوی اور باری علیگ کے ساتھ یہاں تقریباً ہر شام نشست رہتی تھی۔

محفل میں سنجیدہ گفتگو بالعموم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لیے دوسری جگہیں تھیں اور جب اس دکان پر ادب کی بجائے سیاست موضوعِ گفتگو بننے لگی تو غیر سنجیدگی کا رجحان اور بھی غالب آگیا۔ دوکان کے مالک کانگرسی مسلمان تھے اور شروع شروع میں یہاں آنے والوں میں زیادہ کانگرسی مسلمان ہی تھے لیکن پھر مسلم لیگی بھی آنے لگے اور ہر روز مناظرے ہونے لگے۔

باری علیگ اُن دنوں سیاست سے خاص طور پر برگشتہ تھے۔ مذہب اور سیاست کا باہمی تعلق ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور کانگرس کے موقف سے بھی انھیں کوئی خاص لگاؤ نہ رہا تھا۔ اس لیے یہ سارے مناظرے انھیں غیر حقیقی سے لگتے تھے۔ لیکن تھے ستم ظریف، اس لیے نوک جھونک سے صرف لطف ہی نہیں لیتے تھے بلکہ اس میں باقاعدہ شریک بھی ہوتے تھے۔ لیکن ان کی شرکت بجائے خود ایک بہت بڑی ستم ظریفی تھی۔ داخل ہوتے

ہی آواز لگاتے :

"کون جیت رہا ہے ؟"

اور پھر جیتنے والے فریق کی بجائے ہارنے والے فریق کے معاون بن جاتے۔

مولانا صلاح الدین صرف خاموش تماشائی تھے۔ اور انھیں کسی سیاسی بحث میں شریک ہوتے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ جب ملک تقسیم ہو گیا، لاہور جلنے لگا اور مسلمانوں کے لٹے ہوئے قافلے پہنچنے لگے تو بھی انھیں کچھ زیادہ متاثر نہیں دیکھا۔ انھیں صرف یہ تشویش تھی کہ "اُردو کا کیا بنے گا ؟"

شروع شروع میں ان کا خیال تھا کہ تقسیم سے اُردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا لیکن پھر انھوں نے محسوس کیا کہ ملک کی تقسیم میں اُردو کی فلاح کے لیے ایک اشارۂ غیبی ہے۔ جب اہلِ زبان پنجاب پہنچیں گے تو پنجاب میں اُردو کو بڑا فروغ حاصل ہو گا۔

اس قسم کی باتیں سن کر شروع شروع میں ان پر شقاوتِ قلبی کا گمان گزرتا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب سارا ملک مقتل بنا ہوا تھا کوئی شخص انسانی مصائب سے آنا بے پروا ہو جائے کہ اسے اُردو کے مستقبل کے علاوہ اور کچھ سوجھے ہی نہیں، واقعی برہم کر دینے والی بات تھی۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ مولانا کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور غم یا غصے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

ہندوؤں کو لاہور سے بھاگتے دیکھ کر بھی انھوں نے صرف اسی قدر کہا : "ہتل صاحب یہ لوگ آخر کیوں بھاگ رہے ہیں ؟"

اس مرتبہ مجھے اور بھی عجیب سا لگا لیکن اسی شام مجھے باری علیگ کی زبانی ایک ایسی بات معلوم ہوئی کہ میں حیرت میں ڈوب گیا۔

مولانا کا اپنا مکان لاہور کے ایک ہندو علاقے میں تھا اور جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مکانوں کو آگ لگا رہے تھے تو ان کا مکان بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

جب مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مصائب سے بے پروا صرف اُردو کے مستقبل کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا کرتے تھے تو وہ صرف دوسروں کے مصائب سے بے نیاز نہیں تھے بلکہ خود اپنے مصائب سے بھی بے نیاز تھے۔

انھوں نے اُردو کے غم کو اتنا اپنا لیا تھا کہ باقی تمام غموں سے بے نیاز ہو گئے تھے۔

ان کی برہمی دیکھنے کا اتفاق صرف ایک بار ہوا۔ فسادات کے زمانے میں بھی میرے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ نیلا گنبد کی اسی دکان پر چائے پیتا رہا اور مسلمانوں کے ریستورانوں میں کھانا کھاتا رہا۔ شبانہ آوارہ گردی کا سلسلہ بھی جوں کا توں جاری تھا۔ ایک رات تقریباً ایک بجے مال روڈ کے کسی ریستوران سے نکل کر گھر کی طرف جا رہا تھا اور نشے میں بری طرح دھت تھا۔ نیلا گنبد کے قریب پہنچا تو سامنے سے باری علیگ اور مولانا صلاح الدین آتے

دکھائی دیے۔ قریب آیا تو مولانا نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا جو کچھ جی میں آیا کہہ ڈالا، صرف پٹائی نہیں کی۔ اس کے بعد مولانا اور باری علیگ مجھے گھر چھوڑ گئے۔

دوسرے دن ملاقات ہوئی تو بھی مولانا برہم تھے اور جب تک میں نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ اب رات کے وقت گھر سے باہر نہیں نکلا کروں گا ان کے چہرے پر مسکراہٹ واپس نہیں آئی۔

مجھے ان سے ذاتی کام کبھی نہیں پڑا لیکن تقریباً سبھی دوست اس سے متفق تھے کہ آدمی انھیں اپنا کام سونپ کر خود بے نیاز ہو سکتا تھا۔

آخری ملاقات ان سے ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے لاہور گیا تھا۔ ان سے ملاقات کرنے کے لیے ادبی دُنیا کے دفتر میں گیا۔ دفتر میں بے سروسامانی کا دور دورہ تھا لیکن مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ بدستور کھیل رہی تھی۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں اُردو کے ناشر اور ادیب خوش حال ہو گئے تھے لیکن مولانا کی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا اور ادبی دُنیا بھی غالباً اس زمانے میں نہیں نکل رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن دونوں کو احساس تھا کہ ملاقات تشنہ ہے۔ آخر طے پایا کہ اسی شام نیلا گنبد کی اسی پُرانی چائے کی دوکان پر چائے نوشی کی جائے۔

اپنی اس کوتاہی پر میں ہمیشہ نادم رہوں گا کہ میں اس وعدے کو ایفا نہ کر سکا۔ دراصل میں حماقت کی حد تک اُمید پرست ہوں۔ خیال تھا کہ لاہور کتنی دُور ہے چند ہی ماہ بعد پھر آجاؤں گا، لیکن اس کے بعد لاہور جانا نصیب نہیں ہوا۔

اب جب ان کی موت کی خبر آئی ہے تو اپنی کوتاہی کا احساس اور بھی شدید ہو گیا ہے۔

مولانا صلاح الدین بڑی بنی تلی شخصیت کے مالک تھے اور اپنے اسلوب نگارش اور ادبی نظریوں میں کافی قدامت پسند تھے۔ لیکن ان کے قلب میں بلا کی وسعت تھی۔ اُردو کے بیشتر نئے لکھنے والوں کو انہی نے اپنے رسالے کے ذریعے متعارف کرایا اور مرحوم میراجی سے ان کا خوب نباہ ہوتا رہا۔ اب ادبی دُنیا کے نئے دور میں وزیر آغا ان کے رفیق کار تھے اور اُردو ادب کو شاعری کے جدید ترین رجحانات سے آشنا کرانے کا فریضہ بھی ادبی دُنیا ہی انجام دے رہا تھا۔

مولانا انجمن ساز نہیں تھے لیکن اپنی ذات سے وہ خود ایک انجمن تھے اور پورا لاہور ان کی شخصیت سے بھرا بھرا نظر آتا تھا۔

——— اگست ۱۹۶۴ء

(۱۱)

حضرتِ جگرؔ

جگرؔ صاحب بہ یک وقت اُردو کے محبوب ترین اور محترم ترین شاعر تھے اور ان کی یہ حیثیت ان کے زمانۂ زندگی میں بھی قائم رہی اور زمانۂ متانت میں بھی۔ ان کے زمانۂ زندگی میں اصغرؔ گونڈوی، رشید احمد صدیقی اور دوسرے عمائدینِ ادب نے ان کے تمام تر لاابالی پن کے باوجود اُن سے بے انتہا محبت کی اور ان کے دورِ متانت میں بھی جملہ زعمائے بزمِ ادب نے ان کا پورا احترام کیا۔

اس پذیرائی کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ یہ جگرؔ صاحب کی تمام تر خوئے بے نیازی کے باوجود ہوئی۔ موجودہ دور میں تقریباً سبھی شاعروں نے اپنا پروپیگنڈہ کیا اور اس پروپیگنڈے میں اپنے محاسنِ شعری سے کہیں زیادہ غیر ادبی عوامل کا سہارا لیا۔ کسی نے مذہب کے نام پر دوکان چمکانے کی کوشش کی اور کسی نے سیاست کے نام پر۔ جگرؔ اس دور کے غالباً واحد بڑے شاعر تھے جنھوں نے تکمیلِ فن کو ہی مقصدِ زندگی سمجھا۔

مشاہیر کی وسعتِ قلب کا ذکر کرتے وقت یہ اکثر لکھا جاتا ہے کہ وہ چھوٹوں بڑوں کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں لیکن جگرؔ صاحب کا وصف یہ تھا کہ وہ اپنے سے چھوٹوں کا بڑوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ احترام کرتے تھے اور ان کی عزت اس حد تک کرتے تھے کہ بسا اوقات اس سلسلے میں اپنے منصب تک کو بھول جاتے تھے۔

مجھے ماجد حسن فریدی کے بیان کردہ ایک واقعہ یاد آتا ہے۔

غالباً سن چھیالیس کا ذکر ہے، کرائسٹ چرچ کالج (کانپور) میں مشاعرہ ہوا۔ بھاری بھرکم اور چھوٹے موٹے ہر قسم کے شعراء آئے، جگر صاحب بھی تھے، کوئی بات منتظمین کی انھیں ناگوار گزری اور انھوں نے مشاعرے میں غزل سنانے سے انکار کر دیا۔ تمام مشاعرے نے اصرار کیا لیکن انھیں نہ غزل پڑھنا تھی نہ پڑھی۔ دوسرے دن حسرت موہانی سے ملاقات کرنے گئے، وہاں اوروں نے غزل پڑھی لیکن انھوں نے وہاں بھی نہ سنائی۔ شام کو وہ ایک معمولی دوکان دار حاجی سے ملنے گئے۔ تھوڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ حاجی نے کہا: "یار بہت دنوں سے کچھ سنا نہیں، آج تو سنا دو۔" اور انھوں نے ایک منٹ توقف کے بعد جھوم جھوم کر غزل سنانی شروع کر دی۔ اور ایک ——— اور دو ——— اور تین عدد غزلیں حاجی کی نذر کر دیں۔ حاجی بھی جھوم جھوم کر داد دیتا رہا۔ (تحریک، جنوری ۱۹۵۸ء)

مروت ان کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ ۱۹۵۸ء میں ساہتیہ اکاڈمی کے انعام کے سلسلے میں وہ دہلی تشریف لائے تو ان کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی۔ دلّی میں خادمانِ اُردو کو اس صورت حال کا پورا پورا احساس تھا لیکن اس کے باوجود یہ چاہتے تھے کہ اس موقع پر ان کی خدمت میں پبلک طور پر سپاس نامہ پیش کیا جائے۔ طے یہ پایا کہ ان کے اعزاز میں ایک دعوت دی جائے جس میں نہ ان سے شعر سنانے کا مطالبہ کیا جائے اور نہ تقریر کا۔ وہ صرف چند منٹ کے لیے جلسے میں آ کر بیٹھ جائیں۔ میں اور حمیدہ سلطان یہ گزارش لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر ہماری تجویز قبول فرمالی اور یہاں تک کہا کہ میں چند منٹ کے لیے ہی نہیں آؤں گا بلکہ باقاعدہ وہاں بیٹھوں گا۔ شام کو آل احمد سرور پہنچے تو انھوں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور ہمیں مشورہ دیا کہ ہم اس پروگرام سے دست کش ہو جائیں۔ ہم نے ان کا مشورہ مان لیا لیکن جگر صاحب یہی کہتے رہے کہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ہر حال میں آنے کے لیے تیار ہوں۔

اس پروگرام کو مسترد کر دینے سے بھی جگر صاحب کو کوئی آرام نہیں ملا۔ ان کے میزبان کی ہر احتیاط کے باوجود کہ انھیں پورا پورا آرام ملے، ملنے والے جوق در جوق پہنچتے رہے اور جگر صاحب بستر سے اُٹھ اُٹھ کر ان سب کا استقبال کرتے رہے۔ صرف یہی نہیں کئی بار انھوں نے اپنا کلام بھی سنایا جس کا ناگوار اثر ان کی طبیعت پر پڑے بغیر نہ رہا۔

غزل کا صحیح مقام ہوس اور تصوّف کے درمیان ہے اور جگر اسی مقام سے شعر کہتے تھے۔ دوسرے شاعروں کی طرح ان پر بھی معصیت کا دَور آیا لیکن اس دَور میں بھی تمرّد اور الحاد کے بجائے عجز و ندامت کا پہلو موجود تھا۔ مدہوشی کے عالم میں بھی وہ یہی پکارتے رہے کہ:

ٹ کانپور کا ایک مٹھائی والا۔

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
مَیں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

یہی چیز ان کو بچا گئی۔ معصیت کا دور گزر گیا اور ایک عجز رندانہ ان کی فطرت کا مستقل جزو بن گیا۔ پاکبازانہ زندگی اختیار کرنے کے بعد بھی زہد کی خشکی ان کے مزاج میں بار نہ پا سکی۔ انھیں رند پارسا کہنا اس اصطلاح کا موزوں ترین استعمال ہے۔ غزل کے لیے اسی مزاج کی ضرورت ہے۔

ان کا عشق جسم کا مطالبہ نہیں بلکہ رُوح کا تقاضا تھا۔ یہ شعر صرف وہی کہہ سکتے تھے:

گداز عشق نہیں کم جو میں جواں نہ رہا
وہی ہے آگ مگر آگ میں دُھواں نہ رہا

ان کی موت پر متعدد مشاہیر نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے لیکن سب سے زیادہ پتے کی بات ایک نوجوان ادیب خلیل الرحمٰن اعظمی نے کہی ہے:

"آخر وقت تک جگر کی شاعری میں پھیکا پن نہیں آیا۔ ان کی آواز دوسرے شعرا کی طرح عمر ڈھلنے کے بعد پتلی نہیں ہوئی۔ وہ ستر سال کی عمر کو پہنچ کر بھی ہمارے لیے تبرک نہیں بنے۔ جگر اپنی عمر کی کسی منزل میں زمانۂ ماضی کے شاعر نہیں سمجھے گئے۔ ان کی موت کے بعد ایسا لگتا ہے، اُردو زبان نے اپنا ایک جوان بیٹا کھو دیا ہے۔"

——— اکتوبر ۱۹۶۰ء

(۱۲)

مجاز ـــــ دوہرا نشتری

مجاز کی موت کو پانچ سال ہو گئے۔ اس پر یہ مصرعہ پوری طرح صادق آتا ہے:

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

دراصل مجاز ہی نہیں بلکہ اس دور کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں کا یہی حال تھا کہ وہ بزمِ شعر و ادب پر کچھ دیر کے لیے چھائے اور اس کے بعد ان کے ذہنی سوتے خشک ہو گئے۔ یہ حقیقت ناگوار سہی لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ بطور شاعر مجاز اپنی موت سے پہلے مر چکا تھا۔ اس سانحے کی ذمّہ داری ہندوستانی سماج پر ڈالنا حقائق سے گریز ہے کیونکہ اسی سماج میں متعدد شاعروں نے اپنے فن کے تمام امکانات اور تقاضوں کو پورا کیا۔ البتہ اس میں اس مخصوص ماحول کو دخل ضرور ہے جو اس صدی کے تیسرے چوتھے عشرے میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے شعر و ادب کی سرپرستی وہ لوگ کرتے تھے جنھیں ادب سے واقعی کوئی لگاؤ ہوتا تھا۔ لیکن اس دور میں شعر و ادب کی سرپرستی ان لوگوں کے حصّے میں آئی جو ادب کو صرف ایک وسیلہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ پہلا گروہ عشرت پسند نو دولتیوں کا تھا جن کے نزدیک شاعری کا مقصد صرف ان کے نشۂ عشرت کو تیز کرنا تھا۔ ان کی بزم میں شاعر کو جی بھر کر پینے کو شراب ملتی تھی لیکن اس بزمِ عشرت میں شرکت کے بعد شاعر پر کیا گزرتی ہے اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔

شراب اُردو شاعری کا سدا بہار موضوع ہے۔ لیکن شراب سے محض شراب کبھی مُراد نہیں لی گئی۔ یہ شاعر کے باطنی کیف کا ایک سمبل تھی چنانچہ شراب کے متعلق ایسے لوگوں نے بھی بہت عمدہ شعر کہے ہیں جنھوں نے کبھی اس کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا۔ شاعری اور زندگی میں براہ راست تعلق پیدا کرنے کے جنوں کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ شاعروں کے لیے شراب پینا لازمی ہوگیا خواہ ان کی صحت اس کی بالکل اجازت نہ دیتی ہو۔ اس طرح اس جذبۂ فنا کی فوری تکمیل کا سامان پیدا ہوگیا جو تقریباً ہر شاعر کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

دوسری طرف اربابِ سیاست کا ایک مخصوص گروہ تھا جو ادب کو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا ان لوگوں نے شاعروں کے ہاتھوں میں پرچم دے دیا اور ایک انقلاب موہوم کے نشے میں شاعروں کو اتنا سرشار کیا کہ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کو یکسر بھول گئے۔ اس عقیدے نے کہ ان کی قسمت انقلاب کے بعد ہی چمکے گی، ان کے قوائے عمل کو شل کر دیا اور وہ جد و جہد جو زندگی کو زندگی بنانے کے لیے ضروری ہوتی ہے ان کے بس کی نہ رہی۔

مجاز اس اعتبار سے دوہرا نشیری تھا اور یہ دونوں نشے جان لیوا ثابت ہوئے۔

ہندوستانی سماج کو اس کا قاتل قرار دینے والے اس کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مجاز ایک خوش حال اور ذی اثر خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اسے تعلیم حاصل کرنے کے بہترین مواقع حاصل تھے اور تعلیم اس نے حاصل بھی کی۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ وہ خوبصورت بیوی حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس جنس نایاب کا نہ ملنا ہی اس کی دیوانگی کا باعث ہوا۔ عصمت چغتائی تو ہمیں یہاں تک بتاتی ہیں کہ مجاز کے زمانۂ تعلیم میں علی گڑھ کی لڑکیاں اس کے نام کی پرچیاں ڈالا کرتی تھیں کہ وہ ان کی قسمت میں ہے یا نہیں۔ پھر شاعروں کو ان کی پسند کی لڑکیاں فراہم کرنا سماج کا فرض کب سے ٹھہرا؟ کیا ترقی پسند اپنی تمام تر انقلابیت کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ اس معاملے میں بیچاری لڑکی کی پسند کو کوئی دخل نہیں۔ قدیم مصر میں ہر سال حسین ترین لڑکی کو دریائے نیل کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔ کیا ترقی پسند شاعروں نے اب دریائی دیوتاؤں کی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ ان کی بارگاہ میں حسین لڑکیوں کو بھینٹ چڑھانا ضروری ٹھہرے۔

مجاز شراب سے آخری وقت تک نجات حاصل نہ کر سکا لیکن ایسے شواہد موجود ہیں کہ موت سے قبل ترقی پسندی کے نشے سے اسے نجات مل گئی تھی اپنے استرداد کا سنجیدگی سے اظہار اس وقت اس کے بس کی بات نہیں تھا اس لیے یہ صرف لطیفوں اور طنزیہ فقروں میں ظاہر ہوا۔

ایک غالی اشتراکی نقاد جب اسے آنے والے انقلاب کا یقین دلا رہا تھا تو اس نے کہا: "بھئی جب انقلاب آئے گا تو کہاں سے دیکھیں گے ہم" اسی طرح جب اس سے "بڑھے چلو" قسم کی نظمیں لکھنے کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے کہا: "قوم کہیں بڑھتے بڑھتے بولا تو نہیں جائے گی" اور جب اسے "بس" پر نظم لکھنے کو کہا گیا تو اس نے جواب دیا: "بھئی ہم تو کٹ بس پر نظم لکھیں گے"۔

اس قسم کے لطیفے اس شدید ذہنی بیزاری کے مظہر ہیں جو ادب کی منصوبہ بندی کرنے والوں کے خلاف اس میں پیدا ہوگئی تھی۔

مجاز ترقی پسند تحریک میں اس وقت شریک ہوا جب اس کا کوئی واضح مفہوم متعین نہیں ہوا تھا۔ اُن دنوں صرف مجاز ہی نہیں میراجی بھی ترقی پسند سمجھے جاتے تھے جب اس تحریک کے اشتراکی خد و خال نمایاں ہونے لگے تو وہ اس تحریک سے الگ ہوگیا۔ (دسمبر ۱۹۶۰ء)

(۱۳)

غالب اور سوویٹ محقق

ہمارے یہاں تحقیق کا مقصد تلاشِ حق سمجھا جاتا ہے۔ محقق دستیاب شدہ مواد کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیتا ہے اور اس سے جو بھی نتائج مرتب ہوں انھیں خندہ پیشانی سے تسلیم کر لیتا ہے لیکن سوویٹ روس میں تحقیق کا مقصد یہ نہیں بلکہ اس کا مقصد حکام وقت کے حسبِ منشا ایسے مفروضے وضع کرنا ہے جو سوویٹ پروپیگنڈے کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔ ان مفروضوں کا متن اور خارجی حقیقتوں سے کوئی تعلق ہے یا نہیں، یہ بات روسیوں کے نزدیک خارج از بحث ہے۔ ۱۹۳۰ء میں خارکوف کے مقام پر پرولتاری مصنفوں اور آرٹسٹوں کی جو کانفرنس ہوئی اس میں ایک ریزولیوشن کے ذریعہ ادبی کارکنوں کے لیے جو ضابطہ مقرر کیا گیا اس میں واضح طور پر درج تھا کہ "پرولتاری آرٹ کو طبقاتی جنگ کا ہتھیار بننا چاہیے"۔ ظاہر ہے کہ جو ضابطہ باقی آرٹسٹوں کے لیے ہے اسی کا اطلاق محققین پر بھی ہوگا۔

اُردو کے کچھ "ترقی پسند" جریدوں میں اس قسم کی اطلاعیں اکثر شایع ہوتی رہتی ہیں کہ سوویٹ محققوں نے غالب پر بڑا کام کیا ہے۔ ان سطور کا مقصد اس بات پر غور کرنا ہے کہ سوویٹ یونین میں غالب پر جو کام ہوا ہے اسے ادبی تحقیق کا نام کہاں تک دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم اس سوال پر بھی غور کریں گے کہ جو مفروضے

سوویٹ محققوں نے وضع کیے ہیں ان کی پشت پر سیاسی مقاصد کیا ہیں۔

پچھلے دنوں یو۔ایس۔ایس۔آر اکاڈمی آف سائنسز کی انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے ہندی لسانیات کے شعبے کے صدر یوگینی چیلیشیو کا ایک مضمون سوویٹ ایجنسی کی طرف سے نشر کیا گیا تھا جس میں اس کام پر روشنی ڈالی گئی تھی جو غالب پر سوویٹ محققین نے کیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ :

”سوویٹ اسکالر اس امر کی وضاحت کرنے میں مصروف ہیں کہ غالب کے کارناموں میں یاس اور مایوسی کی لہر کیوں ہے؟ سوویٹ اسکالروں کا خیال ہے کہ غالب کے کارناموں میں یہ رجحان قومی رجحان نہیں اور اس کی نشان دہی اس مایوسی میں ممکن ہے جو قومی بغاوت کی ناکامی کا نتیجہ تھی“

تحقیق کا پہلا اصول یہ ہے کہ کسی ادب پارے پر غور کرتے وقت اس مجموعی روایت کو مدِ نظر رکھا جائے جس میں اس ادب پارے کی تخلیق ہوئی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اردو کی غزل کی نشو و نما فارسی غزل کی روایات کے زیر سایہ ہوئی لہٰذا اُردو شاعروں کی جن میں میرزا غالب بھی شامل ہیں، یاس پسندی کا بہت کچھ انحصار اس روایت پر بھی تھا۔ سوویٹ محققوں نے غالباً اس پہلو کو در خورِ اعتنا نہیں سمجھا اور غالب کی یاسیت کا سلسلہ قومی بغاوت کی ناکامی سے پیدا شدہ مایوسی سے جوڑ دیا۔ اس سلسلے میں روسی محقق یہ بھی بھول گئے کہ اس بغاوت پر میرزا کی ایک پوری کتاب موجود ہے۔

مقالہ نگار نے اسی مقالے میں یہ بھی لکھا ہے کہ :

”غالب کی تحریروں میں جو سماجی مقاصد کارفرما ہیں، وہ سوویٹ عوام کو خاص طور پر پسند ہیں۔ برطانوی نو آبادیاتی حکومت کے کٹھن دور میں جب برطانیہ نے ہندوستان میں قومی اور مذہبی کشمکش کو فروغ دینا چاہا تو اس عظیم شاعر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کی قوت اور اس کی آئندہ عظمت کی ضمانت اس کے بیٹوں کی یک جہتی میں ہے . . . غالب نے اپنے ملک کی غلامی سے کبھی مفاہمت نہیں کی۔ شاعر غیر ملکی حکمرانوں کے سامنے کبھی دو زانو نہیں ہوا اس نے ۱۸۵۷-۵۹ء کی عظیم قومی بغاوت کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور باغیوں پر جو تشدد ہوا اس کا ذکر گہری نفرت اور غصے سے کیا“

دیکھنا یہ ہے کہ غالب کی یہ تصویر حقیقت سے کس حد تک قریب ہے اور سوویٹ محققوں نے اگر حقیقت کو مسخ کیا ہے تو ان کے سامنے کیا مقاصد ہیں۔

غالب کا ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے متعلق جو رویہ تھا وہ اس کی کتاب دستنبو میں کھل کر سامنے آگیا۔ غالب

ایک سماج کا فرد تھا اور اس سماج کے ساتھ اس کے ہر قسم کے رشتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب بغاوت کی ناکامی کے بعد اس سماج کے کچھ حصّے کو تکلیف پہنچی ہوگی تو غالب کے دل کو بھی ضرور تکلیف ہوئی ہوگی لیکن اس سے اس کی سیاسی جانبداری کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی مجموعی ہمدردیاں باغیوں کے ساتھ نہیں بلکہ حکومت وقت کے ساتھ تھیں جتنی تکلیف اسے حکمرانوں کے انتقام سے پہنچی اس سے زیادہ تکلیف اس نے اس وقت محسوس کی جب باغی حکمران طبقے کے معصوم بچّوں اور عورتوں کو قتل کر رہے تھے۔ اس نے حکمرانوں کے جوابی تشدّد اور باغیوں کے تشدّد میں امتیاز بھی کیا ہے۔ شہر میں باغیوں کی آمد کا ذکر اس نے اس پیرائے میں کیا ہے:

"... اس منحوس دن، میرٹھ کی کینہ خواہ فوج کے چند بدبخت سرپھرے سپاہی شہر میں در آئے۔ سب کے سب بے شرم اور فسادی اور آقاکشی (کے جذبے) سے انگریزوں کے خون کے پیاسے ..."

باغیوں کے تشدّد کا ذکر اس نے اس طرح کیا ہے ...

"مٹھی بھر خاک بھی نہ تھی جو گل بدنوں کے خون سے سرخ نہ ہوئی ہو اور کسی باغ کا ایک کونا بھی نہ تھا جو بے برگ و باری کے سبب بہاروں کا قبرستان نہ معلوم ہوتا ہو۔ ہائے وہ عاقل و عادل نیک طینت و نیک دل حاکم اور آہ وہ خوبصورت، نازک بدن خواتین جن کے چہرے چاند کی طرح روشن اور جسم کچی چاندی کی طرح دمکتے تھے اور حیف وہ بچّے جنھوں نے ابھی دنیا کو دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے پھولوں کو شرماتے اور جن کی سبک گامی چکور کی چال پر حرف گیری کرتی تھی، کہ یہ سب دفعتہ خون کے بھنور میں جا ڈوبے"

اس نے بغاوت سے عوام کی لاتعلقی پر بھی زور دیا ہے اور غیر مبہم لفظوں میں:

"... سب تیر و تبر کے باہمی فرق کو نہ پہچاننے والے اور اندھیری رات میں چور کی غوغا آرائی سے ڈر جانے والے۔ نہ تلوار ہاتھوں میں نہ تیر کمان میں۔ اگر سچ پوچھیے تو یہ لوگ گلیوں اور محلوں کی آبادی کے لیے ہوتے ہیں۔ نہ اس لیے کہ جنگ و جدل کے ارادے سے کمر کس کر نکل کھڑے ہوں۔ آخر کار اس سبب سے کہ تیز رو سیلاب کے راستے میں خس و خاشاک کا باندھ نہیں باندھا جا سکتا،

کوئی چارہ نہ دیکھ کر ان میں سے ہر ایک اپنے گھر میں ماتم زدہ ہو کر بیٹھ رہا۔ انھیں غم زدوں میں سے ایک میں ہوں۔"

گویا اگر ان عوام میں قوتِ مقاومت ہوتی تو وہ باغیوں کا مقابلہ کرتے۔ اسے اس بات کی بڑی شکایت ہے کہ بغاوت کے نتیجے کے طور پر طبقۂ اراذل سربلند ہو گیا ہے اور اشرافیہ مبتلائے مصیبت:

"... لٹیرے قانون کی گرفت سے اور سود اگر محصول کی پابندی سے آزاد، گھر کے گھر ویران اور غم کدے لوٹ کا دسترخوان گمنامی کے نہاں خانوں میں پڑے ہوئے لوگ، بن سنور کر نکلتے ہیں اور اپنی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پلکوں کی طرح صف بہ صف خنجر تانے ہوئے، اور نیک طینت آشتی پسند لوگ جب چل کر باہر تک آتے ہیں تو قدم قدم پر مغلوبیت سے جھکتے ہیں، چور اچکے، روز روشن میں دلیرانہ سونا چاندی لوٹتے ہیں اور راتوں کو ریشم و کمخواب کے بستر آراستہ کرتے ہیں۔ روشن نسب خاندانوں کو تیل تک میسّر نہیں کہ رات کو گھر میں چراغ روشن کریں۔ تاریک راتوں میں جب پیاس کی شدت بڑھتی ہے تو بجلی کے چمکنے کا انتظار کرتے ہیں تاکہ یہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہے اور پیمانہ کدھر پڑا ہے (خدا کی، اس بے نیازی اور بے پروائی کے قربان جائیے جو بے رتبہ لوگ مٹی بیچنے کے لیے سارا سارا دن زمین کھودتے تھے انھوں نے مٹی میں سونے کی اینٹیں پالیں اور جو ذی رتبہ لوگ، راتوں کو اپنی بزم نائے نوش میں آتش گل سے چراغ کیف و نشاط روشن کرتے تھے تاریک حجروں کے اندر، انھیں ناکامی و ناخوشی کے شعلوں نے پھونک ڈالا۔"

باغیوں کی شکست کے بعد فاتح فوجوں نے جو تشدد کیا غالب نے اس کا ذکر دل سوزی سے کیا ہے۔ لیکن اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جوشِ انتقام میں بھی انھوں نے دامنِ اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا:

"... میں سمجھتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو کوئی سرِ اطاعت خم کرے اس کے قتل سے درگزر دیں، صرف مال و اسباب چھین لیں اور جو کوئی مقابلہ کرے، اس کے مال و متاع کے ساتھ اس کی جان بھی لے لیں۔ مقتولوں نے غالباً سرکشی کی، اسی

وجہ سے ان کے سر تن سے جدا کر دیے گئے۔ شہرت بھی یہی ہے کہ بیشتر (صورتوں میں) اسباب چھین لیے ہیں، جان نہیں لیتے، بہت کم اور وہ بھی دو تین گلیوں میں (ایسا ہوا ہے کہ) پہلے سر اڑایا اور اس کے بعد مال و متاع اٹھا لے گئے۔ بوڑھوں بچوں اور عورتوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔ توسنِ قلم چلتے چلتے جب یہاں پہنچا تو رک گیا مگر میں بانگ لگاتا ہوں کہ قدم آگے بڑھائے۔ خدا ادا سے عدل و انصاف کو سراہے اور زور و ظلم کو برا کہنے والے خدا پرستو! اگر عدل و انصاف کو سراہنے اور زور و ظلم کو برا کہنے میں تمہاری زبان اور تمہارا دل ایک ہے تو ہندوستانیوں کا کردار یاد کرو، جنھوں نے پہلے سے دشمنی کی کسی بنیاد اور عداوت کے کسی سبب کے بغیر اور (باوجود اس کے کہ) ہر شخص جانتا ہے، خداوند کشی گناہ ہے اپنے آقاؤں پر تلوار اٹھائی اور لاچار عورتوں اور ان بچوں کو جو (ابھی) گہواروں میں پلنے کے قابل تھے، خاک و خون میں سلا دیا۔ اب انگلستانیوں کو دیکھو کہ جب دشمنی کا انتقام لینے، لوٹنے کو ٹھے، اور مجرموں کو سزا دینے کے لیے لشکر آرائی کی تو شہریوں سے بھی بدظنی کے سبب محل اس کا تھا کہ غلبہ پانے کے بعد شہر دہلی میں کسی بلی تک کو زندہ نہ چھوڑتے۔ ایسے غصے کی آگ کو جو شعلوں کا جگر پھونک ڈالے، انھوں نے ضبط کیا اور عورتوں اور بچوں کے جسم کا بال تک بیکانہ کیا۔“

غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انگریز صرف گناہ گاروں کو سزاوارِ سرزنش سمجھتے ہیں اور بے گناہوں کے قاتل نہیں۔ جب شہر میں بھگدڑ پڑی تو اس میں شریک نہ ہونے کے اسباب بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

”. . . راقم الحروف کا تن، دل کا ثبات پا کے (استقلال) کو جنبش ہوئی۔ میں کہیں نہیں گیا اور خود سے کہا کہ جب میں گنہگار نہیں تو سرزنش کا سزاوار بھی نہیں۔ نہ انگریز بے گناہوں کے قاتل ہیں، نہ شہر کی آب و ہوا میرے لیے ناسازگار۔“

یہ تاثرات ایک ایسے شخص کے تاثرات نہیں جو بغاوت کا سرگرم حامی ہو بلکہ ایک ایسے شہری کے تاثرات ہیں جس کا واحد مطمحِ نظر ذاتی عافیت ہے۔ اس نے غیر مبہم طور پر لکھا ہے کہ: ”انصاف یہ ہے کہ انگریزی آئین کے سوا کسی اور آئین (کے تحت) امن و آرام کی امید رکھنا کورچشمی کے مترادف ہے۔“

غالب اگر سرگرم باغی نہیں تھا تو ہندو مسلم اتحاد کا شعوری علم بردار بھی نہیں تھا۔ اس وقت کے عام لوگوں کی طرح اس کے بھی ہندو دوست تھے، جن سے وہ محبت کرتا تھا لیکن یہ محبت ذاتی سطح پر تھی، اس کی پشت پر کوئی نظریاتی شعور نہیں تھا۔ یہ قطعہ اسی سے منسوب کیا جاتا ہے:

مسلمانوں کے میلوں کا ہُوا قُل
بچے ہے جوگ مایا اور دیبی!
نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا
مگر ہاں نام کو اورنگ زیبی

—— نسخۂ عرشی

غالب جیسے شخص کو جو خالصتہً شاعر تھا اور اپنی شاعری کی وجہ سے ہی مقبولِ خاص و عام رہا ہے، ایک "سامراج" دشمن مجاہد بنا کر پیش کرنا سوویٹ محققین کی کوئی فروگذاشت نہیں بلکہ اس کی پشت پر ایک طے شدہ سیاسی حکمتِ عملی ہے۔ یاد رہے کہ روسیوں کے نزدیک ہندوستان پر سامراجی اقتدار اب بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں ماسکو کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر نے "ہندوستانی اور پاکستانی کہانیاں" کے نام سے ایک کتاب شایع کی تھی جس میں ہندوستان پاکستان کے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی نگارشات شامل تھیں۔ اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے 'پراودا' نے اپنی ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں لکھا تھا: "ان کہانیوں کے مصنف حقیقی موضوعات سے گریز نہیں کرتے ہیں اور اپنے عوام کی زندگی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان کی بہتر زندگی کے لیے اس جدوجہد کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان کا ملک نو آبادیاتی غلامی سے آزاد ہو جائے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ "پراودا" کے نزدیک ہندوستان ۱۹۵۴ء تک بھی نو آبادیاتی غلامی سے آزاد نہیں تھا جبکہ اس کی آزادی کو سات سال ہو چکے تھے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور پاکستان کے ترقی پسند شاعروں نے آزادی کا جو ماتم کیا وہ بھی اسی فیصلے کے تحت تھا اور تلنگانہ کی بغاوت بھی اسی نظریے کے تحت تھی۔

بین الاقوامی کیمونزم، نوجوان کیمونسٹ شاعروں کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتا ہے اور ان کی وطن دشمن سرگرمیوں کی پردہ پوشی کے لیے انھیں ایک روایت کا وارث قرار دینا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے غالب سے بہتر شاعر اور کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یوگینی چیلیشو نے اپنے مضمون کی تان یہاں توڑی ہے کہ علی سردار جعفری کی شاعری پر غالب کی شاعری کا گہرا اثر ہے۔

—— اپریل ۱۹۶۱ء

(۱۴)

گاندھی جی کے اساسی تصوّرات

گاندھی جی نے ایک بار کہا تھا کہ وہ اپنی نجات کو ہندوستان کی آزادی کے مقابلے میں اہم تر سمجھتے ہیں۔ اس قول کی اہمیت کا اندازہ اس صورت میں بہتر لگایا جا سکتا ہے، اگر اس کا موازنہ محمد علی جناح کے ایک قول سے کیا جائے۔ محمد علی جناح کا قول تھا: "میں حصولِ پاکستان کے لیے شیطان سے بھی سمجھوتہ کر سکتا ہوں۔"

یہ وہی ذرائع اور مقاصد کی پرانی بحث ہے۔ گاندھی جی نے جب یہ کہا کہ وہ اپنی نجات کو ہندوستان کی آزادی سے بھی اہم سمجھتے ہیں تو ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ حصولِ آزادی کے لیے بھی کوئی ایسا قدم اٹھانے کو تیار نہیں جس سے ان کی نجات خطرے میں پڑ سکتی ہو۔ ایسا آدمی خدائی فوجدار کبھی نہیں بن سکتا۔

"ینگ انڈیا" کی ۱۷؍جولائی ۱۹۲۴ء کی اشاعت میں انھوں نے کہا تھا:

"وہ کہتے ہیں وسائل بہرحال وسائل ہی ہوتے ہیں، میں کہوں گا وسائل ہی سب کچھ ہیں جیسے وسائل ہوں گے ویسا ہی انجام ہوگا۔ وسائل اور انجام میں کوئی

حد فاصل نہیں۔ خالق نے ہمیں تھوڑا بہت کنٹرول وسائل پر ہی دیا ہے۔ نتیجہ ہماری دسترس سے باہر ہے۔ مقصد کا حصول وسائل کے مطابق ہی ہوگا۔ اس اصول میں کبھی استثنا کی گنجائش نہیں۔"

یہ الفاظ گاندھی جی نے اس وقت کہے تھے جب روس میں انقلاب ہو چکا تھا اور لینن کی وسائل کے اچھا یا برا ہونے کے متعلق سنگدلانہ بے نیازی فیشن بن چکی تھی۔

جس طرح گاندھی جی حصول مقاصد کے لیے نامناسب ذرائع کے روادار نہیں تھے اسی طرح وہ یہ بھی نہیں مانتے تھے کہ اکثریت کا فائدہ ہی سب کچھ ہے اور اس کے لیے اقلیت کے مفاد کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ مہادیو ڈیسائی نے اپنی ڈائری میں ان کے مندرجہ ذیل قول کا حوالہ دیا ہے:

"میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے زیادہ سے زیادہ فائدے کے نظریے کا قائل نہیں۔ اس کا بھونڈا مطلب تو یہ ہوگا کہ اکیاون فیصدی لوگوں کے مبینہ فائدے کے لیے انچاس فیصدی لوگوں کے مفادات کو قربان کیا جا سکتا ہے بلکہ قربان کر دیا جانا چاہیے۔"

حصولِ مقاصد کے لیے سب کچھ کر گزرنے کا جواز اور اکثریت کے مفاد کی بارگاہ پر اقلیت کے مفادات کی قربانی کو جائز ٹھہرانا، یہ عصری سیاست کے دو انتہائی خطرناک مفروضے تھے اور ان دونوں کے استرداد کو گاندھی جی کے اساسی تصورات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

ان کی تیسری دین یہ اصول تھا کہ اصلاح کی کوشش کا آغاز اپنی ذات سے کرنا چاہیے۔ جیسے ہی اپنی ذات کی اصلاح ہو جائے اصلاح کا عمل شروع ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد صرف صفر بڑھانے کا عمل باقی رہ جاتا ہے۔ اگر ایک بھی صالح آدمی نہ ہو تو صفر کس عدد پر لگائی جائے گی اور اگر صفر پر صفر لگائی بھی گئی تو نتیجہ وہی صفر رہے گا۔ دوسروں کی اصلاح کا بھی ان کے نزدیک یہی طریقہ تھا کہ ان کے ضمیر کو بیدار کیا جائے کیونکہ اگر اصلاح ان پر لادی گئی تو یہ ایک طرح کا تشدد ہوگا۔

سوال یہ نہیں کہ ہندوستانیوں نے ان کے اصولوں پر کس حد تک عمل کیا اور اگر محققانہ چھان بین کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ کچھ ایسے واقعات بھی مل جائیں جن سے پتہ چلے کہ کبھی کبھی گاندھی جی خود بھی اپنے معیار پر پورے اترنے میں ناکام رہتے تھے لیکن ان کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک یاد رہے گا کہ انھوں نے اخلاقی معیاروں کو ایک ایسے شعبۂ حیات میں مروج کیا جہاں اس سے پہلے ان کا چلن نہیں تھا۔ ہماری مراد سیاسی میدان سے ہے۔

اپنے اخلاقی اندازِ نظر کے باعث گاندھی جی صرف ہندوستان ہی میں مقبول نہیں بلکہ ان کی شخصیت کو ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہے وہ اس ملک میں بھی خصوصی عزت و احترام کے مستحق سمجھے جاتے ہیں جس کے مقابلے میں انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی تحریک شروع کی تھی۔ جب یہ تحریک جاری تھی تب بھی برطانیہ میں ان کی مقبولیت کم نہیں تھی۔ جب وہ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ۱۹۳۱ء میں برطانیہ گئے تو انھوں نے کہا تھا:

"میرے لیے یہ امر ذاتی تسکین کا باعث ہے کہ مجھے ان لوگوں کی محبت اور اعتماد بدستور حاصل ہے جن کے اصولوں اور پالیسیوں کی میں مخالفت کرتا ہوں۔"

جیسا کہ جمہوری سیاست میں ہوتا ہے، ہندوستان اور برطانیہ کے اختلافات پُرامن طور پر حل ہوئے، ہندوستان کو مکمل آزادی ملی اور اب یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں۔ گاندھی جی کی مقبولیت میں بھی وہاں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک کے اس مردِ عظیم کو تازہ خراجِ عقیدت برطانیہ نے ۱۷ مئی ۱۹۶۸ء کو پیش کیا جب ٹیوسٹوک سکوائر گارڈن میں وہاں کے وزیرِ اعظم مسٹر ہیرلڈ ولسن نے گاندھی جی کے کانسی کے مجسمے کی نقاب کشائی کی۔ اس مجسمے پر دس ہزار پونڈ لاگت آئی اور اسے مشہور مجسمہ ساز فریڈا برلینیٹ نے تیار کیا ہے۔ نقاب کشائی کرتے وقت مسٹر ولسن نے کہا کہ:

"گاندھی جی ایک عظیم اور نیک آدمی تھے جن کے ہم اور ہمارے ہندوستانی دوست بہت زیادہ ممنون ہیں۔ دونوں ملکوں کے باشندے ان کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہندوستان اور برطانیہ میں قریبی اور روز افزوں دوستانہ مراسم کی بنیاد رکھی۔ جن میں اکیس برس سے جب ہندوستان آزاد ہوا، برابر اضافہ ہوا ہے۔"

کنزرویٹو پارٹی کے لیڈر مسٹر ایڈورڈ ہیتھ نے تہنیت کا جو پیغام بھیجا اس میں درج تھا:

"گاندھی جی کی زندگی کی مثال ان سب لوگوں کے لیے ہمیشہ اُمنگ فراہم کرتی رہے گی جو تشدد کے بغیر سیاسی تبدیلی کے لیے کوشاں ہیں۔"

کچھ تو اس میں گاندھی جی کی شخصیت کی محبوبیت کو دخل تھا اور کچھ برطانویوں کی مخلصانہ عقیدت کو کہ لندن میں گاندھی جی کے مجسمے کی نقاب کشائی انہی دنوں میں ہوئی جب دلی میں جارج پنجم کا بت ہٹایا جا رہا تھا اور اس سے کچھ ہی پہلے شاہ ایڈورڈ کا بت ہٹایا گیا تھا۔

گاندھی جی کے مقاومتِ مجہول کے طریقے کو بھی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔ چیکوسلواکیہ کے مظلوم باشندے جابر سوویٹ سامراجیوں کے خلاف یہی طریق کار اپنا رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایک باضمیر جمہوری ملک کے مقابلے میں یہ طریق کار مؤثر رہا۔ برطانیہ نے افہام و تفہیم کے ذریعہ ہندوستان کو آزادی دے دی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک بے ضمیر کلیت کیش نظام کے مقابلے میں اس طریقِ کار کو کہاں تک کامیابی حاصل ہوتی ہے؟ بظاہر آثار اُمید افزا نہیں۔ رُوس کے سرکاری اخبار "پراودا" نے مقاومت مجہول کے طریقِ کار کو "پُرامن ردِّ انقلاب" کا نام دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ:

> سوشلسٹ دشمن طاقتیں اپنے متشدّدانہ طریقِ کار میں ترمیم کرنے کے لیے اس لیے مجبور ہوئیں ہیں کہ سرمایہ داری کی طاقتیں بہت کمزور ہو گئی ہیں۔

——— اکتوبر ۱۹۶۸ء

(۱۵)

جب بندھن ٹوٹے

کمیونسٹوں کا دعویٰ رہا ہے کہ اشتراکی ملکوں کے ادیب اپنے ملک کے نظامِ حکومت کی تائید کسی جبر کے تحت نہیں کرتے بلکہ نئے ماحول کی خوش گواری از خود انھیں اشتراکی نظام کی مدح خوانی پر مجبور کر دیتی ہے، لیکن اگر روس اور اس کے حاشیہ بردار ملکوں کے شاعروں کی ان نظموں کا مطالعہ کیا جائے جو انھوں نے اسٹالن کی موت کے بعد حکومت کی طرف سے مبینہ ڈھیل کے دوران میں لکھیں تو یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ جیسے ہی ان شاعروں کو احساس ہوا کہ احتساب کی تلوار ان کی گردن سے ہٹ گئی ہے۔ ان کا لہجہ یکسر بدل گیا اور وہ اشتراکی نظام کی تائید کے بجائے برملا اس پر نکتہ چینی کرنے لگے۔

۰ار اپریل ۱۹۵۸ء کے "لٹریری گزٹ" میں رُوس کے ایک شاعر ایوگنی ایوتوشینکو کی مندرجہ ذیل نظم کو نکتہ چینی کا ہدف بنایا گیا ہے:

"سرحدیں مجھ پر جبر کرتی ہیں
مجھے یہ ناگوار لگتا ہے کہ مجھے بیونوس ائیرز اور نیو یارک
کا کوئی پتہ نہیں

میں لندن میں جی بھر کر گھومنا چاہتا ہوں
میں ہر شخص سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں
خواہ یہ گفتگو ٹوٹی پھوٹی زبان ہی میں ہو
میں بس میں سوار ہو کر ایک نوجوان لڑکے کی طرح صبح کے
وقت پیرس میں گھومنا چاہتا ہوں
میں ایسا ادب چاہتا ہوں جو میری شخصیت کی طرح مختلف النوع
اور رنگا رنگ ہو"

نظم پر نکتہ چینی کرتے ہوئے "لٹریری گزٹ" نے لکھا تھا۔ "اگر ایوٹوشینکو صرف لندن اور پیرس میں گھومنا چاہتا تو کوئی خاص بُرائی نہیں تھی۔ مصیبت یہ ہے کہ اسے روس کی سرحدوں میں رہنے سے نفرت ہے۔"
"نووی میر" کے ۱۹۵۶ء کے چوتھے شمارے میں مندرجۂ ذیل نظم شایع ہوئی تھی جس کا عنوان "ایک جوڑا" تھا:—

انھوں نے ٹرام پر پھر جھگڑنا شروع کر دیا
اجنبیوں کے سامنے جھگڑتے ہوئے انھیں کوئی ندامت نہیں ہو رہی تھی
میں ان پر رشک کرنے سے باز نہ رہ سکا اور بڑے غور سے
انھیں دیکھنے لگا
وہ نہیں جانتے تھے کہ انھیں کیا خوشی حاصل ہے اور نہ کوئی
انھیں یہ بات سمجھا سکتا ہے
کوئی دوسرا انھیں کس طرح سمجھائے کہ وہ دونوں زندہ انسان
ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھا کر ان تمام باتوں
کی تلافی کر سکتے ہیں جو ان کے مابین اختلاف کا باعث ہوں"

"سوویٹ قازقستان" کے جنوری ۱۹۵۷ء کے شمارے میں "ایک شام" کے عنوان سے ایل، کریوو شینکو کی مندرجۂ ذیل نظم شایع ہوئی تھی۔ بعد میں قازقستان مرکزی کمیٹی کے سکریٹری نے ایک پبلک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اسے "نظریاتی طور پر زہرناک" بتایا تھا:

"بچے سو گئے ہیں
مکان خاموش ہے
بچوں کی دیکھ بھال سے تھک کر میری بیوی سو گئی ہے
اب وقت ہے کہ میں سوچوں کہ مجھے کیا لکھنا ہے

اور میں تاریکی میں اپنا قلم تلاش کرتا ہوں
مجھے روشنی کی ضرورت ہے لیکن میں روشنی کے لیے
سوئچ نہیں دبا سکتا
بچے جاگ پڑیں گے اور چلانا شروع کر دیں گے
ہمیشہ کی طرح میں روشنی سے گریز کرتا ہوں اور تاریکی
ہی میں اس پر ایک نظم لکھتا ہوں
میری اس نظم کے شعروں میں آہنگ نہیں
یہ کسی اخبار میں چھپنے کے لیے نہیں
میں اس کا انتساب اس وقت سے کرتا ہوں جب انھیں روشنی میسر آئے گی"

اب چیکوسلواکیہ کے کچھ شاعروں کی نظمیں سنیے جو اسی دور میں لکھی گئیں۔

"کوٹین" کے فروری ۱۹۵۷ء کے شمارے میں "اخبار نویس" کے عنوان سے جارومیر موورک کی مندرجۂ ذیل نظم شایع ہوئی تھی:

وہ دور کتنا اچھا تھا جب ایک اخبار نویس کو لکھنا آتا تھا
آج تو اسے ایک اچھا سرکاری افسر بننے پر تمغہ مل جاتا ہے
اور لکھنا —— اس سلسلے میں کیا کہوں —— یہ بورژوا
دور کی ایک یادگار ہے"

"کوٹین" کے مارچ ۱۹۵۷ء کے شمارے میں "انحطاط پسند" کے عنوان سے جے، آر، پکی کی مندرجۂ ذیل نظم شایع ہوئی تھی:

"اس کی آنکھوں سے انسانی تباہی جھلک رہی تھی
اور اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا تھا
لیکن اس نے یسینین کی طرح خودکشی نہیں کی
اگر وہ خودکشی کر لیتا تو میکافسکی ہوتا[1]"

اسی پرچے کے فروری ۱۹۵۷ء کے شمارے میں جے، آر، پکی کی مندرجۂ ذیل نظم بھی شایع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا: "ایک جانی بوجھی بات"۔

---

[1] یسینین اور میکافسکی دو روسی شاعر تھے جنھوں نے بالترتیب ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۰ء میں خودکشی کی لیکن جہاں اول الذکر کو انحطاط پسند قرار دیا جاتا ہے وہاں آخر الذکر کی ایک اچھے بالشویک کی حیثیت سے مدح سرائی کی جاتی ہے۔

"ہمارے ملک کے متعلق یہ ایک جانی بوجھی بات ہے
اگر تمھیں یہاں کوئی ایسا شخص ملے جو ماحول کا شکوہ نہ کرتا ہو
تو یا تو وہ غیر ملکی ہوگا یا گونگا"

اب پولینڈ کے چند شاعروں کی نظمیں سنیے:

میکزنیلا جاسٹرن کی نظموں کا جو مجموعہ وارسا میں ۱۹۵۶ء میں شایع ہوا اس میں "آدمی" کے عنوان سے مندرجۂ ذیل نظم شایع ہوئی تھی:

"میں نے ایک آدمی دیکھا
جسے فرشتوں نے اذیت ناک سوال پوچھ پوچھ کر قتل کر دیا تھا
وہ ایک زندہ لاش تھا —— کشتۂ اخلاق
میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا
وہ صرف رحم کا مستحق تھا
اور رحم کھا کر مجھے اسے قتل کرنا پڑ گیا
میں فرشتوں میں شامل ہو گیا
اور اس کے دل کو جو بہر حال ایک انسانی دل تھا،
پاؤں سے ملنے لگا اور ریزہ ریزہ کرنے لگا"

"پوپروسٹو" کے ۵ مئی ۱۹۵۶ء کے شمارے میں وکٹر وارو زسکی کی مندرجۂ ذیل نظم شایع ہوئی تھی۔ جس کا عنوان تھا "پارٹی کارکن سے سوال":

"پارٹی ایک ایسا کنواں ہے جس کے پانی کو گدلا نہیں کیا جا سکتا
تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نہانا اور کپڑے دھونا بند کر دوں؟
پارٹی ایک مضبوط چٹان ہے
تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خاک کا ایک حقیر اور بے حس و حرکت ذرہ ہوں
پارٹی ہمارے طبقے کا ذہن ہے
تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میری کھوپڑی میں کچھ بھی نہیں
پارٹی آخری ادارہ ہے
تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ایک بے بس گونگا ہوں
پارٹی آخری حکم ہے

توکیا میں جو ایک جفت ساز ہوں مرکزی کمیٹی سے یہ پوچھوں
کہ جوتے کیسے بنائے جاتے ہیں
کیا میں جو ایک باغبان ہوں مرکزی کمیٹی سے یہ پوچھوں
کہ سیب کے درختوں کی پرورش کیسے کرنی چاہئے
اور کیا میں جو ایک مغنّی ہوں، ہمیشہ پارٹی سے یہ پوچھتا
رہوں کہ میرے ذہن میں نغمے کی دُھنیں کیسی بننی چاہئیں
پارٹی ہمیشہ راستی پر ہے
توکیا وہ شخص جو اونچی سیڑھی پر بیٹھا ہو ہمیشہ راستی پر ہوتا ہے
پارٹی ایک سنگی وحدت ہے
توکیا جب بھی کبھی میرے دل میں کوئی شک سر اُٹھائے
میں خود کو غدار سمجھوں"

کیا یہ نظمیں اس حقیقت کا زندہ ثبوت نہیں کہ ان شاعروں کے دل میں اشتراکی ماحول سے بے اطمینانی کا شدید جذبہ موجود تھا جو نظام جبر کی معمولی سی ڈھیل پر زبان پر آگیا اور اس سے پہلے اشتراکی نظام کی جتنی بھی قصیدہ خوانی ہوئی وہ ان کے دل کی آواز کے بجائے حکومتی جبر کا نتیجہ تھی۔

——— اگست ۱۹۶۰ء

(۱۶)

یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

حال ہی میں Reminiscences Of The Nehru Age کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کے مصنف پنڈت جواہر لال نہرو کے اسپیشل سیکریٹری مسٹر ایم، او، متھائی ہیں۔ راقم الحروف کی پرورش ایک ایسے معاشرے میں ہوئی جس میں ذاتی وفاداریوں کو کافی اہمیت حاصل تھی اس لیے مجموعی طور پر یہ کتاب مجھے ناپسند ہے۔ پنڈت نہرو میں لاکھ ذاتی خامیاں سہی، ان کا بیان ایک ایسے شخص کو زیب نہیں دیتا جو ایک طرح سے ان کا پروردہ تھا اور جسے انھوں نے اتنی اہمیت دے رکھی تھی کہ لوگ یہاں تک کہتے تھے کہ پنڈت نہرو کے بعد حکومتِ ہند میں اہم ترین آدمی متھائی ہی ہیں۔

مس مردولا سارا بھائی کے بارے میں متھائی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی عدم صحت کا ثبوت خود ان کے بیان کا تضاد ہے۔ ایک طرف وہ کہتے ہیں کہ مس سارا بھائی پنڈت نہرو کو اپنے دامِ عشق میں گرفتار کرنے کی فکر میں تھیں اور دوسری طرف یہ کہ اس خاتون کو اپنی شکل بگاڑنے میں کمال حاصل تھا۔ جو خاتون کاروبارِ عشق میں مصروف ہو وہ خود کو بنانے سنوارنے کی فکر میں رہتی ہے اپنی صورت کو مسخ کرنے کی دھن میں نہیں۔ وضع قطع کو بگاڑنے کے سلسلے میں مسٹر متھائی نے اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ جب ان سے ملے تو انھوں نے پٹھانوں کا لباس پہن رکھا

تھا۔ غالباً ان کی مُراد یہ ہے کہ وہ شلوار پہنتی تھیں، جو صحیح ہے۔ لیکن شلوار وہ اس لیے نہیں پہنتی تھیں کہ انھیں اپنی ہیئت بگاڑنا مقصود تھی۔ ویسے اگر صوبائی تعصب سے کام نہ لیا جائے تو شلوار اتنا بُرا لباس ہے بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شلوار وہ اس لیے پہنتی تھیں کہ وہ اغوا شدہ مسلمان عورتوں کی بازیابی کے کام میں مصروف تھیں اور ان کا خیال تھا کہ انھیں اس لباس میں دیکھ کر ان مظلوم عورتوں کے دل میں کچھ اعتماد پیدا ہو گا۔ اس اندازِ نظر کی صحت کو ایک جگہ خود متھائی صاحب نے تسلیم کیا ہے۔ ایک بار انھیں اطلاع ملی کہ ایک مسلمان لڑکی دلّی کے کسی ہوٹل کے کمرے میں بند ہے اور اس کی جان خطرے میں ہے۔ متھائی صاحب جیب میں پستول ڈال کر اس ہوٹل کی طرف چل پڑے لیکن اپنے ساتھ انھوں نے ایک داڑھی والے مسلمان کو بھی لے لیا۔ ان کا بیان ہے کہ داڑھی والے مسلمان کو دیکھ کر اس لڑکی کے دل میں، جو بُری طرح لرز رہی تھی، اعتماد پیدا ہوا۔

بہر حال اس کتاب کے کچھ حصے ایسے بھی ہیں، جن کا اگرچہ کوئی سیاسی مفہوم نہیں لیکن وہ بیک وقت دلچسپ بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی۔ مثلاً اپنی کتاب کے صفحہ ۸۵ پر وہ لکھتے ہیں کہ :

> ایک شخص کو جو مسلمان نظر آتا تھا، شرنارتھیوں کے ایک گروپ نے گھیر لیا۔ اس نے زبردست احتجاج کیا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ لیکن شرنارتھی اس کے غیر مسلم ہونے کا ثبوت چاہتے تھے اور ثبوت اس طرح مل سکتا تھا کہ وہ اپنے کپڑے اُتار دے۔ یہ سُن کر اس شخص کو یقین ہو گیا کہ اب موت سے بچنا ممکن نہیں کیونکہ کسی وجہ سے بچپن میں اس کی ختنہ کر دی گئی تھی۔ اسے معجزہ ہی سمجھیے کہ عین اس وقت جنوبی ہند کا ایک برہمن وہاں پہنچ گیا جس کے ماتھے پر تلک بھی تھا اور سر پر لمبی چوٹی بھی۔ اس نے گواہی دی کہ وہ اس شخص کو جانتا ہے اور وہ صرف ہندو ہی نہیں بلکہ برہمن بھی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ متھائی صاحب نے جہاں خواتین کا ذکر کرتے وقت ان کا نام پوشیدہ رکھنا ضروری نہیں سمجھا وہاں ایک وزیر کی بے اعتدالیوں کا ذکر کرتے وقت اس کے نام کو مخفی رکھنا ضروری خیال کیا۔ تفصیل انھی کی زبانی سنیے :

> "۱۹۵۵ء کے آس پاس ایک منسٹر آف اسٹیٹ اپنی حماقت کی بنا پر مصیبت میں پڑ گیا۔ اسے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بہ طور ڈیلی گیٹ بھیجا گیا۔ وہ ایک امیر شخص تھا، شادی شدہ تھا اور اس کے کئی بچے تھے۔ لیکن اپنے ساتھ وہ ایک نوجوان خاتون کو بھی لیتا گیا اور نیو یارک، پیرس اور لندن کے ہوٹلوں میں وہ اپنا نام میاں بیوی کی حیثیت سے درج کرا کے ایک ہی کمرے میں رہتے رہے۔ کچھ دن بعد وہی خاتون اپنا سامان لے کر نئی دلّی پہنچ گئی اور مطالبہ کیا کہ اسے وزیر موصوف اپنے گھر میں رکھیں، خواہ نوکرانی کی حیثیت ہی سے سہی۔ میاں بیوی دونوں بہت پریشان ہوئے۔ اسے گھر سے نکال دیا گیا لیکن وہ ویسٹرن کورٹ میں ایک کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب

ہوگئی۔ وہ کئی اہم لوگوں سے ملی اور ان تک اپنی شکایات پہنچاتی رہی۔ آخر اس نے ایک دن وزیر اعظم کو راستے میں روک لیا اور اپنی بات کہہ کر ہی ٹلی۔ وزیر اعظم نے مجھ سے کہا میں اس وزیر کو گفتگو کے لیے بلاؤں۔ میں نے اس وزیر کو ٹیلی فون کیا اور دوپہر میں اپنے دفتر بلایا۔ اس نے ہر بات کا اعتراف کرلیا۔ میں نے اسے کاغذ کا ایک ٹکڑا دیا اور کہا کہ وہ اس پر وزیر اعظم کے نام اپنا استعفیٰ لکھ دے۔ استعفیٰ کے لیے میں نے اس سے مندرجۂ ذیل الفاظ تحریر کرائے: "میں ذاتی وجوہ سے وزراء کی کونسل سے استعفیٰ دے رہا ہوں۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اس استعفیٰ کو منظوری کے لیے صدر محترم کو بھیج دیں۔" استعفیٰ لکھوانے کے بعد میں نے وزیر سے کہا کہ وہ سوموار کے دن ایک مشترکہ دوست یو، ایس، ملیا ممبر پارلیمنٹ کے ساتھ جنھیں جملہ واقعات کا علم ہے، پارلیمنٹ ہاؤس میں میرے دفتر میں مجھ سے ملے۔ وہ دونوں مجھ سے ملے، میں نے وزیر سے کہا کہ جہاں تک جنسی معاملات کا تعلق ہے مجھے کوئی فیصلہ صادر کرنے کا حق نہیں پہنچتا لیکن تم نے یہ حماقت کی ہے کہ ہر ہوٹل میں اپنا اور اس عورت کا نام میاں بیوی کی حیثیت سے درج کرایا ہے۔ اب کچھ لوگوں نے اسے بھڑکا کر تمھیں بلیک میل کرنے کو یہاں بھیج دیا ہے۔ اب تم اسے کچھ دے دلا کر چپ کر دو۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا دوست ملیا اسے دلی چھوڑنے پر آمادہ کرلے گا۔ ملیا نے طے کیا کہ وزیر کی مالی حیثیت دیکھتے ہوئے پچاس ہزار روپے کی رقم مناسب ہوگی۔ دو تین دن میں یہ ادائیگی ہوگئی اور وہ عورت دلی چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے وزیر اعظم کو استعفیٰ کا خط بھی دے دیا اور تمام تفصیلات بھی بتا دیں۔ وزیر اعظم نے دو دن سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ استعفیٰ منظور نہ کیا جائے۔ اس کے بعد اس وزیر کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اندرا گاندھی کے دور میں وہ کیبنٹ منسٹر بنا اور سب وزیروں سے زیادہ اطاعت شعار ثابت ہوا۔ سنجے کو سیاست میں بھی پہلے وہی لایا تھا وہ اسے اپنی ریاست میں لے گیا اور ایک پبلک تقریب میں جو سرکاری خرچ پر منعقد ہوئی تھی تقریر کرتے ہوئے یہ انتہائی معنی خیز اعلان کیا: "میں نے تمھارے نانا کی بھی غلامی کی ہے، تمھاری ماں کی بھی، اب میں تمھاری غلامی بھی کروں گا۔"

(۱۷)

یورپ سے واپسی پر

(۱)

برطانویت

برطانیہ کے سفر سے واپس آیا ہوں تو اکثر احباب پوچھ رہے ہیں کہ وہاں مجھے سب سے زیادہ کس چیز نے متاثر کیا۔ لبظاہر اس سوال کا جواب آسان نہیں۔ چار ہفتے کی مدت میں برطانیہ کے مختلف شہر اور قصبے ہی نہیں بلکہ اس کی زندگی کے مختلف شعبوں کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان میں سے ہر ایک ایک علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

ان تمام پہلوؤں پر بالتفصیل لکھا بھی جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ یہ تحریریں ایک کتاب کی شکل اختیار کریں لیکن آج کی صحبت میں صرف اس سوال پر بحث کروں گا کہ مجھے سب سے زیادہ کس چیز نے متاثر کیا۔

اتفاق سے میرے ایک میزبان نے بھی مجھ سے یہی سوال پوچھا تھا۔ میں نے فوراً ہی جواب دیا تھا: برطانویت! آج کئی ہفتے بعد جب یہ سوال پھر پوچھا جا رہا ہے تو غور و خوض کے بعد بھی میں اس سوال کا اس سے بہتر جواب نہیں دے سکتا۔

برطانویوں اور ان کے آدابِ زندگی سے ہم ہندوستانیوں کی واقفیت بہت پرانی ہے اور ہم ایک مدت سے ان سے متاثر بھی ہیں۔ اردو کے ادیبوں میں سب سے پہلے حالی متاثر ہوئے تھے اور انھوں نے ابنائے وطن کو "پیرویِ مغربی" کا مشورہ بھی دیا تھا لیکن یہ مشورہ دیتے وقت ان کے پیشِ نظر زیادہ تر برطانیہ کی میکینیکی اور مادی تکمیلات تھیں۔ اگر میکینیکی

اور مادی ترقیات کا ذکر مقصود ہو تو اب حالی سے کہیں زیادہ رطب اللسانی کا امکان ہے۔ حالی نے جب یہ کہا تھا کہ :

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں
گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں

تو ان کے پیش نظر ریل تھی۔ لیکن میں لندن صبا رفتار طیارے میں گیا تھا اور واقعی پلوں میں لندن پہنچ گیا تھا۔ آسائشیں بھی اس سفر میں، جیسا کہ ہوائی جہاز کے مسافروں کو بخوبی تجربہ ہے، پوری پوری موجود تھیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ کے جدید ترین کارخانے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ بی۔ بی۔ سی کی نشرگاہ بھی دیکھی جس نے فروغ علم میں اتنا حصہ لیا ہے کہ اسے صحیح معنی میں دانش گاہ کہہ سکتے ہیں۔ میکینیکی ترقیات نے صحافت کو موثر بنانے میں جو معجزے دکھائے ہیں، ان کا مشاہدہ بھی اپنی آنکھوں سے کیا۔ کارڈف میں ساؤتھ ویلز ایکو کے ایڈیٹر مسٹر جے۔ ایم وگنس نے ہمیں چائے پر مدعو کیا تھا۔ چائے کی پیالی ہمارے ہاتھ میں تھی کہ ایڈیٹر کو ایک نامہ نگار کا پیغام ملا کہ اسے ایک ایسی خبر ملی ہے کہ جو پہلے صفحے پر نمایاں طور پر جا سکتی ہے۔ ایڈیٹر نے یہ پیغام نیوز ایڈیٹر تک پہنچا دیا اور پیشتر اس کے کہ ہم چائے ختم کرتے یہ خبر اخبار میں باقاعدہ طور پر چھپ کر ہمارے رُوبرو تھی۔ ان تمام ترقیات پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ برطانویت کے مفہوم کا جز و لاینفک نہیں۔

یہ چیز بھی کچھ اہم نہیں کہ ملک کی مادی ترقیات سے معدودے چند لوگوں کو نہیں، بلکہ پوری قوم کو فائدہ پہنچا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ برطانیہ کے ایک عام باشندے کے معیار زندگی میں نمایاں طور پر اضافہ ہوا ہے۔ ابھی ۱۹۳۹ء کی بات ہے کہ وہاں نچلی سطح کی آمدنی ایک سو پچیس پونڈ اور ایک سو پچاس پونڈ کے درمیان تھی۔ اب ملک کے بیشتر باشندوں کی آمدنی اڑھائی سو پونڈ سے پانچ سو پونڈ اور پانچ سو پونڈ سے ساڑھے سات سو پونڈ تک کے درمیان ہے۔ صرف یہی نہیں کہ عام آدمیوں کی آمدنی کی سطح بلند ہوئی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی آدمیوں کی سب سے اونچی سطح میں بھی نمایاں کمی ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد اب برائے نام ہے جن کی آمدنی چار ہزار اور چھ ہزار پونڈ کے درمیان ہو۔ اب کثیر ترین آمدنی والوں کی اوسط آمدنی ایک ہزار اور دو ہزار پونڈ کے اندر اندر ہے۔ مساوات کے اس عمل اور برطانیہ کے ٹیکس کے نظام کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جائے گا بھی، لیکن میں سردست برطانویت کے بنیادی مفہوم میں اسے بھی شامل نہیں کر رہا۔ اور نہ فلاح عامہ کی ان سرکاری سکیموں کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں جنھوں نے مساوات کے اس عمل کو موثر تر بنا دیا ہے۔ سردست میں صرف برطانوی قوم کے مزاج کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، جس کی مختلف کیفیات کو میں نے برطانویت کا نام دیا ہے۔

سب سے زیادہ متاثر مجھے برطانویوں کی اس ادا نے کیا کہ وہ غیر متقلدوں کو صرف برداشت ہی نہیں کرتے بلکہ ان کا احترام بھی کرتے ہیں۔ برٹرنڈ رسل ان دنوں بعض انتہائی نازک معاملات میں قوم کی اجتماعی رائے کی مخالفت کر رہے ہیں لیکن ان کے خلاف کوئی مظاہرۂ غیض دیکھنے میں نہیں آیا اور یہی دیکھا کہ لوگ ان کا ذکر مزے لے لے کر کر رہے ہیں۔

ہم نے اپنے میزبانوں سے مطالبہ کیا تھا کہ برطانوی رائے عامہ کے مختلف ترجمانوں سے ہماری ملاقات کرائی جائے۔ اس سلسلے میں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا کہ ہم غیر متقلدوں سے ضرور ملیں۔ ویلز میں ہماری ملاقات مشہور ویلش نیشنلسٹ

سانڈرس لوئس سے بھی کرائی گئی۔ اپنے خیالات کے اعتبار سے انھیں وہی مقام حاصل ہے جو ہندوستان میں ماسٹر تارا سنگھ یا ڈی ایم کے، کے کسی لیڈر کو۔ لیکن اس شخص کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ریڈیائی سہولتیں بھی دی جاتی ہیں اور ایک مخصوص نظریے کے ترجمان کی حیثیت سے غیر ملکیوں سے بھی ملوایا جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ویلش زبان کے ماہر اور ایک شاعر کی حیثیت سے انھیں سماج میں ایک بلند مقام بھی حاصل ہے۔

پارلیمان کے ممبروں سے ہماری ملاقات کرائی گئی تو یہ اہتمام برتا گیا کہ دعوت میں جہاں دو ممبر برسرِ اقتدار پارٹی کے ہوں وہاں دو اپوزیشن پارٹی کے ممبر بھی ہوں۔ برسرِ اقتدار پارٹی کے ممبروں میں مسٹر فرینک پیرسن ایم، پی، اور آنریبل مسٹر ای ایمٹ جے، پی تھیں اور لیبر پارٹی کے ممبر رائٹ آنریبل جون سٹریچی تھے ان ممبروں کے باہمی دوستانہ مراسم اور بنیادی مسائل پر اتفاق رائے سے یہ شبہ ہونے لگتا تھا کہیں برطانیہ میں برسرِ اقتدار پارٹی اور اپوزیشن کا فرق اس حد تک تو زائل نہیں ہو گیا کہ پارلیمانی نظام کا چلانا ہی مشکل ہو جائے لیکن دعوت کے بعد جب ہم پارلیمان کے اجلاس کی کارروائی دیکھنے گئے تو یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ اپوزیشن کے ممبر وزراء پر شیروں کی طرح دہاڑ رہے ہیں اور دونوں پارٹیاں واقعی ایک دوسرے کی حریف ہیں۔ نظامِ حکومت کو بہتر سے بہتر بنانے اور جمہوری آداب کی حفاظت کا جذبہ برطانیہ میں اس حد تک قوی ہے کہ اپوزیشن غیر مؤثر کبھی نہیں بن سکتی۔ برطانیہ کے اخبار اور وہاں کی رائے عامہ بھی اپنے جمہوری حقوق کی ہمہ وقت نگہبانی کرتی رہتی ہے اور ہر طرف نکتہ چینی ہی سنائی دیتی ہے۔ ایک غیر ملکی کو دیکھ کر بظاہر یہ حیرت ہوتی ہے کہ برطانیہ کے باشندے ایک ایسے نظامِ حکومت پر بھی ہمہ وقت نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں جو مہد سے لحد تک ان کی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے۔ لیکن بہت جلد یہ نکتہ سامنے آجاتا ہے کہ اگر نظامِ حکومت کو خوب سے خوب تر بنانے کا جذبہ اتنا قوی نہ ہوتا تو شاید وہ سب کچھ انھیں حاصل نہ ہوا ہوتا جو اس وقت حاصل ہے۔ برطانیہ کے باشندے اپنے سوا کسی اور کو اپنا نجات دہندہ نہیں سمجھتے جو کچھ انھیں حاصل ہے اس کا وہ اپنے آپ کو حقدار سمجھتے ہیں، اور اسے کسی رہنما یا کسی سیاسی پارٹی کی دین نہیں سمجھتے۔ برطانیہ میں آپ کرکٹ کے کھلاڑیوں کی تعریف سن سکتے ہیں، فن کاروں کی تعریف سن سکتے ہیں اور سنکیوں تک کے حق میں نعرہ ہائے تحسین سن سکتے ہیں لیکن اپنے سیاسیین کی بیجا تعریف وہ کبھی نہیں کرتے۔ ہم لوگ جو بت سازی اور بت پرستی کے خوگر ہیں، انھیں ناشکرے پن کا طعنہ دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ ان کے جمہوری نظام کی غیر معمولی کامیابی میں ان کی اس افتادِ طبع کو بہت دخل ہے۔ برطانیہ جا کر محسوس ہوتا ہے کہ جمہوریت کسی آئینی نظام کا نام نہیں بلکہ ایک قوم کے اجتماعی مزاج کا نام ہے۔ برطانیہ میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں پڑا جو اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتا ہو۔ ہر شخص شدید سے شدید اختلاف رائے رکھنے والے کے متعلق بھی یہ خوش گمانی رکھتا ہے کہ ممکن ہے وہ راستی پر ہو۔ اس رواداری کا نتیجہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ خود غیر متقلدین کی بھی قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے۔ جون سٹریچی کسی وقت بڑے ہی جید غیر متقلد تھے۔ ان کی کتاب "تھیوری اینڈ پریکٹس آف سوشلزم" ہندوستان میں بھی بڑی مقبول رہی ہے اور اکثر و بیشتر ہندوستانی سوشلسٹوں کے عقائد کا ماخذ یہی کتاب ہے۔ جون سٹریچی سوشلسٹ اب بھی ہیں لیکن ان کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق آگیا ہے۔ اب ان کے نزدیک سوشلزم کا مقصد اونچے ٹیکس اور عوام کو زندگی کی بہتر

آسائشیں دینا ہے اور اس معاملے میں کنزرویٹیو پارٹی کے ممبر بھی ان کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔

برطانویوں کی یہ ادا بھی کچھ کم دلکش نہیں کہ وہ صداقت کا غیر معمولی احترام کرتے ہیں اور ماضی کی کسی بھی حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کرتے۔ کنزرویٹیو ممبر مسٹر فرینک ہیرسن ایم۔ پی۔ اسی جب ہمیں پارلیمانی ایوانوں کی سیر کرا رہے تھے تو انھوں نے اس پتھر کی خاص طور پر نشان دہی کی جس پر کھڑے ہو کر چارلس اوّل نے آخری فیصلہ سنا تھا۔ ایڈنبرگ میں قلعے اور شاہی محل دکھاتے وقت ہمارے رہنماؤں نے کوئن میری کی زندگی اور اس کے انجام کی تمام تر جزئیات بیان کر دیں۔

تاریخ کو وقت کے جدید مطالبوں کے سانچوں میں ڈھالنے کا عمل برطانیہ میں بالکل نہیں ہوتا۔ جون آف آرک کی کہانی سناتے وقت اسکول کے بچوں تک کو یہ بتا دیا جاتا ہے کہ ان کی قوم نے فرانسیسیوں کے ساتھ یہ زیادتیاں کیں۔ رومیوں کے سامراج سے برطانویوں کو جو جو فائدے پہنچے ان کا اعلان بڑی ہی کشادہ دلی سے کیا جاتا ہے۔ سینٹ پارک کے گرجے میں ان تمام امریکیوں کے نام سکرول آف آنر میں درج ہیں جو دوسری جنگِ عظیم میں شہید ہوئے۔ جنگ کے دوران میں برطانوی ہوٹلوں میں امریکی بار قایم ہوئے تھے۔ یہ بار اب بھی جوں کے توں قائم ہیں اور برطانوی ڈرائی مارٹینی مزے لے لے کے پیتے ہیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جس طرح برطانوی دوسرے ملکوں کے روابط پر نازاں ہیں اور رومن اقتدار کے مثبت پہلوؤں کی کھلے دل سے تعریف کر دیتے ہیں کیا اسی طرح ہم لوگ بھی ان بے شمار فائدوں کا ذکر اتنی ہی فراخدلی سے کر سکتے ہیں جو برطانوی اقتدار سے ہمارے ملک کو پہنچے۔

اختلافات کو برداشت کرنے اور ہر موضوع پر آزادانہ بحث کی عادت نے اور یکجہتی اور انفرادیت کے فروغ میں جو حصہ لیا ہے اور اس سے حیاتِ اجتماعی کو جو فائدے پہنچے ہیں ان کے بیان کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ برطانوی نہ کسی بات کو طے شدہ سمجھتے ہیں اور نہ بحث و تمحیص سے ماورا۔ شاہی خاندان کو بھی بحث سے اسی حد تک ماورا سمجھا جاتا ہے کہ ملکۂ معظمہ کی ذات کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا جاتا۔ شاہی خاندان کے تمام افراد پر اس استثناء کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ملکۂ معظمہ کے شوہر پرنس فلپ پر لارڈ وییر بروک کا اخبار "ایکسپریس" آزادانہ تنقید کرتا ہے یہ جاننا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہو گا کہ "ایکسپریس" کی شکایت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ پرنس فلپ کامن ویلتھ پر یورپ کو ترجیح دیتے ہیں اور لارڈ وییر بروک اور ان کا اخبار کامن ویلتھ کے زیادہ حامی ہیں۔ ایک اور کنزرویٹیو اخبار "ڈیلی میل" کی پیشانی پر یہ نعرہ نمایاں طور پر درج ہوتا ہے۔ فار کوئن اینڈ کامن ویلتھ۔

برطانیہ میں ہر معاملے پر اختلافِ رائے نظر آیا لیکن ایک معاملے میں سیاست دانوں ہی کو نہیں بلکہ عام لوگوں کو بھی متحد الخیال پایا۔ یہ ہندوستان کے تئیں خیر سگالی کا جذبہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کامن ویلتھ کے تمام ملکوں میں سے ہندوستان کو خاص طور پر توجہ اور تعریف کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ہر معاملے میں ہمارے ہم خیال بھی ہوں۔

برطانویوں کی صرف ایک ادا پسند نہیں آئی۔ وہ اپنے موسم کی جو میرے نقطۂ نگاہ سے بڑا ہی قابلِ ستائش تھا، شکایت کرتے رہتے تھے۔ اب جب دلی کی ناقابلِ برداشت گرمی میں بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو ان کے

شکوۂ موسم پر اور بھی حیرت ہو رہی ہے :

از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

(۲)

دیوارِ برلن

برلن کے خطِ تقسیم پر ایک سہ منزلہ عمارت کے نیچے سڑک کی پٹری پر ایک معمولی سی یادگار قائم ہے۔ ہم یہاں سے دو بار گزرے اور دونوں بار ہم نے دیکھا کہ وہاں راہ گیروں کے چڑھائے ہوئے پھول موجود ہیں۔ اس یادگار کے ساتھ ایک کتبہ چسپاں ہے جس پر لکھا ہوا ہے :

اولگا سیگلر

وفات :	پیدائش :
۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء	۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء

اس بوڑھی عورت نے کمیونزم سے نجات حاصل کرنے کے لیے تیسری منزل کی چھت سے چھلانگ لگا دی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ آزاد برلن میں پہنچنے کی بجائے موت کی آغوش میں چلی گئی۔ اسی چھت سے ایک نو سالہ بچے نے بھی چھلانگ لگائی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے آزاد برلن کا فائر بریگیڈ وہاں پہنچ گیا اور اس بچے کو جال پر لے لیا۔

سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے خطِ تقسیم پر ایسی عمارتیں قدم قدم پر موجود ہیں جن کی کھڑکیاں اور دروازے آزاد برلن کی طرف کھلتے ہیں۔ کبھی ان کھڑکیوں اور دروازوں سے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگ کمیونزم سے بھاگ کر آزاد برلن میں پہنچ جاتے تھے لیکن اب ان کھڑکیوں اور دروازوں میں اینٹیں چن کر انھیں بند کر دیا گیا ہے۔ خطِ تقسیم کی جگہ مضبوط دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔ اس دیوار سے چند گز کے فاصلے پر کانٹے دار تاروں کی باڑ ہے اور ان دونوں کے درمیان بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔ قدم قدم پر مسلح کمیونسٹوں کے پہرے ہیں۔ اپنی دانست میں کمیونسٹ حکمرانوں نے اس کا پورا اہتمام کر لیا ہے کہ مشرقی برلن کا کوئی باشندہ ان کے دامِ جبر سے نجات حاصل نہ کر سکے لیکن جرمنوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ اتنی شدید ہے اور جبر کی زنجیریں ان کے لیے اس حد تک ناقابلِ برداشت ہیں کہ ان تمام پابندیوں کے باوجود ہر روز کچھ لوگ راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کئی لوگ تو اس کوشش میں اپنی جان بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ اس قسم کے دو نوجوانوں سے جو حال ہی میں فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے میں نے اپنے دوست اور ہمسفر جناب پی۔ سی گپتا ایڈیٹر "جاگرن" کے ہمراہ شرنارتھی کیمپ میں ملاقات بھی کی۔ گفتگو میں میں نے ان سے پوچھا کہ کیا بھاگتے وقت انھیں

اس بات کا احساس تھا کہ اس کوشش میں وہ اپنی جان گنوا سکتے ہیں۔ انھوں نے ہاں میں جواب دیا۔ یہ صحیح ہے کہ آزاد برلن میں ان کا مستقبل روشن ہوگا۔ حکومت انھیں تعلیم مکمل کرنے کے لیے ڈھائی سو مارک ماہانہ کا وظیفہ دے گی اور ملازمت تو جرمنی میں ہر کس و ناکس کو مل جاتی ہے لیکن راہِ فرار اختیار کرتے وقت انھیں ان سب باتوں کا علم ہرگز نہیں تھا۔ اس وقت ان کے دل میں صرف ایک جذبہ تھا کہ جیسے بھی ہو کمیونزم کے پنجۂ جبر سے نجات حاصل کر جائیں خواہ اس کوشش سے انھیں جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔[1]

برلن کو تقسیم کرنے والی دیوار کو میں نے اِس سرے سے اُس سرے تک دیکھا ہے۔ اس مصنوعی خطِ تقسیم کو ختم کرنے کی راہ میں جتنی سیاسی مشکلیں حائل ہیں انھیں بھی میں نے کئی بار سنا ہے لیکن اس دیوار کو دیکھنے کے بعد سیاسی استدلال بے معنی نظر آنے لگتا ہے اور صرف اس کا کرب ناک انسانی پہلوؤں کو مسلنے لگتا ہے۔ آزاد برلن میں زندگی کی گہما گہمی وہاں کی خوش حالی اور حیرت انگیز تعمیری کارنامے دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے لیکن اس خوش حالی کے باوجود اس دیوار کا تصور جرمنوں کو افسردہ کر دیتا ہے اور ہر اُس زائر کو بھی جسے اس دیوار کو دیکھنے کا موقع ملے۔

دیوار کو دیکھنے کے بعد اشتیاق پیدا ہوا کہ دیوار کے اُس طرف کے بھی حالات دیکھے جائیں۔ چنانچہ میں کمیونسٹ چوکی سے ویزا لے کر برلن کے کمیونسٹ حصّے میں بھی گیا۔ چند قدم چل کر ہی ایک نمایاں تضاد کا احساس ہوا۔ جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر موجود ہیں۔ اسٹالن ایلے (جو اسٹالن کے مردوم و تار ہونے کے بعد اب مارکس ایلے بن گئی ہے) کے سوا کہیں بھی تعمیرِ جدید کے آثار نہیں دکھائی دیتے۔ دیواروں پر روغن و رنگ کا نام نہیں۔ سڑکوں پر آمد و رفت برائے نام ہے۔ بسوں تک میں مسافروں کی تعداد انتہائی قلیل ہوتی ہے۔ ٹیکسی کئی فرلانگ چلنے کے بعد ملی۔ لیکن جس چیز نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اقتصادی زبوں حالی نہیں تھی بلکہ راہ گیروں کے چہروں پر مسرت کا فقدان تھا۔ میں نے اتنے بے حس چہرے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ گھومتے گھماتے ایک جرمن لڑکے سے معمولی واقفیت ہوگئی جو تھوڑی بہت انگریزی بول سکتا تھا۔ اس نے ہمیں کئی جگہیں دکھائیں۔ تھیٹر کے پاس سے گزرے تو میں نے پوچھا:

"بیلے ہے؟"

---

[1] میں ۱۰ اپریل کو برلن سے دلی پہنچا تھا۔ ۱۹ اپریل کے "ہندوستان ٹائمز" میں یہ خبر پڑھی:

برلن ۱۸ اپریل: مشرقی جرمنی کی پولیس کی گولیوں سے ایک شہری ہلاک ہوگیا اور عوامی فوج کے کم از کم دو سپاہی شدید طور پر زخمی ہوئے۔ وہ بھاگ کر برلن کے مغربی حصّے میں جانا چاہتے تھے۔

۲۴ سالہ شہری نے لاری میں بیٹھ کر سرحد عبور کرنے کی کوشش کی۔ اس پر پیچھے سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ لاری مغربی حصّے کی دیوار سے ٹکرا گئی۔ چلانے والا تعاقب کرنے والی گولیوں کا نشانہ بن چکا تھا۔

جن دو سپاہیوں نے فرار کی کوشش کی ان میں سے ایک مشرقی جرمنی کی سرحد کے اندر ہی ڈھیر ہوگیا لیکن دوسرا سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

لڑکے نے جواب دیا: "سٹیٹ بیلیے - نو بورژوا بیلیے - بورژوا بیلیے امریکہ۔"

کچھ دیر کے بعد اس لڑکے نے کہا: "گڈ سگرٹس" میں نے اسے سگریٹ پیش کیا تو اس نے کہا: "تھری مور، سموک سنڈے، سموک نیکسٹ ویک۔" میں نے اسے کچھ اور سگریٹ دیے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ "بورژوا" اور "گڈ" کو مترادف الفاظ سمجھ رہا تھا۔ اور کوئی عجب نہیں کہ وہ کسی دن جان کی بازی لگا کر بورژوا نظام حیات کی طرف فرار کر جائے۔

بون سے برلن تک کا سفر بڑا ہی خوش گوار تھا اور برلن سے فرانک فورٹ تک کا جو سفر ہم نے کشتی پر طے کیا اس کی خوش گواریاں تو پوری طرح بیان بھی نہیں ہو سکتیں۔ ایک قوم جو ابھی کل مفتوح تھی اب اپنے جھٹکے سے گرد ہزیمت جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور تعمیر و ترقی میں دوسری کئی قوموں کو پیچھے چھوڑ رہی ہے۔ ان سب باتوں کو دیکھ کر دل واقعی خوش ہوتا تھا اور یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوتی تھی کہ جرمن اپنے سابق حریفوں خصوصاً امریکنوں کی فراخدلانہ مدد کا کھلے دل سے اعتراف کر رہے ہیں لیکن خطِ تقسیم پر پہنچ کر اور کمیونسٹ برلن میں داخل ہو کر یہ تمام احساسات دل سے زائل ہو جاتے ہیں۔ اور صرف غم اور افسوس کا احساس دل پر مسلط ہو جاتا ہے۔ یہ خطِ تقسیم انسانی ضمیر کے نام ایک چیلنج ہے۔ جب تک جبر کی یہ دیوار منہدم نہیں ہوتی ضمیر انسانی کو آسودگی کا حق نہیں پہنچتا۔

——— مئی ۱۹۶۲ء

شاعری

سر میں ہوائے دشتِ جنوں ہے بھری ہوئی
شہرِ خرد کی خاک مگر چھانتا ہوں میں

ڈاکٹر وزیر آغا

گوپال مِتّل کی شاعری

گوپال مِتّل کی کئی حیثیتیں ہیں۔ ان کی ایک حیثیت مدیر کی ہے، دوسری بھارت میں اُردو زبان کے ایک اہم ستون کی اور تیسری حیثیت ایک پختہ فکر اور خوش گفتار شاعر کی! بحیثیت مدیر انھوں نے "تحریک" کے ذریعے نہ صرف اُردو زبان اور ادب کی ترویج اور اشاعت میں بھرپور حصہ لیا ہے بلکہ ہمیشہ ادب میں متشدد رویّوں کو توازن سے مملو کرنے کی ضرورت پر زور بھی دیا ہے۔ افسوس کہ "تحریک" اب بند ہو چکا ہے مگر اُردو ادب اور صحافت کی تاریخ میں اس کا ذکر ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اسی طرح انھوں نے ایک طویل مدّت تک، نامساعد حالات کی پروا نہ کرتے ہوئے، نہ صرف بھارت میں اُردو زبان کا علَم بلند کیے رکھا بلکہ زبان کے معاملے میں تنگ نظری اور تعصب کی ہمیشہ مذمت بھی کی۔ اگر آج بھارت میں اُردو زبان زندہ ہے اور روز بہ روز اس میں استحکام پیدا ہو رہا ہے تو اس کا سہرا گوپال مِتّل اور ان ایسی چند جاں باز ہستیوں ہی کے سر ہے جنھوں نے اُردو زبان کی بقا کے لیے اپنی زندگیاں تک وقف کر دیں۔ مگر ان دو نہایت اہم حیثیتوں کے علاوہ گوپال مِتّل کی ایک اور حیثیت بھی ہے اور وہ حیثیت ہے ایک شاعر کی۔ دیکھنا چاہیے کہ اس میدان میں ان کی کارکردگی کا معیار کیا ہے!

گوپال مِتّل نے اپنے شعری مجموعے کا نام "صحرا میں اذان" رکھا ہے۔ اگر گوپال مِتّل

کے کلام کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ نام ان کی شاعری کی کلیدی علامت کو سامنے لاتا ہے محض رسمی انداز میں تجویز نہیں ہوا ہے۔ یہ کلیدی علامت نہ محض صحرا ہے اور نہ محض اذان، بلکہ صحرا سے اُٹھنے والی وہ اذان ہے جس میں بلاوا بھی ہے اور نوید بھی! اس کے مقابلہ میں "صدا بہ صحرا" کی ترکیب پر غور کیجیے تو اس سے ایک عجیب سی بے بسی مترشح ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مسافر صحرا میں رستہ بھول گیا ہے اور اب ریت کے سمندر میں ایک بے پتوار کشتی کی طرح ڈول رہا ہے۔ جب اسے دور دور تک زندگی کا کوئی نشان تک نظر نہیں آتا اور ریگِ رواں کے جہنم سے باہر نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ نیز جب اُسے زمین بے آب اور آسمان بے چراغ نظر آتا ہے تو مرتا ہوا یہ شخص اپنی آخری صدا میں بدن کی ساری قوت کو سمو کر اسے چہار اکناف میں پھیلاتا ہے کہ شاید اس کے جواب میں کوئی آواز اُبھر آئے مگر یہ صدا بار بار آسمان کے گنبد سے ٹکرا کر ایک صدائے باز گشت میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور بالآخر مسافر کو مایوسی کی ظلمتوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ "صدا بصحرا" مسافر کی تنہائی کا استعارہ بھی ہے اور اس کی بے بسی کی علامت بھی! اور شاید اس سے زیادہ کرب انگیز صورتِ حال کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ دوسری طرف "صحرا میں اذان" نہ صرف ایک پُر اعتماد لہجے کی غماز ہے بلکہ اس عزم کے ساتھ بلند ہوتی ہے کہ وہ صحرا میں بھٹکے ہوئے مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی اور وہ پروانوں کی طرح اس "شمع" کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ اذان میں بلاوا ہے، ایک رُوحانی تجربے سے مستفید ہونے کی دعوت ہے۔ یہ آواز بتاتی ہے کہ جس شخص کی یہ آواز ہے وہ کسی تنہائی یا بے بسی کا شکار نہیں بلکہ پورے عزم، اعتماد اور قوت کے ساتھ ایک بلند جگہ پر کھڑا ہے۔ شاید کچھ لوگ پہلے ہی اُس کے گرد جمع ہو چکے ہیں مگر وہ چاہتا ہے کہ جہاں تک اس کی آواز جائے وہ لوگوں کو سمیٹ کر اس کے پاس پہنچا دے۔ مگر صحرا کی اس اذان کا ایک اور پہلو بھی ہے ——— وہ یہ کہ صحرا کی یہ اذان دراصل فجر کی اذان ہے اور اس اعتبار سے صحرا کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سپیدۂ سحر کی آمد کا اعلان بھی ہے۔ گوپال مِتّل کی شاعری میں گہرے اندھیروں کی کوکھ میں جو ایک ننھی سی ایک کرن دکھائی دیتی ہے وہ فجر کی اذان ہی سے منسلک اور مربوط ہے۔

گوپال مِتّل کے ہاں اندھیرے کی کوکھ سے روشنی کی نمود یا کم از کم روشنی کی نوید ان کی نظم صبحِ کاذب کا موضوع ہے:

یہ جو اک نور کی ہلکی سی کرن پھوٹی ہے
کون کہتا ہے اسے صبحِ درخشاں اے دوست
مجھ کو احساس ہے، باقی ہے شبِ تار ابھی
لیکن اے دوست مجھے رقصِ تو کر لینے دے
کم سے کم نور نے اُٹھا تو ہے اک بارِ نقاب

ایک لمحے کو تو ٹوٹا ہے طلسمِ شبِ تار
اس سے ثابت تو ہُوا صبح بھی ہو سکتی ہے
پردۂ ظلمتِ شب چاک بھی ہو سکتا ہے
صبحِ کاذب بھی تو ہے اصل میں دیباچۂ صبح
صبحِ کاذب بھی تو ہے صبحِ درخشاں کی نوید
ایک اعلان کہ ہنگامِ وداعِ شب ہے
قافلہ نورِ سحر کا ہے بہت ہی نزدیک
جلد ہونے کو ہے خورشیدِ درخشاں کی نمود

اسی طرح ان کی نظم "شب تاب" میں بھی روشنی کی نوید واضح طور پر موجود ہے:

دیکھ اس فرش کو جو ظلمتِ شب کے باوصف
روشنی سے ابھی محروم نہیں ہے شاید
اک نہ اک ذرہ یہاں اب بھی دمکتا ہوگا
کوئی جگنو کسی گوشے میں چمکتا ہوگا
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی

ان کی متعدد دوسری نظموں اور غزلیہ اشعار میں روشنی کی طلب اس قدر تو انا ہے کہ روشنی کی نمود کا احساس بظاہر دب سا گیا ہے۔ مگر بین السطور صاف محسوس ہوتا ہے کہ شاعر احساسی طور پر روشنی کے ذائقے سے آشنا ہے۔ ورنہ وہ اندھیرے کی مطلق العنانی پر اس شد و مد کے ساتھ نوحہ کناں کبھی نہ ہوتا مثلاً ان کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے جن میں روشنی کی طلب برہنہ ہو کر سامنے آگئی ہے:

نہ فلک پر کوئی تارا نہ زمیں پر جگنو
جو کرن نور کی ہے مات ہوئی جاتی ہے
کارگر یورشِ ظلمات ہوئی ہے کتنی
کیا ہمیشہ کے لیے رات ہوئی جاتی ہے

——— طلوعِ شب

دل جلانے سے کہاں دُور اندھیرا ہوگا
رات یہ وہ ہے کہ مشکل سے سویرا ہوگا

اجارہ دار تھے جو مشعلِ ہدایت کے
اب اپنے گھر میں ترستے ہیں روشنی کے لیے

بہت جی چاہتا ہے یہ فقط نقصِ بصارت ہو
بڑی سرعت سے دُنیا کھو رہی ہے دلکشی اپنی

(یہاں دلکشی دراصل روشنی ہی کی طرف ایک اشارہ ہے۔)

اندیشۂ رقیب میں ہوں لاکھ ظلمتیں!
نازاں ہیں ہم کہ اپنا مقدّر ہے چاندنی

نہ فرش پر کوئی جگنو نہ عرش پر تارا
کہیں بھی سوزِ تمنّا کا اب شرارا نہیں

جلاؤ شمعِ میخانہ کہ شاید روشنی پھیلے
بھیانک شب کا دیباچہ نہ ہو جو شام آتی ہے
تصوّر میں تمھاری یاد کے جگنو چمکتے ہیں
شبِ ہجراں فقط یہ روشنی ہی کام آتی ہے

بُجھ ہی جائے نہ کہیں دل کا چراغ
واقعی تند ہوا ہے اب تو

سوال یہ ہے کہ گوپال متّل "روشنی" سے کیا مُراد لیتے ہیں؟ کیا یہ روشنی محض ظلم، تشدد، منافقت اور تنگ نظری کے اندھیروں کو دُور کرنے کا ایک ذریعہ ہے یا ایک روحانی نشاۃ الثانیہ کو

وجود میں لانے کی ایک خواہش ہے۔ میرا یہ احساس ہے کہ گوپال متل روشنی کو ایک ایسے وسیع CONCEPT کے طور پر لائے ہیں کہ اس میں حیوانیت، جہالت اور تنگ نظری کے اندھیروں کو دور کرنے کی خواہش بھی مضمر ہے اور انسان کو روحانی طور پر منوّر دیکھنے کی آرزو بھی موجود ہے۔ گوپال متل محسوس کرتے ہیں کہ حالات نے روشنی کی اس لکیر کو مٹا دیا ہے جو انسانی تہذیب کا حسین ترین ثمر تھی۔ لہٰذا جہاں وہ روشنی کی آرزو کرتے ہیں وہاں روشنی کے گم ہو جانے پر نوحہ کناں بھی ہیں۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ہاں روشنی زیادہ تر جگنو اور ستارے کے پیکروں میں ابھری ہوئی نظر آتی ہے اور یہ دونوں پیکر رہبری کے لیے علامتی انداز میں استعمال ہوتے آئے ہیں۔ سمندری سفر میں قطب ستارہ اور تلاش و جستجو کی مہم میں جگنو کی کارکردگی اس بات پر دال ہے کہ روشنی منزل تک پہنچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ گوپال متل کے ہاں آخر آخر میں روشنی کا یہی کردار ابھرا ہے۔ یعنی وہ ظلمت کو ختم کرنے کے علاوہ مسافر کو منزل تک پہنچانے کے لیے ایک راہبر کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے۔

گوپال متل کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ اپنی ساری جاذبیت اور رسندرتا کے ساتھ موجود ہے مگر انھوں نے جا بجا نئی غزل کی زبان کو بھی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ان کی غزل میں قدیم اور جدید کا ایسا امتزاج موجود ہے جو بہت لطف دیتا ہے۔ ہر شاعر کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی دوسرے شاعر سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ گوپال متل بھی اپنی شاعری کے درمیانی دور میں کچھ شاعروں کے اسلوب سے متاثر ہوئے بالخصوص ان کے ہاں فیض کے اسلوب (مواد نہیں) کے اثرات موجود ہیں۔ مثلاً ان کی نظم "سلام ہو تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں" ذہن کو فیض کی ایک نظم کی طرف فی الفور منتقل کرتی ہے۔ اسی طرح ان کی غزل "خزاں چمن سے مرے بار بار گزری ہے" بھی فیض کے اثرات کی غمّاز ہے۔ ان کی غزل میں بعض تراکیب مثلاً بارش

؎ متل صاحب پر فیض کے اثرات کی نشاندہی کے سلسلے میں ان کی ایک نظم اور ایک غزل کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے یہ ایک تردیدی نظم ہے۔ یہ نظم اس وقت لکھی گئی تھی جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ کمیونسٹ جب کسی ملک پر حملہ کرتے ہیں تو اپنے آپ کو اس ملک کا نجات دہندہ قرار دیتے ہیں۔ فیض کی نظم کا مجموعی تاثر بھی یہی ہے کہ غیر کمیونسٹ معاشروں میں شخصی آزادیوں کا فقدان ہے۔ متل صاحب نے یہ انداز قصداً اپنایا تھا۔ متل صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کمیونسٹ آزادی کے نہیں بلکہ غلامی کے نقیب ہیں اس لیے انھوں نے قصداً فیض کے پہلے مصرعے سے استفادہ کیا۔

اسی طرح کی ایک تردیدی نظم جوش نے بھی لکھی ہے۔ فیض کا مصرعہ ہے: 'چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز' جوش نے یہ مصرعہ بعینہٖ لے لیا ہے لیکن دونوں نظموں میں مماثلت صرف اسی حد تک ہے۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے، دونوں غزلوں میں مماثلت صرف اس حد تک ہے کہ وہ ایک ہی زمین میں کہی گئی ہیں۔ ہم طرح غزلوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ ان دو شعروں سے لگایا جا سکتا ہے جو ایک ہی مشاعرے میں پڑھے گئے تھے:

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا ۔۔۔ عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

پوچھا نہ جائے گا جو چمن سے نکل گیا ۔۔۔ بیکار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا

(مرتب)

سنگ'' 'کوئے ملامت'' 'دار ورسن' 'غمِ روزگار' نیز قاتل اور مقتل کے تلازمے فیض کے اسلوب شعر سے شاعر کے تعلقِ خاطر کو ظاہر کرتے ہیں مگر گوپال مِتّل نے بہت جلد خود کو فیض کے اثرات سے نجات دلائی اور شاعری میں اپنی آواز دریافت کرلی۔ مثلاً ان کے یہ غزلیہ اشعار دیکھیے جو گوپال مِتّل کی انفرادیت کو سامنے لاتے ہیں :

منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں

اگر تم ہنس دیے احوالِ دل پر کیا تعجب ہے
کہ میں خود بھی بمشکل ضبط کرتا ہوں ہنسی اپنی

پورے ملبوس میں اس شخص کو ننگا دیکھو
چشمِ بینا ہے تو پھر یہ بھی تماشا دیکھو

وضعداری محبّت کے منافی ہے تو ہو
آج کالر پہ نیا پھول سجایا جائے

گوپال مِتّل کی یہ آواز، یہ انفرادیت، غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظموں میں زیادہ توانائی کے ساتھ اُبھری ہے۔ ان کی بعض نظمیں تو اتنی اچھی ہیں کہ جدید اردو نظم کے کڑے سے کڑے انتخاب میں بھی اپنے لیے جگہ بنا لیں گی۔ ان نظموں میں نہ صرف زاویۂ نگاہ ہی نیا ہے بلکہ اسلوب بھی تازہ ہیں اور امیجز بھی انوکھے ہیں۔ مثلاً ان کی ایک خوبصورت نظم دیکھیے : ——————

درد اک ناخواندہ مہماں تھا
اگر رخصت ہوا
یاس کا اس میں کوئی پہلو نہ تھا
لیکن اے دل
اے عجوبہ کار دل

تُو تو یوں حرماں زدہ ہے
چھٹ گیا ہو جیسے کوئی یارِ غار
یہ جو اک جھونکا مسرت کا در آیا ہے
مجھے معلوم ہے
ہے تری عمرِ ریاضت کا صلہ
لیکن اے دل، اے عجوبہ کار دل
اب تجھے ہونے لگا اقتاد کا اس پر گماں
آہ اے دل
اے عجوبہ کار دل
برس کے کہنہ مریض
اپنے زخموں سے محبت ہے تجھے!

جس طرح پھول کی سب سے بڑی پہچان اس کی خوشبو ہے اس طرح شاعر کی سب سے بڑی پہچان اس کی آواز ہے۔ اکثر شعراء عمر بھر دوسروں کی آواز میں شعر کہتے ہیں اور اپنی آواز کو دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ گوپال مِتل کی شاعری کو دیکھ کر یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح انھوں نے ظلمتوں کے خلاف ایک جہاد کیا تاکہ روشنی تک رسائی پا سکیں اسی طرح انھوں نے مقبول اور رائج اسالیب بیاں سے بھی نجات حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ اپنا اسلوب دریافت کر سکیں۔ یوں دیکھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ گوپال مِتل کے ہاں روشنی کی تلاش دراصل ایک نئے پیرایۂ اظہار کی تلاش بھی تھی۔ کیسی خوشی کی بات ہے کہ وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

●●

بلراج کومل

جذبوں کی صداقت کا شاعر

گوپال متل سے میری ملاقات تقسیمِ ہند کے بعد دہلی میں ہوئی۔ سنا ہے تقسیمِ ہند سے قبل ان کی شخصیت کے ساتھ ایک مخصوص طرزِ حیات وابستہ تھا جس کی بنیاد پر شاید اس وقت کی وابستگیاں اور بدلتی ہوئی اقدار تھیں۔ دہلی میں جب وہ رفتہ رفتہ اپنی جڑیں مضبوط کرنے میں کامیاب ہوئے تو ان کے اردگرد ایک داستان تشکیل پانے لگی۔ اس داستان میں حقیقت اور "اساطیری آمیزشیں" کچھ اس طرح گڈمڈ ہوگئیں کہ گوپال متل کی مختلف الجہت داستان میں سے شاعر گوپال متل کی شناخت رفتہ رفتہ مشکل تر ہوتی گئی۔ گوپال متل نے اپنی سطح پر بطور شاعر اپنے آپ کو خوش گوار وقتوں میں زندہ تو رکھا لیکن شاعر کو مکمل انسان پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوپال متل کی شخصیت کے وہ حصے زیادہ نمایاں ہوتے گئے جو سراسر نثری نوعیت کے تھے اور کسی حد نقطۂ نظر کے حصارِ جبر میں تھے اور حصارِ جبر سے آزاد ہونے کے لیے کوشاں تھے۔

گوپال متل انتہائی کم گو شاعر ہیں۔ ان کی داستان کے الجھاوے میں سے ان کی بازیافت کرنے کے بعد جب میں ان کی نظموں اور غزلوں کا مطالعہ کرتا ہوں تو وہ مجھے بطور شاعر بھی زمین کے اتنے ہی قریب نظر آتے ہیں جس طرح وہ بطور معززشہری زمین کے قریب ہیں۔ شاعری کی سطح پر وہ جو باتیں کرتے ہیں، وہ سراسر ارضی باتیں ہیں۔ ماورائی اور جہانِ دگر کی باتیں نہیں ہیں وہ دنیا کو اس کی تمام تر قباحتوں خباثتوں کے ساتھ قبول کرنے کے بعد اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ روح وجسم دنیا اور مافیہا

ان کے ہاں نہ تو مختلف النوع اکائیاں ہیں نہ دانشورانہ مفروضے۔ وہ نہ تو راہِ نجات کے شاعر ہیں اور نہ ہی ناگزیر انہدام کے۔ وہ محرک کا اور اجتہاد کی نفی بھی نہیں کرتے اور نہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔ جس انداز سے وہ زندگی قبول کرتے ہیں وہ غالباً اس امکان کی طرف اشارہ ہے کہ زندگی کے تسلسل کے لیے کسی نہ کسی صورت میں کوئی نہ کوئی جواز دستورِ کائنات میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوگا۔

سماجی جانور زندگی کے لیے مصرف تلاش کرتا ہے۔ منزل تلاش کرتا ہے۔ گوپال مِتّل قبول کی اس سطح سے ہر قدم اُٹھاتے ہیں کہ مصرف اور منزل نہ ہونے کے باوجود وہ آشوبِ سفر میں مبتلا ہیں:

منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں

محمل بھی نہیں کوئی نظر میں
صحرا کی بھی خاک چھانتا ہوں

اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب
اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

یہ مسئلہ خود مرکزیت کا نہیں ہے۔ قبولیت کے مدارج طے کرنے کا مسئلہ ہے۔

گوپال مِتّل کے ہاں معاشرتی اور سماجی عناصر کا ردِعمل جذبوں کی پاکیزگی اور صداقت کا اظہار بن کر اجاگر ہوا ہے۔ وہ رجائیت اور قنوطیت کی حد بندیوں کے اسیر نہیں ہیں۔ وہ صرف اس صورت حال کے شاعر ہیں جو وجود انسان کے تضادات کو مکمل طور پر قبول کر چکنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ یہ اعلان تو شاید صحیح نہیں ہے کہ: "مر گیا اے وائے شیطاں مر گیا"

لیکن یہ امکان شاید صحیح ہے:

آسماں سے اب نہ اُترے گی کتاب

اور یہ اندیشہ ——— شاید ایک بہت بڑے استفہام کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے:

نہ فلک پر کوئی تارا نہ زمیں پر جگنو
جو کرن نور کی ہے مات ہوئی جاتی ہے

گوپال مِتّل کی اکثر نظمیں عنوان سے محروم ہیں۔ پابند نظمیں بھی اور آزاد نظمیں بھی۔ پابند نظمیں مرصع ہیں اور تراشیدہ۔ آزاد نظمیں زاویوں سے بھرپور۔ گوپال مِتّل انسانی رشتوں کا ذکر عمومی انداز میں بھی کرتے ہیں اور نجی تجربات کی زبان میں بھی۔ ان کا لب و لہجہ ان کی متوازن شائستہ اور کلاسیکی شان لیے ہوئے ہے۔ ان کے ہاں آزاد نظم کے تجربوں میں جو خصوصیت متوجہ کرتی ہے وہ نظموں میں ایجاز و اختصار کی کارفرمائی ہے:

یوں اچانک ملاقات تجھ سے ہوئی

جیسے رہ گیر کو
بے طلب
بے دعا
راہ میں ایک انمول موتی ملے
اور ہنگامِ رخصت یہ احساس ہے
جیسے مردِ جفاکشی کا اندوختہ
حاصلِ محنتِ زندگی
راہزن چھین لیں
جیسے زاہد کو پیری میں احساس ہو
عمر بھر کی ریاضت اکارت گئی

گوپال متل کی غزل سراسر کلاسیکی تزئین و آرائش اور رکھ رکھاؤ کی غزل ہے۔ وہ چابک دستی اور کاری گری کی نزاکتوں کا احتراز کرتے ہیں۔ ان کے اشعار اس حسیت سے اخذ نور کرتے ہیں جو ان کے پورے کلام میں جلوہ فرما ہے۔ زندگی کے فنکارانہ ادراک کی شکل میں :

بہت جی چاہتا ہے یہ فقط نقصِ بصارت ہو
بڑی سرعت سے دُنیا کھو رہی ہے دلکشی اپنی

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

دل، دل سے مل سکے یہ بڑی بات ہے مگر
فی الحال یہ دعا ہے نظر سے نظر ملے

سینے کو اپنے اپنا گریباں بنا کے ہم
قائل نہیں ہیں پیرہن تار تار کے!

سینے کو اپنے اپنا گریباں بنانا۔ وجود کے ادراک کا مشکل ترین مرحلہ ہے۔ گوپال متل، صحافیانہ انداز کے مخالف ہونے کے باوجود نوکِ سناں کا ذکر بھی کرتے ہیں اور صبح کا رب کا بھی تضادات سے گزرتے ہوئے غالب انداز میں وہ جس حسیت کا اظہار کرتے ہیں وہ دراصل شعری ردِ عمل کی حسیت ہے۔ اگر وہ نقطۂ نظر کی اسیر ہوتی تو شاید اسی قسم کے نتائج

مرتب کرتی جس قسم کے نتائج وہ شعر میں کرتے رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کے لیے قابلِ قبول، کچھ کے لیے ناقابلِ قبول۔

گوپال متل کے ہاں زندگی کا ادراک سراسر شاعرانہ ہے اور اپنے محدود دائرۂ کار کے باوجود ہمہ گیر اور وابستگیوں سے بھرپور ہے۔ "شب تاب" غالباً گوپال متل کی شعری حسیت کا مکمل اظہار ہے۔ مناسب یہی ہے کہ میں قارئین کے سامنے پوری نظم پیش کروں۔ نظم کا عنوان ہے "شب تاب":

یہ برستا ہوا موسم، یہ شبِ تیرہ و تار
کسی مدھم سے ستارے کی ضیا بھی تو نہیں
اُف یہ ویرانیِ ماحول یہ ویرانیِ دل

آسمانوں سے کبھی نور بھی برسا ہوگا
برقِ الہام بھی لہرا گئی ہوگی شاید
لیکن اب دیدۂ حسرت سوئے عرش نہ دیکھ
اب وہاں ایک اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

دیکھ اس فرش کو جو ظلمتِ شب کے باوصف
روشنی سے ابھی محروم نہیں ہے شاید
اک نہ اک ذرہ یہاں بھی تو دمکتا ہوگا
کوئی جگنو کسی گوشے میں چمکتا ہوگا
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی

کسی جانباز کے ماتھے پہ شہادت کا جلال
کسی مجبور کے سینے میں بغاوت کی ترنگ
کسی دوشیزہ کے ہونٹوں پہ تبسم کی لکیر
قلبِ عشاق میں محبوب سے ملنے کی اُمنگ
دلِ زہاد میں ناکردہ گناہوں کی خلش
دل میں اک فاحشہ کے پہلی محبت کا خیال
کہیں احساس کا شعلہ ہی فروزاں ہوگا
کہیں افکار کی قندیل ہی روشن ہوگی

کوئی جگنو، کوئی ذرّہ تو دمکتا ہوگا

یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی

مَیں نے شاعر گوپال مِتّل کو مختلف الجہت گوپال مِتّل کے مقبول عام تناظر سے الگ کرکے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی شخصیت کے اس حصے کا ذکر کیا ہے جو شاید ان کی شخصیت کا نازک ترین اور نفیس ترین حصہ ہے۔ ان کے ارد گرد رقص کرتی ہوئی داستان کے کون سے حصے کم تر ہیں اور کون سے بیش تر۔ اس کا فیصلہ ساعتوں کے مدارج میں خود بخود ہوتا رہے گا۔ میرے لیے یہی امکان بہت ہے کہ میری ذہنی وابستگی ان کی شخصیت کے نفیس ترین حصے سے برقرار ہے اور برقرار رہے گی۔ اور اس خوش گوار تجربے کے حصے دار اُردو شاعری اور اُردو ادب کے بیش تر قارئین رہیں گے۔

گوپال مِتّل نے بھرپور زندگی گزاری ہے۔

معاملاتِ عشق و خرد زندہ و برقرار ہیں۔ وہ حقیقت بھی زندہ و برقرار ہے جو روزِ اوّل شاعر کے نصیب میں لکھی گئی تھی۔ خدا کرے گوپال مِتّل انتہائے سفر تک سرشار و سرمست رہیں۔ اور معاملاتِ عشق و خرد سے نبرد آزما رہیں۔

۱۰ فروری ۱۹۸۲ء

ڈاکٹر عنوان چشتی

گوپال متّل : ــــــ نو کلاسیکی شاعر

اِس وقت اُردو شاعری تین دائروں پر محیط ہے۔ ایک دائرہ ترقی پسندی کا، دُوسرا جدیدیت کا اور تیسرا نو کلاسکیت کا ہے۔ ترقی پسندوں کا ایک خاص نظریۂ زندگی ہے۔ وہ حیات و کائنات کو جدلیاتی مادیت، تاریخی حقیقت، طبقاتی کشمکش اور اقتصادی رشتوں کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ اور ادب اور فن کو اس نظریہ کی روشنی میں زندگی کا ترجمان اور نقاد تصور کرتے ہیں۔ وہ ادب کے آزاد وجود کے بجائے اس کو شعوری عمل خیال کرتے ہیں۔ اس لیے اُن کی نگاہ میں زندگی کی ہمہ جہت معنویت پر ایک خاص نوع کی مقصدیت کو فضیلت حاصل ہے۔ ترقی پسند انسان کے وجود، اس کے مستقبل اور امکانات پر یقین رکھتے ہیں انھیں زندگی کے رجائی رُخ اور مثبت اقدار سے پیار ہے۔ اظہار کی سطح پر ترقی پسندوں نے اکثر اوقات رمزیت پر وضاحت کو ترجیح دی ہے۔ اور بعض اوقات وضاحت تبلیغ کے دائرے میں داخل ہو گئی ہے۔ اس اندازِ فکر نے جہاں شاعری کو گھٹن کے ماحول سے نکال کر، کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع دیا، اور ادب میں انسان بنیادی اکائی کی حیثیت سے اُبھرا، وہیں ادب کو نظریہ سازی کی محدودیت سے ہم کنار کیا۔ اور وضاحت زدگی سے ادبیت نیز تخلیقی پیرایوں کو نقصان پہنچا، یہ طرزِ فکر اور اندازِ اظہار اب اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ واضح ہے۔ جدیدیت نے اگرچہ اپنا رشتہ حلقۂ اربابِ ذوق سے ملایا، لیکن بنیادی طور پر جدیدیت کا میلان ترقی پسندی کی ضد بن کر اُبھرا۔ جدیدیت کے علمبرداروں نے ادب کی تخلیق کے سلسلے میں ہر قسم کے نظریۂ زندگی اور اس کی برکتوں کا

انکار کر دیا۔ انھوں نے ادب کے آزاد وجود پر وار کیا۔ انسانی ذہن کو ہر قید و بند سے مبرّا قرار دیا۔ انھوں نے انسانی زندگی کے المیوں، تنہائی، تشنج اور گھٹن کو قابلِ اعتنا خیال کیا۔ قدروں کے زوال کی نوحہ گری کی اور انسانی زندگی کے مستقبل سے مایوسی کا بے تحاشا اظہار کیا۔ انھوں نے اظہار کی سطح پر رمزیت سے کام لیا۔ بعض شاعروں نے تو رمزیت کے رشتے کو مہملیت سے ملا دیے۔ اظہار کی سطح پر نئی زبان تخلیق کرنے کے نام پر وہ گل کھلائے کہ "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے"۔

تیسرا دائرہ نوکلاسیکیت کا ہے۔ جو ان دونوں سے زیادہ قدیم ہے۔ نوکلاسیکی شاعروں نے ان دونوں سے الگ اپنی راہ نکالی۔ اُردو میں نوکلاسیکی شعرا کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اور جو ادب تخلیق ہوا ہے، اس کا بیشتر حصہ نوکلاسیکی ادیبوں کی کاوشوں کا رہینِ منت ہے۔ نوکلاسیکی شاعروں نے ترقی پسندوں اور جدیدیت کے علمبرداروں کی شدت پسندی سے کنارہ کشی کی۔ لیکن اپنی انفرادیت باقی رکھتے ہوئے اِن دونوں سے مثبت عناصر قبول کیے انھوں نے ایک طرف ترقی پسندوں کی نظریہ سازی اور گہری مقصدیت سے رشتہ توڑا تو دوسری طرف جدیدیت کے علمبرداروں کی منفی نظریہ سازی اور مہملیت سے منہ موڑ لیا۔ انھوں نے ادب کو زندگی کے وسیع پس منظر میں دیکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے وضاحت کی جگہ سادگی سلاست نیز سہلِ ممتنع سے کام لیا۔ نیز زبان کی شکست و ریخت اور اظہار کی مہملیت سے دامن بچا کر متوازن رمزیت اور تخلیقی پیرایۂ بیان اختیار کیا جس میں روایت کی روشنی اور تجربے کی تازگی دونوں چیزیں شامل ہیں۔ نوکلاسیکی شاعروں نے اپنا رشتہ کلاسیکی ادب سے نہ صرف باقی رکھا بلکہ روایت کے تمام زندہ عناصر کو قبول کر لیا۔ اور اپنے ذہن کے دریچے نئی ہواؤں کے لیے کھلے رکھے۔ انھوں نے اخذ و استفادہ کا عمل اظہار او رمعنی دونوں سطحوں پر جاری رکھا۔ میں گوپال متل صاحب کی شاعری کو پڑھ کر اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ ترقی پسند ہیں نہ جدیدیت کے علم بردار بلکہ نوکلاسیکی رجحان کے اہم شاعر ہیں۔ ترقی پسندی کے سلسلے میں اُن کا نقطۂ نظر واضح ہے۔ انھوں نے زندگی بھر اس کی مخالفت کی ہے۔ اس لیے انھیں ترقی پسند (سیاسی معنی میں) کہنا صریحاً ناانصافی ہے۔ لیکن جدیدیت کی ہم نوائی کے باوجود انھیں نام نہاد جدید شاعروں میں شمار کرنا بھی اتنی ہی بڑی زیادتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہاں بعض ایسے عناصر بھی ملتے ہیں، جو ترقی پسندوں اور جدیدیت کے علمبرداروں دونوں کے یہاں ملتے ہیں۔ لیکن ان کا سرچشمہ زندگی اور کلاسیکی ادب نیز ہمارا تہذیبی ورثہ ہے، نہ کہ ترقی پسندوں اور جدیدیت۔ جہاں تک ترقی پسندی کی تردید کا تعلق ہے وہ ان کی نثری تحریروں کے علاوہ ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ فیض نے آزادیِ وطن پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا:

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

گوپال متل کا ردِ عمل اس کے برعکس ہے۔ اگرچہ وہ بھی سیاسی آزادی کو وسیع تر سیاسی، اقتصادی، سماجی آزادی کا نعم البدل خیال نہیں کرتے۔ لیکن وہ اس محدود آزادی کی برکتوں کا خیر مقدم ضرور کرتے ہیں۔ انھوں نے آزادی کو "صبحِ کاذب" کہا ہے۔ اس میں یہ اشارہ پوشیدہ ہے کہ اگرچہ آزادی ہمیں حاصل ہو گئی ہے لیکن یہ سچی آزادی نہیں ہے مگر اس ناتمام یا خام آزادی کو یکسر مسترد نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے دامن میں جو برکتیں اور مسرتیں ہیں انھیں قبول کرنا اور ان کا استقبال کرنا چاہیے۔ "صبحِ کاذب" کے یہ اشعار پڑھیے

کم سے کم نور نے اُٹھا تو ہے اک بار نقاب
ایک لمحے کو تو ٹوٹا ہے طلسمِ شب و روز

اس سے ثابت تو ہوا صبح بھی ہو سکتی ہے
پردۂ ظلمتِ شب چاک بھی ہو سکتا ہے
صبحِ کاذب بھی تو ہے اصل میں دیباچۂ صبح
صبحِ کاذب بھی تو ہے صبحِ درخشاں کی نوید
ایک اعلان کہ ہنگامِ وداعِ شب ہے
قافلہ نورِ سحر کا ہے بہت ہی نزدیک
جلد ہونے کو ہے خورشیدِ درخشاں کی نوید

اس نظم سے گوپال متل کا اندازِ نظر واضح ہے جس میں ترقی پسندی کی تنقیدی نظر کارفرما ہے لیکن اس میں شدت پسندی نہیں اور کفرانِ حقیقت کا وہ رنگ نہیں جو ایک مخصوص بلکہ محدود نظر پیدا کرتی ہے۔ انھوں نے صبحِ کاذب کو ایک حقیقت تسلیم کیا ہے۔ اور اس کا استقبال یہ کہہ کر کیا ہے کہ یہ "دیباچۂ صبح" ہے۔ اور اس سے وداعِ شب کا اعلان ہوتا ہے۔ اور اسی کے بطن سے خورشیدِ درخشاں کے نمودار ہونے کا امکان ہے۔ اس میں زندگی کو زیادہ حقیقت پسندی، متوازن اور رجائیت سے دیکھنے کا جو ذہن کارفرما ہے، وہ ایک آزاد، وسیع مشرب، جو زندگی کی سچی بصیرت سے پیدا ہوتی ہے —— اسی نظم سے جدیدیت کے منفی فلسفہ طرازی کے بطلان کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ گوپال متل نے اس نظم میں، جس رجائیت، قدروں کے اثبات، زندگی کی بشارت کی جو نوید دی ہے اور جس پیرایۂ بیان کو اختیار کیا ہے، وہ اُن تمام فارمولوں کی نفی کرتا ہے، جو جدیدیت کے علم برداروں نے اپنا رکھے ہیں۔ اس میں تنہائی، تشنج، قدروں کے زوال اور زندگی سے مایوسی کا رنگ نہیں ہے۔ گوپال متل کی دوسری نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ترقی پسندوں اور جدیدیت کے علم برداروں کی ڈگر سے الگ ہٹ کر اپنا راستہ بنایا ہے۔ اور یہ راستہ دونوں کے بین بین ہے، جس کو میں نے نو کلاسیکی انداز کہا ہے۔

نو کلاسیکی اندازِ نظر، ایک آزاد اور وسیع اندازِ نظر ہے۔ گوپال متل نے رومانی دھندلکوں سے لے کر، حقائق کی تیز دھوپ تک، زندگی کے ہر منظر اور ہر مظہر کو موضوعِ شاعری بنایا ہے لیکن ایک خاص وضعِ احتیاط کے ساتھ، یہ وضعِ احتیاط اظہار کی سطح پر بھی ملتی ہے جس پر محاسنِ سخن کا احترام اور معائبِ سخن سے اجتناب شامل ہے۔ انھوں نے ایک زندہ دل انسان کی طرح زندگی کا ادراک کیا ہے۔ ان کی شاعری میں حسن ایک ارضی حقیقت ہے۔ انھیں بدن کے لمس اور اس کی لذتوں سے انکار نہیں، مگر وہ رومانی دھندلکوں کے اسیر نہیں۔ البتہ اتنی رومانیت جتنی تغزل کے لیے ضروری ہے، ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ اس طرح ان کے یہاں فلسفیانہ افکار کے فقدان کے باوجود، زندگی کے حقائق کا گہرا ادراک ملتا ہے۔ انھوں نے انسان بلکہ مادی، روحانی اور اخلاقی ہر قسم کے انسان کے وجود کا اقرار کیا ہے۔ اس اقرار میں اس انسان کے پیچیدہ اور شدید مسائل کا عرفان بھی شامل ہے۔ اور اُن مسائل سے پیدا ہونے والی وہ نفسیاتی کیفیت بھی نظر آتی ہے، جو اس دور کے انسان کا مقدر بن چکی ہے۔ گوپال متل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سُونے مکان کا دیا ہوں

منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں

میرا ساقی ہے بڑا دریا دل
پھر بھی پیاسا ہوں کہ صحراؤں میں
اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب!
اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

فضول تھا گلۂ جورِ آسماں پیارے
زمین بھی تو نہیں گوشۂ اماں پیارے

سر یہ کہتا ہے گوارا نہیں اب بارشِ سنگ
دل یہ کہتا ہے اسی کوچے میں جایا جائے

آنکھ نہ خود کوئی ہشیار نہیں ہے یارو
لیکن اس نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے

ان اشعار میں سُونے مکان کے دیے کا بے مصرف جلنا، منزل اور جادہ کے بغیر آشوبِ سفر میں مبتلا ہونا، دریا دل ساقی کی موجودگی میں صحرا کی طرح پیاسا ہونا، اپنے زہر کی تاب لانے کے لیے خود کو ڈسنا، قفس کی طرح زمین پر گوشۂ اماں نہ ملنے کا غم ہونا، بارشِ سنگ میں اسی کوچے میں جانے کی جرأت کرنا، آنکھ کا خود ہشیار نہ ہونے کے باوجود دوسروں کو دیوانہ بنانے سے جو اندازِ نظر، زندگی کا ادراک اور آج کے انسان کی پیچیدہ نفسیات کارفرما ہے، وہ ظاہر ہے۔ ان اشعار میں اگرچہ زندگی پر تنقید ہے زندگی کے المیہ کا فرمان ہے، مگر زندگی سے بیزاری نہیں انسان اور اس کے پنہاں امکانات کا انکار نہیں یہی وہ خصوصیت ہے، جو انھیں ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں دائروں سے الگ کرتی اور ایک تیسرے دائرہ کا شاعر بناتی ہے جس کو نو کلاسیکی شاعری کا دائرہ کہا جا سکتا ہے۔

گوپال متّل کی شاعری کا وافر حصّہ تغزّل پر مشتمل ہے۔ ان کی شاعری میں تغزّل کی شناخت دو سطحوں پر کی جا سکتی ہے۔ ایک معنوی سطح پر اور دوسرے اظہار کی سطح پر۔ معنوی سطح پر انھوں نے اپنی شاعری میں اُس ارضیت کا اظہار کیا ہے، جو ہندوستانی تہذیب کا مخصوص مزاج ہے۔ ان کی شاعری میں جسم کی دمک، اُس کی خوشبو اور اس کے لمس کی کیفیات سب کچھ ہے، مگر وہ جنسی ابودگی نہیں جو ان کے بعض پیش روؤں یا ہم عصروں کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اندازِ تغزّل پر اس

تہذیب عاشقی کا رنگ غالب ہے جس کا طرۂ امتیاز وضع احتیاط ہے۔ گوپال متل نے یہاں بھی ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے جسمانی جنسی اور جذباتی مخصوص میلانات سے دامن بچاکر ایک پاکیزہ مگر واقعیت پسندانہ تغزل کو پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تیری آنکھوں میں جو نشہ ہے پذیرائی کا
رنگ بھر دے نہ مری زیست میں رسوائی کا
تجھ کو افسونِ محبت کی ضرورت کیا تھی
سحر کچھ کم تو نہیں تھا تری رعنائی کا

اک چھیڑ تھی جفاؤں کا تیری گلہ نہ تھا
ترکِ تعلقات مرا مدعا نہ تھا
ہم خود بھی ترکِ راہِ وفا پر ہیں منفعل
پر کیا کریں کہ اور کوئی راستہ نہ تھا

عاشقی کی دنیا میں دیر کیا حرم کیسا
یاں فقط محبت ہے، کفر ہے نہ ایماں ہے

وہ ایک میں کہ سراپا سوال ہوں کب سے
وہ ایک تو کہ تجھے فرصتِ نگاہ نہیں

تصور میں تمھاری یاد کے جگنو چمکتے ہیں
شبِ ہجراں فقط یہ روشنی ہی کام آتی ہے

تھا کوئی شخص کبھی محرمِ دل
وہ مجھے بھول چکا ہے اب تو

ان اشعار میں محبوب کی آنکھوں میں پذیرائی کا نشہ دیکھ کر رسوائی کا خدشہ لاحق ہونا، حسن کی رعنائی کی موجودگی میں افسونِ محبت کو غیر ضروری سمجھنا، چھیڑ خوانی کو ترکِ تعلقات کا شاخسانہ نہ بنانے پر اصرار کرنا، ترکِ راہِ وفا پر منفعل ہونا اور اس کو اپنی مجبوری قرار دینا، محبت کی دنیا میں کفر و ایمان کے فقدان پر اصرار کرنا، خود کو سراپا سوال قرار دینا اور محبوب کو فرصتِ یک نگاہ نہ ہونے کا احساس دلانا، تصور میں یاد کے جگنو چمکنا، کسی شخص کا محرمِ دل ہونا، محض روایتی اندازِ بیان نہیں بلکہ اس کے پسِ پشت تغزل کا معتدل اور

محتاط اندازِ نظر کارفرما ہے، جو گوپال متّل کی شاعری کو دماغی دھندلکوں میں محتاط، مگر حقیقت پسندانہ روشنی سے ہم کنار کرتا ہے۔

انھوں نے اسلوب کی سطح پر بھی اسی وضعِ احتیاط سے کام لیا ہے، جو نوکلاسیکی دبستان کی بنیادی خصوصیت ہے۔ انھوں نے ترقی پسندوں کی شدید وضاحت اور جدیدیت کے علم برداروں کے مہمل آمیز ابہام سے صرفِ نظر کر کے سلاست اور رمزیت کا انداز اختیار کیا ہے۔ گوپال متّل کی شاعری میں اسلوب کی سطح پر دو رنگ نظر آتے ہیں، ایک سہلِ ممتنع کا اور دوسرا رمزیت کا۔ جہاں تک سہلِ ممتنع کا تعلق ہے، گوپال متّل کے یہاں اس کے ڈانڈے سلاست اور سادگی سے ملتے ہیں۔ سادگی اور سلاست یوں بھی سہلِ ممتنع کی بنیادی خصوصیت ہے، جس میں اندازِ بیان کی سادگی کے ساتھ، معنوی سادگی اور تاثیر بھی شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

مُفلسی اور عاشقانہ مزاج
دینے والے یہ کیا دیا تُو نے

مجھ پہ تو مہربان ہے پیارے
یہ بھی اک امتحان ہے پیارے
کون کہتا ہے بے وفا تجھ کو
کس کے مُنہ میں زبان ہے پیارے

رنگ سو بار زمانے کی فضا بدلے گی
کبھی بدلی نہ کبھی اپنی نوا بدلے گی

ان اشعار میں سہلِ ممتنع کا رنگ ہے۔ وہی سادگی اور سلاست، وہی صفائی ستھرائی وہی روزمرہ اور محاورہ کا لطف، وہی حسنِ بیان اور وہی دلکشی و تاثیر، جو سہلِ ممتنع کی خصوصیات ہیں، ان کے اشعار میں ملتی ہیں۔ گوپال متّل کے یہاں مفرد الفاظ کا جو تخلیقی استعمال نظر آتا ہے، بعض مقامات پر اس کی حیرت انگیز دلکش مثالیں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں بعض ایسے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے، اور انھیں غزل کے مزاج کا حصہ بنایا ہے، جو اب تک غزل کی ٹکسال سے باہر سمجھے جاتے تھے۔

وضع داری محبت کے منافی ہے تو ہو
آج کالر پہ نیا پھول سجایا جائے
بالکونی وہ کئی دن سے ہے ویراں یارو
اُس گلی میں کوئی ہنگامہ اُٹھایا جائے

اب رقیبوں میں نہیں جنگ سر کوئے وفا　　　　اب تو یہ رسم ہے گیو باندھ کے جلوہ دیکھو

ان اشعار میں گیو، کالر اور بالکونی کا استعمال ان کے تخلیقی مزاج مگر جدت پسند طبیعت کا مظہر ہے مگر بیان کے ساتھ حسن بیان اور سادگی کے ساتھ تازگی کی وہ خصوصیات بھی ہیں، جو ان کے اسلوب شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔

گوپال متل کے اسلوب کا دوسرا رنگ رمزیت آمیز ہے۔ جس میں انھوں نے فارسی ذخیرۂ الفاظ، تراکیب، تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے۔ مگر یہ رمزیت سادگی اور سلاست کی طرف مائل ہے، جو ایک طرف وضاحت زدگی سے مبرا اور دوسری طرف شدید ترین ابہام (جو مہملیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے) سے پاک ہے۔ یہ خصوصیت بھی نو کلاسیکی دبستان کے شاعروں کے اسلوب کی ہے۔ گوپال متل نے اسلوب کا یہ رنگ کسی جبر کے تحت اختیار نہیں کیا بلکہ یہ ان کے تخلیقی مزاج، خوش طبعی، کلاسیک کے گہرے مطالعہ اور تخلیقی تجربے کا لازمی حصہ معلوم ہوتا ہے:

روشن اسی کی رو سے شبستانِ زندگی　　　　تیرا خیال شمعِ فروزانِ زندگی

جو شارعِ لب ہے، موجِ نو بہارِ نغمہ ہے　　　　خامشی بھی آپ کی آئینہ دارِ نغمہ ہے

منکرِ سازِ مسرت ہوں تو کافر ہوں مگر　　　　ہم نفس مضرابِ غم پر انحصارِ نغمہ ہے

ناز کر اپنے فلک سیر تخیل پہ مگر　　　　جو ترے پانو سے لپٹی ہے وہ زنجیر بھی دیکھ

ان اشعار میں شبستانِ زندگی، شمعِ فروزانِ زندگی، شارعِ لب، موجِ نو بہارِ نغمہ، آئینہ دارِ نغمہ، مضرابِ غم، انحصارِ نغمہ، فلک سیر تخیل جیسی ترکیبوں اور استعاروں سے ان کی تخلیقی قوت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے اسلوب کے یہ دونوں رنگ ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ ان کو بہت زیادہ الگ الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ دونوں رنگ دراصل ان کے ایک ہی رنگ کے دو شیڈ ہیں۔

گوپال متل کا تخلیقی سفر آدھی صدی پر محیط ہے۔ انھوں نے زندگی بھر، چاہے کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے اپنے اصولوں کے لیے قلمی جنگ کی ہے۔ ان کی نثر کا ایک خاص اسلوب ہے اس طرح ان کی شاعری کی اپنی خوشبو، اپنا رنگ اور اپنا ذائقہ ہے۔ جو اردو شاعری کے اس بنیادی مزاج کا حصہ ہے، جس کو آزاد ذہن فن کاروں نے بنایا اور سنوارا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک طرف جسم اور جمال کا رنگ کندن کی طرح دمکتا ہے مگر اس پر ہوس کی پرچھائیاں نہیں ہیں۔

دوسری طرف عصری زندگی کی ستم رانیوں اور ان سے پیدا ہونے والی انسانی ذہن کی نفسیاتی کیفیات اور نئے انسان کی بصیرت کا آہنگ بھی ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے تخلیقی اور جمالیاتی تجربوں کو جس سادگی، سلاست اور چابک دستی سے الفاظ کا قالب عطا کیا ہے، وہ سہلِ ممتنع کے دائرے میں شامل ہے، جس میں رمزیت کا رنگ بھی شامل ہے جو ان کے اسلوب کو اور زیادہ تخلیقی اور غنائی بنا دیتا ہے۔ جب تک اردو میں نو کلاسیکی دبستان کے قدرداں باقی ہیں، اس وقت تک گوپال متل کی شاعری کا مقام اور جواز باقی رہے گا —— مختصراً گوپال متل کو نو کلاسیکی دبستان کے آزاد ذہن کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔

●●

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

صحرا میں اذان: ——— جبلت اور اظہار کی آویزش

گوپال متل کے شعری مجموعے صحرا میں اذان کے بارے میں بادی النظر میں یہ رائے قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ یہ روایتی اور عمومی خیالات کو روایتی ڈھنگ سے نظمانے کے ایک بے فیض عمل کا مظہر ہے۔ یہ رائے، ان کے یہاں قدیم اساتذہ میں میر یا غالب یا جدید دور میں فیض یا اختر شیرانی کے طرزِ احساس اور اسلوبِ بیان کی تقلید کے حاوی رجحان کو دیکھ کر اور مستحکم ہوتی ہے، اور یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں نقاد گوپال متل کے ذوقِ سخن کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اُن کے سخن ور ہونے سے انکار نہ کر دیں، اور ہُوا بھی ایسا ہی ہے، مختلف نقاد اُن کے معاصرین میں آنند نرائن مُلّا یا ساغر نظامی کے شاعر ہونے کا اعتراف تو کرتے ہیں، مگر ان کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اُن کے تئیں سرد مہری کے ایسے رویّے کی ذمہ داری ان سے زیادہ تنقید پر عاید ہوتی ہے، موجودہ تنقید جس طرح سے سطح بینی، عافیت پسندی اور عمومیت پرستی کے سقیم رویے کو ظاہر کرتی ہے، اس سے گوپال متل جیسے کم کوش شعرا کیا توقع کر سکتے ہیں؟ نقاد بالعموم شاعر کے اصلی تخلیقی جوہر کی دقت طلب تلاش و تعین کی طرف متوجہ ہونے کے عمل کو روا رکھنے کے بجائے اس کی شخصی یا سیاسی حکمتِ عملی سے حاصل کردہ شہرت کے دامِ سحر میں گرفتار ہو کر اس کی مدح سرائی کرتے ہیں، نتیجے میں بعض ایسے شعراء ضرورت سے

زیادہ LIME LIGHT میں آتے ہیں، جو اُس کا استحقاق نہیں رکھتے۔ اور جو نقد و نظر کے حقدار ہیں، وہ عدم توجہی کے شکار ہوتے ہیں، اور گمنامی کے اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔ ظاہر ہے تنقید کے ایسے غیر صحت مند رجحان کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔

صحرا میں اذان کی اکثر منظومات شعر گوئی کے اُس نثری انداز کا اعادہ کرتی ہیں جو انیسویں صدی میں حالی کی سادہ بیانی سے اپنا رشتہ قائم کرتا ہے، اور جو بیسویں صدی کے ربع اوّل تک متعدد شعراء کے گلے کا تعویذ بن کر رہ گیا، نتیجے میں وہ شخصی، سماجی یا سیاسی موضوعات کی منظوم تبصرہ نگاری ہی کو شعر گوئی کا نعم البدل سمجھتے رہے۔ . .
گوپال مِتّل حالی کی قائم کردہ اس روایت سے اتنے قریب ہیں کہ وہ نہ صرف اُن کی خدمات، خاص کر اُن کے "بادۂ تفہیم کے منصب" کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کی شان میں ایک تحسینی نظم لکھ ڈالتے ہیں، بلکہ اکثر اشعار میں پہلے سے طے کردہ موضوعات پر ہی طبع آزمائی کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے، جیسا کہ مذکور ہوا، وہ کلاسیکی شعراء کے ساتھ ساتھ بعض نمایندہ معاصرین سے بھی اکتساب کرتے ہیں، وہ فیض کی زمینوں: (خزاں چمن سے مرے بار بار گزری ہے) ہی میں طبع آزمائی نہیں کرتے بلکہ اُن کی بعض لفظیات بھی مستعار لیتے ہیں، حد درجہ روایت پسند ہونے کے باوجود وہ ن، م، راشد کے جدت پسندانہ انداز کی پیروی میں نظم آزاد بھی لکھتے ہیں، اور اختر الایمان کی طرح کالر، بالکونی، کیو، سوانگ اور فاحشہ جیسے نئے الفاظ بھی برتتے ہیں، اتنا ہی نہیں، بلکہ نئے شعراء مثلاً خلیل الرحمن اعظمی کی طرز پر نیہ کے یہ تنہائی اور محرومی کے جذبات کا اظہار بھی کرتے ہیں، مستعار اور متضاد صداؤں کے اس شور میں گوپال مِتّل کے انفرادی لہجے کی شناخت کا مسئلہ حد درجہ دقت طلب ہے۔

تاہم واضح رہے کہ اخذ و اکتساب کے اس عمل کے لیے فیشن پرستی یا نقالی کو دخل نہیں، بلکہ ایک متجسس ذہن کی جہد پیہم کا پتہ چلتا ہے۔ صحرا میں اذان میں بعض ایسے غزلیہ اشعار اور نظمیں موجود ہیں، جو ان کے انفرادی لہجے کی تعین میں مدد دیتی ہیں۔ یہ لہجہ عقلیت اور متانت سے مملو ہے، اور ایک مخصوص شعری ذہن کا پتہ دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذہن ایک مخصوص تہذیبی ماحول میں پروان چڑھا ہے۔ اور روایتی اسالیب میں اظہار کا متقاضی ہے۔ مگر غور سے دیکھنے پر نظر آتا ہے کہ یہ اُن کے ذہن کی اصلی پہچان نہیں، بلکہ اس پر ایک اوپری خول کی نشان دہی کرتا ہے، جیسے تھوڑا سا کھرچنے سے اس کی اصلی اور فطری صورت اُبھرتی ہے۔ یہ اس کی جبلی صورت ہے، جو اپنی توانائی اور فطری وحشت سے پہچانی جا سکتی ہے، اُن کے ذہن کا یہ جبلی عنصر طوفانی ہے، یہ تند لاوے کی طرح اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہے۔ اور جب کبھی اظہار کے راستے پا لیتا ہے تو نور میں ڈھل جاتا ہے، اور آس پاس کی فضا کو تابناک کرتا ہے۔ شاعر جب اپنے جبلی محسوسات کو شخصیت کے دیگر عناصر مثلاً عقل، تخیل اور شعور سے آمیز کر کے ایک نئی شکل عطا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، تو میر اور غالب کے ارتقائی تہذیبی اور فنی رویے معرضِ وجود میں آتے ہیں، اور زندگی حسن اور خیر و برکت سے مالا مال ہو جاتی ہے۔

گوپال متل اتنی بڑی سوغات نہ لاتے ہوئے بھی بقول غالب "داغِ جگر ہدیہ" لاتے ہیں۔

اُن کی شخصیت کی سب سے بڑی قوت اس کے جبلّی امکانات ہی ہیں، جو اظہار کے طالب ہیں، لیکن جو تشنۂ اظہار رہ جاتے ہیں۔ وہ ان پر شرافت، شائستگی، عقلیت اور روایت کا خول چڑھاتے ہیں۔ یہ ذہنی رویّہ ان کو ظاہر اور باطن کے تضاد میں مبتلا کرتا ہے اور ان کی پوری شاعری جبلّت اور اظہار کی آویزش کی شکار ہو جاتی ہے۔ یہ آویزش فی نفسہٖ اگر شعری تجربہ بن جائے تو اس سے محترز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ یہ صحیح معنوں میں شاعر کی شخصیت کی شناخت بن جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ اس کے برعکس اس کی تنظیمی اور ترسیلی قوتوں ہی کو مفلوج کرے تو ایک سنگین صورت حال پیدا ہوتی ہے۔

گوپال متل کے یہاں متعدد مقامات پر ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے، وہ اندرونی جذبے اور خارجی وسیلۂ اظہار میں مطابقت پیدا کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں، اور لامحالہ وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور خواہشِ بے پایاں کے باوجود کوئی حرف زبان پر نہیں لا سکتے۔ عجزِ بیاں کی اس حالت کا بیان " . . . کہ در گفتن نمی آید" میں ملتا ہے، اُن کے بعض اشعار اس خاموشی یا ناکامیِ اظہار کے غماز ہیں:

مرگِ دل پر قناعت بڑی چیز ہے، کوئی شکوہ نہیں اور ہو بھی اگر
اب پذیرائی کی کس سے اُمید ہے اور کس کو ہے تابِ بیاں دوستو!

نہ دے داد اس قدر بھی ضبطِ غم کی
یہ غم ناقابلِ اظہار بھی ہے!

اس کا دوسرا پہلو اظہار کی وہ سعی ہے جو شاعر کی بے پایاں خواہشِ نمود کے باوصف مشکور نہیں ہو پاتی:

بہ ایں سکوت، تمنائے عرضِ حال بھی ہے

وہ دل کی بے تابیوں سے اپنی جان کو آفت میں محسوس کرتے ہیں:

دل کی بے تابیوں کا حال نہ پوچھ
ایک آفت میں جان ہے پیارے

ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، اور زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق روایتی اور مستعملہ الفاظ، فرسودہ تراکیب اور بے جان استعاروں پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ از کار رفتہ زبان اُن کے اصلی تجربوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اور جو کچھ ہاتھ آتا ہے وہ بیش پا افتادہ اور عامیانہ ہے۔ اظہار کی ناکامی کا کرب البتہ وہ محسوس کرتے ہیں، اور صرف ذاتی سطح ہی پر نہیں، بلکہ اجتماعی سطح پر بھی، یہی وجہ ہے کہ اپنے دور کی جذبہ و احساس سے عاری شاعری کو وہ طنزیہ انداز میں خدمتِ قوم پر لگانے کی سفارش کرتے ہیں:

شاعری میں نہ رہا جذبہ و احساس کو دخل
اب اسے قوم کی خدمت پہ لگایا جائے

اس صورت حال کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے، یعنی وہ بعض نادر لمحوں میں اپنی داخلی شخصیت کے مختلف عناصر خاص کر جبلت اور عقلیت کی تطبیق سے اُس آویزش پر قابو پانے میں کامیاب ہوتے ہیں، اور اُن کی شخصیت کی ایک ایسی امیج اُبھرتی ہے جو شعری اعتبار کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ یہ فکر، سنجیدگی اور ضبط سے ترکیب پاتی ہے، اور عشق، حسن، سیاست، انسانیت، ذہنیت اور فطرت کے غوری نوعیت کے موضوعات کے بارے میں ٹھوس اور سنجیدہ لہجے میں اپنے انفرادی ردِعمل کا اظہار کرتی ہے:

شعر کہنے کا مزہ ہے اب تو
دل کا ہر زخم ہرا ہے اب تو

یہ سارے موضوعات اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ گوپال متل کو اپنے معاشرے سے ذہنی لگاؤ ہے۔ وہ ایک سچے اور مخلص انسان کی طرح، اپنے جبلی تقاضوں کے تحت انسانی اقدار کی سربلندی کے خواہاں ہیں، مگر ان کی پامالی کے مناظر دیکھ کر غم و غصہ سے دوچار ہوتے ہیں، مگر وہ ان سے مغلوب نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ انھوں نے صبر و ضبط کو جسے وہ "پندار شکیبائی" سے یاد کرتے ہیں، اپنی ڈھال بنا رکھا ہے:

کہیں ایسا نہ ہو اس لطف و مدارات کے بعد
امتحاں ہو مرے پندارِ شکیبائی کا

یہ پندارِ شکیبائی، جو نفسیاتی نوعیت کا ہے، اُن کے شعری وجود کی ضمانت بن جاتا ہے، اور یہی اُن کی حد بندیوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے، اس لیے کہ وہ اس پندار کو قائم رکھنے کے لیے اپنے محدود دائرے میں ہی رہ کر اپنا تحفظ کرتے ہیں، وہ اپنا تحفظ تو کرتے ہیں، مگر فطری طور پر پھیل نہیں جاتے۔ نتیجے میں حیات و مرگ کے ازلی مسائل اُن کی دسترس کے باہر رہتے ہیں وہ خود بھی اس میں شامل نہیں "ابدیت کا جلال" کہہ کر اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ تاہم اس دائرے میں رہ کر بھی وہ تجربے کی سچائی کا احساس دلاتے ہیں۔ نظموں میں "طلوعِ شب" اور "شب تاب" جیسی نظمیں اس کی مثال ہیں، اُن کی نظمیں کفایت لفظی اور احساس کی سچائی کی مظہر ہیں، غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں!

غور سے دیکھ نوشتہ مری پیشانی کا
جو مرے عزم سے اُبھری ہے وہ تحریر بھی دیکھ

کیوں نہ اب وضعِ جنوں ترک کریں لوٹ چلیں
اس سے آگے جو ہے، جنگل وہ گھنیرا ہوگا

دوپہر ہجر کی تپتی ہوئی سر پہ ہے کھڑی
وصل کی رات کو شکووں میں نہ کھویا جائے

جو مقدر ہے وہ انجامِ تمنا دیکھیں
دلِ وحشت زدہ چل آج اُسے جا دیکھیں

کیا سمجھتا تھا نظر آنے لگا ہے کیا مجھے
چشمِ بینا نے کہیں کا بھی نہیں رکھا مجھے

اجازت ہے حقیقت فاش کر دو
مگر یاں اہتمامِ دار بھی ہے

بجھ ہی جائے نہ کہیں دل کا چراغ
واقعی تند ہوا ہے اب تو

محولا بالا اشعار میں تجربات کے مؤثر اظہار کے لیے زبان کے روایتی برتاؤ سے اجتناب کے رویے کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، شاعر مروجہ زبان کی حد بندیاں، جو تاریخ اور سماج نے اس پر عاید کی ہوئی ہیں۔ اس وقت پگھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، جب وہ اپنے تخلیقی ذہن کی آب و تاب کا سامنا کرتا ہے۔ اور الفاظ کے معنوی دائروں کو منور ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گوپال متل کا لسانی شعور روایتی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے تجربوں کی کیفیت کے مطابق روایتی الفاظ میں تلازمات کو اُبھارنے کی سعی کی ہے۔ یہ سعی شعر کے سیاق میں بارور ہوتی دکھائی دیتی ہے اور معنویت کو خلق کرتی ہے، ان کے یہاں شعر، نظم و غزل کے صنفی امتیازات سے ماورا ہو کر تخیلی فضا کی تشکیل کرتا ہے۔ جو قاری کے لیے جذب و کشش رکھتی ہے۔

ایسی فضا کی تخلیق کے لیے گوپال متل کا سنجیدہ لہجہ ایک ڈرامائی صورت حال کو جنم دیتا ہے، نتیجے میں اُن کے یہاں غیر آراستہ (INORNATE) الفاظ بھی معنوی امکانات سے معمور ہو جاتے ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اُن کا لب و لہجہ مستقل سنجیدگی کے باوصف معنوی لحاظ سے یک سطحی نہیں رہتا۔ بلکہ طنز سے تہہ دار ہو جاتا ہے،

ذیل کے اشعار میں ان کا لہجہ اپنی سنجیدگی کی بنا پر ایک مخصوص نظامِ معانی کی تشکیل تو کرتا ہے، مگر بغور دیکھنے پر محسوس ہوتا ہے کہ طنز کی ایک زیریں روسے اس نظام کا الٹ پلٹ (REVERSAL) واقع ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

آؤ کچھ جشنِ شہادت ہی میں شرکت ہو جائے
اپنی کھڑکی ہی سے مقتل کا تماشہ دیکھیں

ہے مرکزِ نگاہ ابھی تک وہ آستاں
یہ اور بات ہے کہ مجالِ سفر نہیں

شعر میں تذکرۂ دشت و بیاباں ہو مگر
اک بڑے شہر میں گھر اپنا بسایا جائے

ضبط کا دل نے عجب سوانگ رچا رکھا ہے
جیسے سچ مچ ہی کوئی راز چھپا رکھا ہے

تیرے کوچے کا واہ کیا کہنا
یہ زمیں آسمان ہے پیارے

بانی

درونِ ذات کی شاعری

جنابِ گوپال متل سے میری ملاقات ۱۹۵۲ء میں ہوئی، جب انھوں نے اپنا رسالہ 'تحریک' دلی سے جاری کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 'تحریک' کا اجرا اس لیے عمل میں آیا تھا کہ ان ادیبوں اور شاعروں کو اپنی بات کہنے کا موقع ملے جنھیں کسی طرح کی ادبی تنظیم سے اپنی ذہنی اور فطری صلاحیتوں کا سمجھوتہ منظور نہیں تھا۔ 'تحریک' نے ابتداء اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے طور پر ادب میں REGIMENTATION کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ ترقی پسندوں نے تخلیق کاروں کی اس آزادیٔ اظہار کی خواہش کو اپنی تنظیم کے خلاف ایک خطرہ تصور کر کے، گوپال متل کے خلاف محاذ قایم کر دیا کہ یہی ایک شخصیت اپنی پوری قوت کے ساتھ نظریہ بند ادب کے احتجاج کا حوصلہ رکھتی تھی۔ متل صاحب فکر و اظہار کی آزاد فضا تعمیر کرنے کے خواہش مند تھے لیکن خود ترقی پسندوں نے، (جن میں بیشتر معتبر اہلِ قلم اُن کے قریبی دوست تھے) اس بات کو مخالف محاذ کی شکل دے دی کہ ان کی تنظیم کو خطرہ لاحق ہو چلا تھا۔ متل صاحب مزاجاً مجتہد ہیں اور انھوں نے خاص معنوں میں استعمال ہونے والی ترقی پسندی کی اصطلاح پر، اور اس کے تحت مخصوص رنگ میں تخلیق ہونے والے ادب کے خطرات پر تفصیل سے لکھنا شروع کیا۔

اس پس منظر پر اس لیے روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ گوپال متل بہ حیثیت شاعر، ادب اور زندگی کی

صداقتوں کے اظہار کے لیے داخلی وسیلوں پر زور دیتے ہیں تخلیقی تکمیلات کو ذات کی باطن خبری کا مسلسل عمل تصوّر کرتے ہیں۔ رومانٹک فکری غنودگی کے وہ سرے سے قائل نہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کی پہلی خوبی اُن کی تنوّع پسند بصیرت ہے جس کے اظہار کے لیے وہ شخصی رویّے کو ترجیح دیتے ہیں :

غور سے دیکھ نوشتہ مری پیشانی کا
جو مرے عزم سے اُبھری ہے وہ تحریر بھی دیکھ

گوپال متّل بحیثیت شاعر اس لحاظ سے خوش مقدر ہیں کہ اُن کی زندگی کا ایک عرصہ لاہور ایسے فعّال ادبی مرکز میں گزرا ہے جہاں آزادی سے پہلے کی غیر معمولی اور نامور ادبی شخصیتوں سے انھیں قربتیں حاصل رہی ہیں، مولانا تاجور اور حضرت حفیظ جالندھری خاص طور پر قابلِ ذکر شخصیتیں ہیں جن سے متّل صاحب کا نہایت قریبی تعلق رہا ہے۔ گوپال متّل اس دَور کے جدید شاعروں کی طرح اُس زمانے میں ادبی موضوعات کے اعتبار سے سرکش اور اسلوب کی سطح پر سفّاک شاعر تسلیم کیے گئے لیکن انھوں نے روایت کی زندہ و تابندہ قدروں کے وسیلے سے اپنے شاعر ہونے کو دریافت کیا، درخشندہ شعری روایات کی آگہی کے پس منظر میں اپنے لہجے کی تشکیل کی اور اپنی تخلیقات کے تعلق سے روشن کر دکھایا کہ احساس اور اظہار کے درمیانی فاصلے کو کم سے کم کرنے میں کس شعری اجتہاد کی ضرورت درپیش آتی ہے۔ اُن کی روایت پسندی کس خوبی سے درونِ ذات میں جذب ہو کر اُن کے انفرادی رویّۂ فکر و اسلوب کو جِلا دیتی ہے۔ اس کی مثال ان اشعار سے واضح ہو جائے گی :

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
مَیں سُونے مکان کا دیا ہوں
منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں

تجھ کو افسونِ محبت کی ضرورت کیا تھی
سحر کچھ کم تو نہیں تھا تری رعنائی کا

ہوس کو سہل نہ سمجھو، ہوس کے رستے میں
کہیں کہیں تو محبت کا احتمال بھی ہے!

دل جلانے سے کہاں دُور اندھیرا ہوگا
رات یہ وہ ہے کہ مشکل سے سویرا ہوگا

مَیں اگر چُپ تھا تو بیگانۂ ماحول نہ تھا
جانتا تھا کہ زمانے کی ہوا بدلے گی

گوپال مِتّل نے روایت کو ایک مسلسل حرکی قوت کے طور پر تسلیم کیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ شعر و ادب کی کائنات میں نئے تجربے کے ہمیشہ سے موئید رہے ہیں۔ آزادی کے بعد تحریک کے اجراء سے آج تک تقریباً اس ربع صدی کے عرصے میں شاعری کے افق پر طلوع ہونے والے نمایاں شاعر اپنے ادبی سفر کے کسی نہ کسی مقام پر ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مِتّل صاحب کے یہاں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی خوبی اُن کا ہر قسم کی وابستگی کی ذہنیت سے نجات پانے اور دُور رہنے کا وہ رویّہ ہے جو داخلی احساسات پر اعتماد قایم کرنے کا مثبت پہلو سامنے لاتا ہے۔ انھوں نے جدید طرزِ فکر و اظہار کا جس خلوص اور سرگرمی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے اور حوصلہ افزائی کی ہے، آزادی کے بعد شاید دوسری کوئی شخصیت اس توانائی کے ساتھ، اس کام کو سرانجام نہ دے سکی۔

گوپال مِتّل کی شعریات کے سلسلے میں عرض کروں گا کہ اُن کے یہاں خیال کا تحرک، انتہائی STRAINLESS اظہار کی صورت میں اپنی فضا خلق کرتا ہے۔ بعض احباب شاید اسے نقص وضاحت پسندی سے تعبیر کرتے ہیں، میرے خیال میں یہ نقصِ وضاحت پسندی نہیں بلکہ خیال کو شکل دینے کی خلّاقانہ قدرت ہے جسے انھوں نے ترسیل یابی کے باب میں روشن اسلوب کے واسطے سے روا رکھا ہے۔ پچھلے دنوں، دورانِ گفتگو انھوں نے بتایا: ”شاعری کا مکمل طور پر قابلِ فہم ہونا ضروری نہیں۔ مَیں ہر نئے تجربے کا خیر مقدم کرتا ہوں اور دورانِ تجربہ، پُراسرار نیم روشن فضا کا قائل ہوں لیکن اُلجھے ہوئے دھاگے لے کر ذات گھر نہیں لوٹتا:“

ناز کر اپنے فلک سیرِ تخیّل پہ مگر
جو ترے پانو سے لپٹی ہے وہ زنجیر بھی دیکھ

دوسری بات ان کی شعریات کے سلسلے میں یہ ہے کہ انھوں نے اظہار کی سطح پر استعارہ کے مقابلے میں علامت سے زیادہ کام لیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اُن کے اسلوبِ شعر میں استعارہ کے استعمال کی گنجایش یوں بھی کم رہی ہے۔ علامت کو جس سفاکانہ انداز سے انھوں نے استعمال کیا ہے اُسے اُن کے لہجے سے الگ کر کے مطالعہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ علامت اُن کے لہجے میں اس طرح پیوست ہے کہ دونوں چیزیں ناقابلِ تقسیم اکائی کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں اُن کی نظم "شب تاب" یہاں آپ کے مطالعے کے لیے درج کروں، اس نظم میں جاری و ساری علامت کی طرف آپ کی توجہ دلانے کی جسارت کرنا چاہوں گا۔ یہ علامت موجودہ زندگی میں اعتقاد کی سمار شدگی کے المیے کی صورت میں شروع ہوتی ہے، اور پھر الیقان کی بحالی اور مستحکم ہونے کے NOTE OF HOPE پر ختم ہوتی ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیے:

یہ برستا ہُوا موسم، یہ شبِ تیرہ و تار
کسی مدھم سے ستارے کی ضیا بھی تو نہیں
اُف یہ ویرانیِ ماحول یہ ویرانیِ دل

آسمانوں سے کبھی نور بھی برسا ہوگا
برقِ الہام بھی لہرا گئی ہوگی شاید
لیکن اب دیدۂ حسرت نے سوئے عرش نہ دیکھ
اب وہاں ایک اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

دیکھ اس فرش کو جو ظلمتِ شب کے باوصف
روشنی سے ابھی محروم نہیں ہے شاید
اک نہ اک ذرّہ یہاں اب بھی دمکتا ہوگا
کوئی جگنو کسی گوشے میں چمکتا ہوگا
یہ زمیں نور سے محرُوم نہیں ہو سکتی

کسی جاں باز کے ماتھے پہ شہادت کا جلال
کسی مجبور کے سینے میں بغاوت کی ترنگ
کسی دوشیزہ کے ہونٹوں پہ تبسّم کی لکیر
قلبِ عشاق میں محبوب سے ملنے کی اُمنگ
دلِ زہّاد میں ناکردہ گناہوں کی خلش
دل میں اک فاحشہ کے پہلی محبت کا خیال

کہیں احساس کا شعلہ ہی فروزاں ہوگا

کہیں افکار کی قندیل ہی روشن ہوگی
کوئی جگنو، کوئی ذرّہ تو دمکتا ہوگا

یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی

یہ اُمید افزائیت قتیل صاحب کی شاعری میں ایک رو کی طرح کام کرتی ہے، کبھی واضح شکل میں اور کبھی موجِ زیریں کی طرح، ملاحظہ فرمائیے:

خزاں چمن سے مرے بار بار گزری ہے
مگر ہلاکِ فسونِ بہار گزری ہے

گوش اک مدت سے محرومِ سماعت ہے مگر
دل عجب ناداں ہے، اب تک اعتبارِ نغمہ ہے

جدید شاعری کے باب میں چند الفاظ اور اظہارات کو اور بعض خیالات کو اس بے رحمی سے برتا گیا ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے گویا ان کی پشت پر احساس کی دُنیا ہی آباد نہیں ہے۔ اس سلسلے میں پچھلے دنوں، قتیل صاحب سے بات چیت ہوئی انھوں نے اپنی دانش ورانہ قلندری کی موج میں بہت کچھ بتایا، میں ان FLASHES کو مکالمہ کی صورت میں پیش کر رہا ہوں:

ب : نئے شاعر "تنہائی" سے دوچار ہیں، ان کے اس تجربہ کے پیچھے کتنی صداقت ہے؟

گ۔م : صاحب، تنہائی کا احساس فکر و دانش کی فطری ضرورت ہے، ہر سچّا تخلیق کار اپنی ایک دُنیا الگ سے قائم کرتا ہے اس کا یہ عمل اُسے مادّی زندگی سے جُدا کر کے اسے متوازی سفر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں تنہائی کا احساس ایک ہیبت ناک DIMENSION اختیار کیے ہوئے ہے۔ مگر ہمارے ملک میں تنہائی کی ہیبت ناکی کا تجربہ یقیناً مستعار دکھائی دیتا ہے میں خوش ہوں کہ ہمارے سلجھے ہوئے نئے شاعروں کے یہاں احساسِ تنہائی اُس حد تک کارفرما ہے جہاں تک اس کی فطری ضرورتیں ہیں، میں خوش ہوں کہ ان شاعروں کو اپنی ریڑھ کی ہڈی کا احساس ہے۔

ب : قتیل صاحب! "ذات کے کرب" کی اصطلاح کا اکثر ذکر ہوتا ہے، آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

گ۔م : صاحب، اس میں شک نہیں کہ یہ ہوش مندی کی دلیل ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ نیا شاعر اسی ذات کے کرب سے کائنات کی اکائی کی طرف سفر کرے۔

ب : بعض نقاد کہتے ہیں نیا شاعر FENCE پر بیٹھ کر شعر کہتا ہے۔

گ۔م : اس میں شک نہیں یہ عدم سپردگی، آزاد خیالی اور ناوابستگی کو دھوکا دیتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کوئی ہوا ایسی نہیں جو FENCE کے اوپر سے نہ گزرتی ہو، سوال شاعر کے باطن میں ہوا چلنے کا ہے جب اندر کی ہوا میں تیزی آتی ہے تو شاعر عدم سپردگی سے آزاد خیالی کی منزل میں داخل ہو کر زندگی کے ہنگامہ میں شریک ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے، زندگی کا براہِ راست مطالعہ کرتا ہے اور خود کو کسی جبر یا دباؤ کے حوالے نہیں کرتا۔

ب : مثل صاحب، ایک سوال اور کروں گا جو باقی سوالوں سے بالکل الگ ہے، ——————

HOW LONG DOES A MOMENT LAST ? (ایک لمحہ کی عمر کیا ہوتی ہے؟)

گ۔م : بانی صاحب، آپ کس قسم کے جواب کی توقع رکھتے ہیں؟

ب : یہی کہ صاحب، ایک لمحے کے سفر کی بساط میری پیدائش سے شروع ہو کر اس دن تک پھیلی ہوئی ہے جب میں اس دُنیا کو تھوڑا بہت تبدیل یافتہ چھوڑ کر رخصت ہوں گا۔

گ۔م : دیکھیے آپ کے مزاج پر میر کا کتنا اثر ہے!

ب : مثل صاحب، آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ بحیثیت شاعر آپ کی سب سے بڑی سوغات اُردو ادب کو یہ ہے کہ آپ نے تخلیق کاروں کو ہر نظریہ بند ادب کے خلاف صدا بلند کرنے کا مزاج ہی نہیں عطا کیا بلکہ فکر و اظہار کو ذات کے وسیلے سے عدم وابستگی کے مثبت رجحانات کو مسلسل پرکھنے کا رواج قائم کر دیا ہے۔

گ۔م : صاحب میں سمجھتا ہوں آپ نے مجھے خاموش کرنے کے لیے یہ سوال کیا ہے۔

ب : اب میں آپ کو اپنے انداز و آہنگ میں آپ ہی کے چند اشعار سناتا ہوں۔ آپ فرمایئے گا آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

سر میں ہوائے دشتِ جنوں ہے بھری ہوئی
شہرِ خرد کی خاک مگر چھانتا ہوں میں

منصور نہ دعویٰ انا الحق
سُولی پہ مگر لٹک رہا ہوں

اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب
اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

خوگرِ شہر ہوئے دیوانے
چاکِ دامن بھی سیا ہے اب تو

گ۔م : اِن چار اشعار کو اس ترتیب اور آپ کے انداز و آہنگ میں سننے سے ایک عجیب تجربہ کا احساس ہوا ہے۔ صاحب، میں آپ کے شاطر ذہن سے واقف ہوں، آپ نے میرے کردار کی تصویر پیش کر دی ہے۔ آئیے اب چائے کی بجائے کچھ اور پئیں۔

نظمیں

اب کڑی دھوپ کا شکوہ کیسا
اب گلہ کیا ہے مقدر میں اگر
سایۂ گیسوِ دلدار تو کیا
کسی دیوار کا سایہ بھی نہیں

دلِ ناکام میسّر تجھ کو
صرف دیوار کا سایہ ہی نہیں
سایۂ گیسوِ دلدار بھی تھا
تو نے اک منزلِ موہوم کی دھن میں ناداں!
وہ سکونِ زارِ وفا چھوڑ دیا
اپنا پیمانِ وفا توڑ دیا

تیری آوارگیِ شوق تجھے
ایک ویرانۂ تجرید میں لے آئی ہے
جس جگہ ریگِ عقائد کے سوا کچھ بھی نہیں
آہ یہ سعیِ سفر کا انجام!

۲ :

مجھے کیا بتاتے ہو
مَیں جانتا ہوں
وہ نا آشنائے رہِ آشنائی
بڑا سنگدل ہے
ہمیشہ ہی دل کو دُکھاتا رہا ہے

مجھے کیا بتاتے ہو
مَیں جانتا ہوں
وہ کوچہ
جسے آج تک کوئے دلدار کا نام دیتے رہے
آج شہرِ عدو ہے

مجھے کیا بتاتے ہو
مَیں جانتا ہوں
قبیلوں میں جب جنگ چھڑتی ہے دل ٹوٹ جاتے ہیں اکثر (ستمبر ۱۹۶۵ء)

۳ :

یہ دل اب خرابہ ہے
ایسا خرابہ
کہ برگِ مسرّت تو کیا اس میں خارِ الم تک نہیں ہے
نہ جشنِ بہاراں
نہ ماتم خزاں کا
یہ دل اب خرابہ ہے لیکن ہمیشہ خرابہ نہیں تھا
کھلے تھے یہاں پھول بھی آرزو کے
چبھے تھے یہاں خار بھی جستجو کے
یہ دل اب خرابہ ہے لیکن سدا بے نیازِ بہار و خزاں تو نہیں تھا
مَیں وہ عاشقِ رنگ و بُو ہوں کہ جس نے
ہوا اپنا صرفِ بہاراں کیا تھا

۴:

یوں اچانک ملاقات تجھ سے ہوئی
جیسے رہگیر کو
بے طلب
بے دعا
راہ میں ایک انمول موتی ملے
اور ہنگامِ رخصت یہ احساس ہے
جیسے مردِ جفاکش کا اندوختہ
حاصلِ محنتِ زندگی
راہزن چھین لیں
جیسے زاہد کو پیری میں احساس ہو
عمر بھر کی ریاضت اکارت گئی

۵:

اے دلِ خود دار یہ اچّھا کیا
وہ جو اک لمحہ مسرّت کا نصیبوں سے ملا تھا اس کو بھی ٹھکرا دیا
وہ مسرّت کیا جو بن سکتی نہ ہو تیری کنیز
عشق ہے روزِ ازل سے حکمرانِ بحر و بر
عشق اور لمحاتِ عشرت کا غلام
جو ہَوا مٹھی میں آ سکتی نہ ہو
اس ہَوا میں سانس لینا بھی حرام

۶ :

حقیر و ناتواں تنکا
ہوا کے دوش پر پرّاں
سمجھتا تھا کہ بحر و بر پہ میری حکمرانی ہے
مگر جھونکا ہوا کا ایک البیلا
تلوّن کیش
بے پروا
جب اس کے جی میں آئے رُخ پلٹ جائے
ہوا آخر ہوا ہے کب کسی کا ساتھ دیتی ہے
ہوا تو بے وفا ہے کب کسی کا ساتھ دیتی ہے
ہوا پلٹی
بلندی کا فسوں ٹوٹا
حقیر و ناتواں تنکا
پڑا ہے خاکِ پستی پر
خدا جانے کوئی رہگیرِ بے پروا
جب اپنے پانو سے اس کو مسلتا ہے
تو اپنا خوابِ عظمت یاد کر کے اس کے دل پر کیا گزرتی ہے

۷:

یہ جی چاہتا ہے
کہ کچھ کر دکھائیں
کوئی نظم لکھیں
کوئی گیت گائیں
جو یہ بھی نہ ہو تو اسے یاد کر کے
——— کسی کنج میں بیٹھ کر غم کے آنسو بہائیں

٨ :

سلام ہو تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
یہ رسم عام ہے، جو چاہے سر اُٹھا کے چلے
کوئی بھی شرط بجز وضعِ احتیاط نہیں
کوئی سنبھل کے چلے، کوئی لڑکھڑا کے چلے

سلام ہو تری گلیوں پہ اے وطن، کہ جہاں
مرے جنون کی پاداش سنگ و خشت نہیں
جہاں پہ دانۂ گندم نہیں ہے وجہِ عتاب
زہے نصیب میسر ہے وہ بہشتِ بریں!

سلام ہو تری گلیوں پہ، جو کشادہ رہیں
ہمیشہ میرے لیے قلبِ دوستاں کی طرح
میں ایک سرکش و آوارہ تھا مگر تو نے
ہمیشہ بخش دیا ہے شفیق ماں کی طرح

سلام تیری ہوا کو، تری فضا کو سلام
ہے جن کی دین مرا ذوقِ شعر و نغمہ گری
خلوصِ دل سے دعا ہے، رہے قیامت تک
مسرّتوں کے ستاروں سے تیری مانگ بھری

وہ بدنصیب جو ہیں خوگرِ نظامِ جفا
مرے بھی فرقِ انا کو جھکانے آئے ہیں
وہ شب گزیدہ جنھیں روشنی کی تاب نہیں
وہ میرے گھر کی بھی شمعیں بجھانے آئے ہیں

میں اپنے عزم کی سوگند کھا کے کہتا ہوں
ہر ایک نغمۂ دل کو رجز میں ڈھالوں گا
جو تو شفیق ہے میں بھی غیور بیٹا ہوں
قلم کی نوک کو نوکِ سناں بنالوں گا

... ہر کجا ہستند

گرچہ ساغر بہ دست ہوں امشب
کیف و مستی سے دل ہے بیگانہ
جیسے بے کیف ہو شراب مری!
جیسے ویراں ہو بزمِ میخانہ
دوست! تیرے بغیر بادہ کشی
عیشِ رفتہ کا ایک جرمانہ
ہو گئے گردشِ زمانہ سے
گرچہ اک دوسرے سے بیگانہ
پھر بھی تیری ہی یاد آتی ہے
مَیں اُٹھاتا ہوں جب بھی پیمانہ
کوئی دردآشنا نہیں تجھ بن
مَیں کہوں کس سے دل کا افسانہ
کوئی اہلِ جنوں نہیں ملتا
جس کو دیکھو وہی ہے فرزانہ
مے بھی جس کا علاج کر نہ سکے
ذہنیت اس قدر مریضانہ
غائبانہ کلام ہے تجھ سے
یوں بھی ممکن ہے دل کا بہلانا

یاد اب تک وہ قہقہے ہیں ترے
گونج اُٹھتا تھا جن سے مے خانہ
پرِ سحر بستہ ہیبتِ اذاں سے کیا
دب گیا ہے وہ شورِ مستانہ
دل پہ رندوں کے کیا گزرتی ہے
بند جب سے ہوا ہے مے خانہ
اس خنک رات میں بجز بادہ
کیسے ممکن ہے دل کا گرمانا
آ کہ اک بار پھر سجائیں ہم!
وہی دیرینہ بزمِ رندانہ!
ظلمتِ مذہب و سیاست میں
پھر سے روشن ہو شمعِ مے خانہ
میں اِدھر چھیڑتا ہوں اپنی غزل
تو اُدھر اپنی دُھن میں لہرانا
محتسب کی نگاہ سے بچ کر!
مے کہیں سے بھی ہو چُرا لانا
اور اُس کوچۂ ملامت میں
آج ممکن ہو گر تو ہو آنا!
چوم لینا وہ کاکل و رخسار
آج تک دل ہے جن کا دیوانہ
میری مجبوریوں کو دیکھ، کہ اب
میری فطرت نہیں رقیبانہ

شب تاب

یہ برستا ہُوا موسم، یہ شبِ تیرہ و تار
کسی مدھم سے ستارے کی ضیا بھی تو نہیں
اُف یہ ویرانیِ ماحول، یہ ویرانیِ دل

آسمانوں سے کبھی نُور بھی برسا ہوگا!
برقِ الہام بھی لہرا گئی ہوگی شاید
لیکن اب دیدۂ حسرت سے سُوئے عرش نہ دیکھ
اب وہاں ایک اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

دیکھ اس فرش کو جو ظلمتِ شب کے باوصف
روشنی سے ابھی محروم نہیں ہے شاید
اک نہ اک ذرہ یہاں اب بھی دمکتا ہوگا
کوئی جگنو کسی گوشے میں چمکتا ہوگا
یہ زمیں نُور سے محرُوم نہیں ہو سکتی

کسی جانباز کے ماتھے پہ شہادت کا جلال
کسی مجبور کے سینے میں بغاوت کی ترنگ
کسی دوشیزہ کے ہونٹوں پہ تبسم کی لکیر
قلبِ عشاق میں محبوب سے ملنے کی اُمنگ
دلِ زہاد میں ناکردہ گناہوں کی خلش!
دل میں اک فاحشہ کے پہلی محبت کا خیال

کہیں احساس کا شعلہ ہی فروزاں ہو گا
کہیں افکار کی قندیل ہی روشن ہو گی
کوئی جگنو کوئی ذرہ تو دمکتا ہو گا
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہو سکتی

اپنے انجام سے ڈرتا ہوں میں
دل دھڑکتا ہے کہ سچا ہوں میں

میرا ساقی ہے بڑا دریا دل!
پھر بھی پیاسا ہوں کہ صحرا ہوں میں

اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب
اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

کیوں کروں پیروی گوتم و قیس
جب بھرے گھر میں بھی تنہا ہوں میں

تھا وہ کچھ ہم سے زیادہ ہی مریض!
جس کا دعویٰ تھا: مسیحا ہوں میں

کیا نہیں ہے کوئی مے ہوش گداز
جتنی پیتا ہوں سنبھلتا ہوں میں

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
مَیں سُونے مکان کا دیا ہوں

منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں

محمل بھی نہیں کوئی نظر میں
صحرا کی بھی خاک چھانتا ہوں

منصور، نہ دعویِ انا الحق
سُولی پہ مگر لٹک رہا ہوں

اے اہلِ کرم نہیں مَیں سائل
رستے پہ یونہی کھڑا ہُوا ہُوں

اب شکوہ سنگ و خشت کیسا
جب تیری گلی میں آگیا ہوں

اس شہر میں وضعِ کج کلاہی
مَیں واقعی درخورِ سزا ہوں

مشکل نہیں ترکِ عشق لیکن
اس کا بھی مآل جانتا ہوں

سوانگ اب ترکِ محبت کا رچایا جائے
اُس کے پندار کو آئینہ دکھایا جائے

وضعداریِ محبت کے منافی ہے تو ہو
آج کالر پہ نیا پھول سجایا جائے

شعر میں تذکرۂ دشت و بیاباں ہو مگر
اک بڑے شہر میں گھر اپنا بسایا جائے

بالکونی وہ کئی دن سے ہے ویراں یارو
اُس گلی میں کوئی ہنگامہ اُٹھایا جائے

سر یہ کہتا ہے گوارا نہیں اب بارشِ سنگ
دل یہ کہتا ہے اسی کوچے میں جایا جائے

ہم ہی پیچھے رہیں کیوں دعویِ جانبازی میں
کیا ضروری ہے کہ مر کر بھی دکھایا جائے

شاعری میں نہ رہا جذبہ و احساس کو دخل
اب اسے قوم کی خدمت پہ لگایا جائے

پی ہے اگر شراب تو کچھ لطف اُٹھائیے
کیوں اتنی احتیاط ذرا لڑکھڑائیے

لینے نہ دے گی چین محبت کی تیز آنچ
چھینٹوں سے اس کو آج ہوس کے بجھائیے

وہ باوفا نہیں، نہ سہی، خوش ادا تو ہے
گر کچھ نہیں تو حظِ نظر ہی اُٹھائیے

واعظ بیانِ خلد بہت خوب ہے مگر
اک روز اس کی بزم میں بھی ہو کے آئیے

فقط اک شغلِ بیکاری ہے اب بادہ کشی اپنی
وہ محفل اٹھ گئی قائم تھی جس سے سرخوشی اپنی

خدا، یا ناخدا اب جس کو چاہو بخش دو عزت
حقیقت میں تو کشتی اتفاقاً بچ گئی اپنی

بہت جی چاہتا ہے یہ فقط نقصِ بصارت ہو
بڑی سُرعت سے دُنیا کھو رہی ہے دلکشی اپنی

اگر تم ہنس دیے احوالِ دل پر، کیا تعجب ہے
کہ مَیں خود بھی بمشکل ضبط کرتا ہوں ہنسی اپنی

ہوئی ہیں بارشیں سنگِ ملامت کی بہت لیکن
زہے وضعِ جنوں قائم ہے شوریدہ سری اپنی

کِس کو ہے حسنِ خداداد کا دعویٰ دیکھیں
کِس کا چہرہ نہیں منت کشِ غازہ دیکھیں

دل یہ کہتا ہے کہ حسن اُس کا جہاں تاب بھی ہو
اور پھر یہ بھی کہ ہم ہی اُسے تنہا دیکھیں

وہ جو ہے اونچی حویلی وہاں پھینکیں پتھر
وحشتِ دل کا ہو شاید یہی چارہ دیکھیں

آؤ کچھ جشنِ شہادت ہی میں شرکت ہو جائے
اپنی کھڑکی ہی سے مقتل کا نظارہ دیکھیں

کون منجدھار میں جائے سرِ ساحل بیٹھیں
دُور سے ڈوبنے والوں کا تماشا دیکھیں

دل جلانے سے کہاں دُور اندھیرا ہو گا
رات یہ وہ ہے کہ مشکل سے سویرا ہو گا

کیوں نہ اب وضعِ جنوں ترک کریں، لوٹ چلیں
اس سے آگے جو ہے جنگل وہ گھنیرا ہو گا

راہِ پُر پیچ کو سہل آنا بتانے والا
راہبر ہو نہیں سکتا ہے، لٹیرا ہو گا

وہ بھی انسان ہے اسے دل دُکھے الزام نہ دے
جانے اس کو بھی کن آفات نے گھیرا ہو گا

فضول تھا گلۂ جورِ آسماں پیارے
زمین بھی تو نہیں گوشۂ اماں پیارے

ترا گلہ ہے نہ کچھ شکوۂ جہاں پیارے
ہمیں نے عمر گنوا دی ہے رائیگاں پیارے

کچھ اتنا سہل نہ تھا جادۂ جنوں اے دوست
ترا خیال رہا دل کا پاسباں پیارے

خدا گواہ! نہیں فکرِ دوریِ منزل!
تھا آج تک تو مجھے پاسِ ہمرہاں پیارے

قدیم ہے مری طرزِ فغاں تو طعن نہ کر
وہی زمیں ہے وہی دورِ آسماں پیارے

اشعار

نازکر اپنے فلک سیرِ تخیّل پہ مگر
جو ترے پاؤں سے لپٹی ہے وہ زنجیر بھی دیکھ

وہ عمر ناصحو اتنی بھی رائیگاں تو نہ تھی
جو زیرِ سایۂ گیسوئے یار گزری ہے
سکوں ہے گھر میں مگر اس کی لذتیں مت پوچھ
وہ زندگی جو سرِ رہ گزار گزری ہے

عشق میں کب یہ ضروری ہے کہ رویا جائے
یہ نہیں داغِ ندامت جسے دھویا جائے

ہر ایک شخص ترکِ تمنّا کا مدّعی
ہر ایک شخص تیری تمنا لیے ہوئے
کل شب طلوعِ ماہ کا منظر عجیب تھا
تم جیسے آ گئے رُخِ زیبا لیے ہوئے

اب کسی کو کیا بتلاؤں دل پہ میرے کیا گزری
زندگی فریضہ تھی اور جی لیا میں نے

سوچتا ہوں دلِ بیتاب پہ کیا گزرے گی
سامنا ہو گیا گر پھر شبِ تنہائی کا

جب سے جدا ہوئے ہیں طبیعت اُداس ہے
اور لطف یہ کہ تجھ سے کوئی مدعا نہ تھا

صبحِ محشر قریب آگئی ہے تو کیا اس قدر بھی ہو کیوں سرگراں دوستو
رقص جاری رہے، دَور چلتا رہے، ایک شب ہے ابھی درمیاں دوستو
اب تو بندہ نوازی ہے اس کی اگر ہم فقیروں سے ہنس کر کوئی بول لے
ناز کس کو ہے جنسِ ہنر پر یہاں آج یہ جنس ہے رائیگاں دوستو

اُڑ بھی جائیں تو اب وہ بہارِ چمن کہاں
ہاں ہاں نہیں مجھے ہوسِ بال و پَر نہیں
ترکِ تعلقات خود اپنا قصور تھا
اب کیا گلہ کہ اُن کو ہماری خبر نہیں

شراب اپنے لہو سے کشید کرتے ہیں
جواز چاہیے کیا اور مے کشی کے لیے
بہ قدرِ ظرف ہے جرمِ وفا کی بھی تعزیر
نہیں ہے منصبِ منصور ہر کسی کے لیے

عاشقی کی دنیا میں دَیر کیا حرم کیسا
یاں فقط محبت ہے، کفر ہے نہ ایماں ہے

ہر چند کہ نازل ہے تباہی مرے دل پر
ہے کوئے ملامت ہی فقط میرا ٹھکانہ
مرغوب ہے ہر چند مرے دل کو ابھی تک!
وہ رنگِ سخن تو جسے کہتا تھا پرانا

ایک بے کیف سا تسلسل ہے
کوئی غم ہے نہ شادمانی ہے

نہ بتکدے میں ہے رونق نہ میکدے میں خروش
اب اہلِ دل سے تہی، صرف خانقاہ نہیں
وہ ایک میں کہ سراپا سوال ہوں کب سے
وہ ایک تو کہ تجھے فرصتِ نگاہ نہیں

تو شکوہ بہ لب اس بات پہ ہے ترتیبِ گلستاں ناقص ہے
میں حیراں ہوں کب گل بوٹے شایانِ گلستاں ہوتے ہیں

ہر اک دُکھ کا مداوا بھی محبت!
محبت مستقل آزار بھی ہے

نہ فرش پر کوئی جگنو نہ عرش پر تارا
کہیں بھی سوزِ تمنا کا اب شرارا نہیں

ہوس کو سہل نہ سمجھو ہوس کے رستے میں
کہیں کہیں تو محبت کا احتمال بھی ہے

تصور میں تمہاری یاد کے جگنو چمکتے ہیں
شبِ ہجراں فقط یہ روشنی ہی کام آتی ہے

شعر کہنے کا مزہ ہے اب تو
دل کا ہر زخم ہرا ہے اب تو
بجھ ہی جائے نہ کہیں دل کا چراغ
واقعی تُند ہوا ہے اب تو

وہ ابھی آئیں گے ہم کو بھی خبر ہے اے دل
بارہا تو نے یہ افسانہ سُنا رکھا ہے
خوب واقف ہوں رقیبوں کی تن آسانی سے
راستہ گھر کا ترے، سب کو بتا رکھا ہے

کیا کیجیے کشش ہے کچھ ایسی گناہ میں
مَیں ورنہ یوں فریب میں آتا بہار کے

ان میں خزاں کا رنگ بھی شامل ضرور ہے
گہری نظر سے نقش و نگارِ بہار دیکھ

مَیں اگر چُپ تھا تو بیگانۂ ماحول نہ تھا
جانتا تھا کہ زمانے کی ہوا بدلے گی

سر میں ہوائے دشت جنوں ہے بھری ہوئی
شہرِ خرد کی خاک مگر چھانتا ہوں مَیں

مفلسی اور عاشقانہ مزاج
دینے والے یہ کیا دیا تُو نے

دل، دل سے مِل سکے یہ بڑی بات ہے مگر
فی الحال یہ دُعا ہے نظر سے نظر ملے

غلط کہ اُن کی جفا کو بھُلا دیا مَیں نے
مگر یہ سچ ہے کہ وہ یاد آئے جاتے ہیں

مجھے زندگی کی دُعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

دماغ و دل پر لطیف سی بیخودی نشہ بن کے چھا رہی ہے
نہ چھیڑ اس وقت مجھ کو ہمدم کسی کی آواز آرہی ہے

ہم بھی اُردو پہ ناز کرتے ہیں
یہ ہماری زبان ہے پیارے

تاثرات

اب شکوہ سنگ و خشت کیا
جب تیری گلی میں آ گیا ہوں

حیات اللہ انصاری

گوپال مِتّل

میں مِتّل سے تقریباً ڈیڑھ سال ہوا، ایک جلسے میں پہلی بار ملا ہوں اور ہم دونوں میں مشکل سے دس بارہ الفاظ کا تبادلہ ہوا ہے۔ ہم دونوں میں نہ کبھی خط و کتابت ہوئی اور نہ کوئی خاص مشترک دوست رہا ہے۔ اور نہ کبھی میری تحریر، تحریک میں چھپی۔ مشاغل بھی ہم دونوں کے الگ الگ ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں میں وہ چیز، جسے ذاتی دوستی کہتے ہیں، کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ دوسری طرف ہم دونوں کے سیاسی ماضی میں زمین و آسمان کی دُوری رہی ہے۔ مِتّل صاحب ایم۔ این۔ رائے کے بہت قائل رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ لیکن میں گاندھی اور جواہر لال کو ماننا رہا ہوں۔ اس رشتے سے ۴۲ء ۱۹ کی تحریک میں ہم دونوں مخالف کیمپوں میں رہے ہیں۔ اب ذرا ایک طرف ہم دونوں کی یہ دُوریاں دیکھیے اور دوسری طرف یہ قربت کہ مِتّل کے دوستوں نے مجھے اس خوش گوار تقریب کی صدارت پیش کی اور میں نے بہت خوشی سے قبول کرلی۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ معجزہ کیوں کر ظہور میں آیا۔

میں مِتّل صاحب کے دوستوں کی طرف سے تو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا ہوں، لیکن اپنی طرف سے ضرور دے سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم دونوں فریق اس بات کو مانتے ہیں کہ ادب کا سمندر ایسا عظیم اور وسیع ہے جس میں ہر قسم کے دریا مل جاتے ہیں اور ملنے کے بعد ان کی باہمی تفریق کمزور پڑ جاتی ہے کیونکہ سب سمندر ہی سمندر ہو جاتے ہیں۔

مِتّل ایک ادیب ہے۔ مَیں اس کی بعض باتوں میں اتّفاق نہ کروں تو بھی وہ ادیب ہے۔ کسی ادب کی ادبی خوبیوں کو نہ دیکھنا اور اس کے خیالات کے صرف چند پہلو دیکھ کر کوئی رائے قائم کر لینا، یہ ایسی تنگ نظری ہے جسے علمی و ادبی دُنیا برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ مِتّل کا کیا سوال، مَیں ٹیگور، اقبال، غالب، رومی، ٹالسٹائے اور بڑے بڑے ادیبوں اور مفکروں کی ہر ہر بات کا قائل نہیں ہوں، سب ہی سے تھوڑا بہت اختلاف رکھتا ہوں، لیکن اس کے باوجود ان کی عظمت میں مجھے کبھی شک نہیں ہوتا ہے۔

مَیں 'تحریک' کا کافی عرصہ سے مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ سب سے پہلے جس چیز نے میرے دل میں مِتّل کی قدر پیدا کی، وہ ہے ان کا تجزیہ اور استدلال۔ یہ مخالف ہوں یا موافق دونوں حالتوں میں ان کا قلم استدلال کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ دوسری چیز جس نے مجھے متاثر کیا بلکہ مَیں تو یہ کہوں گا بہت متاثر کیا ہے وہ ہے ان کا تہہ دار مشاہدہ جس میں جذبات، تجزیہ اور استدلال سب کی بہت توازن سے آمیزش ہوتی ہے اور پھر اس نسخے سے جو چیزیں برآمد ہوتی ہیں وہ خوبصورت شاہ کار ہوتے ہیں۔

مِتّل کی مشہور کتاب 'لاہور کا جو ذکر کیا' دیکھیے اس میں آپ ایسے نوجوان شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں سے ملاقات کریں گے جو آگے چل کر اپنے دَور کے ادبی ستون بن گئے۔ یہ ملاقات مختصر سی ہوگی لیکن اتنی گہری اور تہہ دار ہوگی کہ دماغ پر انمٹ اور کبھی کبھی تو انمٹ نقش چھوڑ جائے گی۔

مِتّل نے شخصیات پر جو تبصرے لکھے ہیں ان میں عجیب حسن ہوس توازن اور دیانت ہیں۔ محبت میں بھی عیوب پر نظر ہے اور ناپسندیدگی میں بھی پسندیدہ پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ مَیں نے جانے کتنے مضامین ظفر علی خاں پر پڑھے ہیں اور لوگوں سے ان کے بارے میں زبانی باتیں سُنی ہیں۔ ان میں ہمیشہ ادھورا پن ہی محسوس کیا ہے۔ مِتّل کی کتاب کے ساڑھے پانچ صفحوں میں ظفر علی خاں کی شخصیت سے بھرپور ملاقات ہوگئی اور پتہ چل گیا کہ وہ کیا تھے اور ان کی شاعری کیا تھی۔

ایک ظفر علی خاں ہی پر کیا منحصر، اس مختصر سی کتاب میں آپ کو ملیں گے اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، مولانا تاجور، عبدالمجید سالک، دیویندر ستیارتھی، پنڈت ہری چند اختر، چراغ حسن حسرت، کرشن چندر، باری علیگ، احسان دانش، عبدالحمید عدم وغیرہ وغیرہ کئی درجن اہلِ قلم ——— ان سے جو ملاقاتیں ہوں گی سرسری نہیں ہوں گی۔ یہ لوگ اپنے نفسیاتی منظر کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ کہیں کہیں تو ان کے لاشعور کا بھی خوبصورت تجزیہ کیا گیا ہے۔

ادیبوں کے پہلو بہ پہلو ادبی تحریکیں بھی ہیں، روزنامے بھی ہیں اور ماہنامے بھی ہیں۔ روزناموں کی پالیسیوں اور صحافیوں کی ذہنیتوں پر خوبصورت اور حقیقت پسندانہ تجزیے ہیں۔ سیاسی تحریکیں بھی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں کہیں کہیں تو ان تہہ نشیں خونی لہروں کی بھی جھلک مل جاتی ہے جنھوں نے پنجاب کو نہ صرف دو حصّوں میں بانٹ دیا، بلکہ پڑوسیوں کے ہاتھوں سے پڑوسیوں کے گلے بھی کٹوا دیے۔

کردار و واقعات نگاری اور فضا سازی کا کیا کہنا! ان سب کی نوک پلک بہت آراستہ و پیراستہ ہیں، زبان بے حد رواں ہے جس میں سے مِتّل کا خلوص برابر جھلکتا رہتا ہے، اور جگہ جگہ ان کی دل آویز ظرافت نگینہ کی طرح چمک

جاتی ہے۔

'لاہور کا جو ذکر کیا' جب پڑھ چکیو تو دو باتوں کی زبردست خواہش پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایک تو یہ کہ متّل اب دوسری کتاب "دہلی کا جو ذکر کیا" کیوں نہیں لکھتے اور دوسری یہ کہ "لاہور پر ایک نظر اور" کی بھی ضرورت ہے۔ جس میں ان خونی لہروں سے ہمارا تعارف کرایا جائے جس نے متّل کی ان صحبتوں کو آگ و خون کے نذر کر دیا جن کو انھوں نے قلندروں کی صحبت لکھا ہے۔

متّل کی شاعری کسی رُخ سے بھی نعرہ بازی نہیں ہے۔ وہ خود ریڈیکل ڈیماکریٹک پارٹی سے متعلق رہے تھے، لیکن ان کی شاعری میں اس کی جھلک نہیں ملتی ہے۔ ان کی شاعری صرف شاعری ہے جس کے تیور ہیں :

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس وقت میرے سامنے ان کی ایک نظم 'تنکا' رکھی ہے۔ ایک تنکا جو ہوا پر بلند ہو کر اپنے کو جانے کیا کیا سمجھنے لگا تھا، ہوا بدلی تو وہ گر پڑا اور خاک میں مل گیا۔ یہ پڑھ کر میری نظروں کے سامنے درجنوں وہ شخصیتیں گھوم گئیں جو ابھی دس پندرہ سال پہلے ہوائیں اُڑتی تھیں ان میں سے کچھ بڑے مدبر تھے، کچھ مفکر، کچھ ادیب اور کچھ نقاد لیکن آج جب ان کو اوپر اٹھانے والی ہوا گئی تو وہ خاک میں اس حال میں پڑے ہیں کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ :

مَیں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا

متّل کے طرزِ بیان میں صرف انفرادیت ہی نہیں۔ کہیں کہیں ایک خاص قسم کا گھریلو پن پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے کائناتی احساس بالکل ذاتی احساس بن جاتا ہے :

سکوں ہے گھر میں، مگر اس کی لذتیں مت پوچھ
وہ زندگی جو سرِ راہ گزار گزری ہے

یہ فقرہ 'سکوں ہے گھر میں' شعر کو روزمرہ کا احساس بنا دیتا ہے۔ متّل کا رُومان پُرانے قسم کے معروضی یعنی آئیڈیل عشق سے ذرا مختلف ہے۔ لیکن اس میں تجربے کی ذرا سی ٹیس ہے جو احساسات کو 'آج کی بات' بنا دیتی ہے۔

اب ذرا متّل کے یہ دو شعر دیکھیے گا :

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

اس میں کتنی گہرائی ہے، کتنا درد ہے اور ساتھ ساتھ سہلِ ممتنع ہے۔ اسی طرح کا ایک شعر اور ہے :

مفلسی اور عاشقانہ مزاج
دینے والے یہ کیا دیا تو نے

کتنا گہرا طنز ہے موجودہ سماج پر، کتنا درد ہے اور پھر سہلِ ممتنع۔ یہ دونوں شعر ہو سکتا ہے ضرب المثل بن جائیں۔

اگر مبتل کے اس قلمی جہاد کا تذکرہ نہ کیا جائے جو انھوں نے کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کے خلاف برسوں چلایا ہے تو بات ادھوری رہے گی۔

پہلے یہ یاد دلا دوں کہ میں نہ تو کمیونسٹ ہوں اور نہ ترقی پسند۔ اور یہ کہ میرا ایک خاص ادبی نقطۂ نظر ہے جس کی روشنی میں میں ۱۹۲۹ء سے افسانے لکھ رہا ہوں۔ جب ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین نہیں بنی تھی اس وقت تک میرے سات افسانے چھپ چکے تھے جو حقیقت پسند تھے اور جن میں مقصدیت تھی۔ اپنے اس نقطۂ نظر کی وجہ سے میں سمجھا کہ میں انجمن کے مقاصد سے قریب ہوں۔ اور چھ سات سال اس انجمن میں دلچسپی لیتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ انجمن کی منزل اور ہے اور میری اور ——— تب میں اس سے الگ ہو گیا۔ میری ناول 'لہو کے پھول' سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ میں کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو کس نظر سے دیکھتا ہوں۔

اس تمہید کے بعد میں کہوں گا کہ اس محفل میں میں مبتل کے اس قلمی جہاد کا تذکرہ نہ کروں گا۔ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ پر ایک وزنی چیز ہے اور اس لائق ہے کہ اس کا تجزیہ کر کے اس کی قدر و قیمت مقرر کی جائے۔ لیکن اس کے باوجود میں اس جہاد کا تذکرہ نہ کروں گا۔ بات یہ ہے کہ جس سطح پر میں مبتل کا جشن منانا چاہتا ہوں وہاں ایسی بحث ناموزوں سی لگتی ہے۔ انیس اور دبیر کے عہد میں انیسیوں اور دبیریوں کی زبردست معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں اور بڑی بڑی بحثیں چلتی تھیں۔ اسی طرح عہدِ ظفر میں غالب اور ذوق کے قدردان تھے جو آپس میں بہت اختلافات رکھتے تھے آج ان بحثوں میں دو طرح سے شریک ہوا جا سکتا ہے، ایک تو یہ کہ دونوں فوجوں میں سے ایک میں شامل ہو کر دوسرے سے جنگ کی جائے، اور ایک یہ کہ اختلافات کو تسلیم کرتے ہوئے اس سطح پر گفتگو کی جائے جہاں دونوں فریقوں کو مصنف، ادیب اور اُردو کا خادم سمجھا جائے۔ آج میں اسی سطح پر مبتل پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سطح ایسی ہے جس پر اگر ترقی پسند ادیب اس جشن کی خوشی میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اگر اس صحبت میں وہ لوگ ہوں تو کیا کہنا! اور نہ بھی ہوں تو بھی اس جشن کو اسی طرح پر رہنا چاہیے۔ اختلافات اور تنقیدی بحثیں اپنی جگہ پر رہیں۔ لیکن یہ کون سی ادبی رواداری ہے کہ ادیب، ادیب سے مل نہ سکیں، ساتھ بیٹھ نہ سکیں، ساتھ رو نہ سکیں، اور ساتھ ہنس نہ سکیں۔

مبتل نے 'لاہور کا جو ذکر کیا' میں ادیبوں اور صحافیوں کی صحبتوں کا ذکر کیا ہے جو چائے خانوں میں منعقد ہوتی تھیں اور جن میں بھانت بھانت کے خیالات کے حضرات حصہ لیتے تھے۔ کمیونسٹ بھی اور غیر کمیونسٹ بھی۔ ترقی پسند بھی اور غیر ترقی پسند بھی۔ یونینسٹ بھی اور کانگریسی بھی۔ مسلم لیگی بھی اور قوم پرور بھی۔ یہ سب صحبت میں آجانے کے بعد اختلافات کے باوجود دوست بن جاتے تھے اور دوستی کو نباہتے بھی تھے۔ ان صحبتوں کو مبتل نے بہت مناسب نام دیا ہے، 'قلندروں کی صحبت'۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا آج ایسی صحبت نہیں جم سکتی ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم مبتل کا جشن اسی قلندرانہ سطح پر منایا جائے۔ کیا میری یہ خواہش بے جا ہے؟

میری یہ تمنا نئی نہیں ہے۔ میں اس کو زمانۂ ماضی میں ترقی پسند ادیبوں کی خدمت میں بھی پیش کر چکا ہوں۔

لیکن اس زمانے میں ان کا سورج نصف النہار پر تھا۔ اس وجہ سے وہ کسی کی بات سنتے ہی نہ تھے ——— خیر جو ہوا، سو ہوا۔ اب جتنے بھی ادیب ہیں ان سب سے میں یہ درخواست کروں گا کہ اپنے دل میں ایک گوشہ ضرور ایسا رکھ لیں جہاں وہ اختلاف رکھنے والوں کو بھی نبھا سکیں۔

میں مِتّل کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے اُردو ادب میں اپنا ایک مستقل مقام پیدا کر لیا ہے اور آج ان کا شمار چوٹی کے ادیبوں اور اُردو کے خدمت گزاروں میں کیا جاتا ہے:

ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

(۲۰ جون ۱۹۷۵ء کو غالب اکاڈمی میں منعقدہ مِتّل صاحب کی ۶۸ ویں سالگرہ کی تقریب میں پڑھا گیا۔)

رشید حسن خاں

متّل صاحب : — چند تاثرات

متّل صاحب کو ادب اور صحافت کا نقطۂ اتصال کہنا چاہیے۔ اچھے ادیب کی ذہانت اور اعلا درجے کی ہوش مندی اُن کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ اُن کی ذہانت کے سبھی قائل ہیں اور اپنی ہوش مندی کے وہ خود شاہدِ عادل ہیں۔ اُن کے شعروں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص خود فراموش ہوگا، اُن کی نثر کو پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص ہمہ وقت ہوشیار رہتا ہے اور ایک ایک لفظ کو جانچتا پرکھتا رہتا ہے اور ان کے اداریے نوٹ پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص تو وقت کے تقاضوں اور حالات کے مطالبوں پر ہمہ وقت نظر رکھتا ہے اور بس اسی دُنیا کا آدمی ہے۔ ایسے ہی کسی شخص کے لیے کہا گیا ہوگا کہ:

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

جن لوگوں نے ۴۷ء کے ذرا بعد کا زمانہ دیکھا ہے، اُن میں سے بہت سے لوگ پنڈت ہری چند اختر (مرحوم) سے ضرور واقف ہوں گے۔ واقف کاروں ہی کا کہنا ہے کہ پنڈت جی ذہانت اور لیاقت کا قدِ آدم پیکر تھے۔ متّل صاحب کا اپنا بیان ہے کہ مرحوم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ: "متّل! نظم میں وزن کا لحاظ تو ایک احمق بھی رکھ سکتا ہے، لیکن نثر میں وزن پیدا کرنا مشکل ہے۔" (لاہور کا جو ذکر کیا) متّل صاحب نے لکھا ہے کہ: "میں نے اُن

کی اس بات کو گرہ میں باندھ لیا۔ میرا خیال ہے کہ میں اگر بُری بھلی نثر لکھ لیتا ہوں تو اس میں ہری چند اختر کی اِس رہ نمائی کو بڑا دخل ہے"۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اِس زمانے میں اچھی نثر لکھنے والوں کا شمار کیا جائے تو اُن میں مِتّل صاحب کا نام ضرور شامل ہوگا۔ "کیا لکھنا ہے" یہ بات تو غالباً بہتوں کو معلوم ہوتی ہوگی، لیکن اِس بات سے کم لوگ واقف ہوتے ہیں کہ "کیا نہیں لکھنا ہے" اور یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ مِتّل صاحب اس رمز سے آشنا ہیں۔ ادبی اصطلاح کے طور پر جس چیز کو "ایجاز" کہتے ہیں، یہ وصف اُن کی نثر میں اس طرح نمایاں ہوتا ہے جس طرح فولاد میں جوہر نہاں ہوتے ہیں۔ یہ اسی کا فیض ہے کہ جملوں میں بلا کی چستی ہوتی ہے اور حشو و زوائد سے پاک جملے عبارت میں روانی کا زور بھر دیتے ہیں۔

قواعد کے لحاظ سے بے عیب نثر لکھنے والوں کی کچھ ایسی کمی نہیں، ہاں ایسے لوگ کم ہیں جن کی عبارت میں وہ شگفتگی بھی رواں دواں ہو جس سے پڑھنے والا قربت اور موانست محسوس کرتا ہے۔ بے کیف نثر شاید سب سے بڑا عذاب ہے پڑھنے والوں کے لیے اور غالباً سب سے بڑی سزا ہوتی ہے جو قدرت کی طرف سے کسی لکھنے والے کو دی جا سکتی ہے۔ پُل صراط کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ دھاردار ہوگی۔ ضرور ہوگی، لیکن اس کا صحیح احوال تو اس وقت معلوم ہوگا جب اس پر سے گزرنا پڑے گا، البتہ نثر کی شگفتگی کا سلسلہ پُل صراط ہی سے جا کر مل جاتا ہے اور یہ بات مطالعے اور مشاہدے میں آ چکی ہے کہ طبیعت احتیاط کی خوگر نہ ہو تو لکھنے والا بہت جلد ابتذال کے جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ مِتّل صاحب کے دشمن بھی (اور ان کی تعداد کم نہیں) اُن کی نثر پر ابتذال کی تہمت آج تک نہیں لگا سکے، ہاں اُس کی ادبیت، بے ساختگی اور شگفتگی کے قائل رہے۔

اچھی نثر لکھنے کی صلاحیت، شاعری کی طرح دراصل عطیۂ فطرت ہے۔ یہ سعادت واقعتاً بہ زورِ بازو حاصل نہیں ہوتی، ہاں یہ ضرور ہے کہ مشق سے اُس پر جِلا ہو جاتی ہے، اور مشق کے سلسلے کی سب سے اہم کڑی یہ ہے کہ لکھنے والا زبان کا مزاج شناس ہو۔ لفظوں میں جو معنوی امتیازات تہ نشیں ہوتے ہیں، اُن سے خوب واقف ہو۔ مِتّل صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز اُس زمانے میں ہوا تھا جب لاہور میں قد آور ادیبوں کا جمگھٹا تھا۔ کیسے کیسے ادیب تھے، جن کے سامنے اچھے اچھوں کی زبان نہیں کھل پاتی تھی! اور کیسی محفلیں تھیں جہاں بات پر زبان کٹتی تھی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی زبان کے لحاظ سے اُس زمانے میں گویا استاذ الاساتذہ تھے۔ مِتّل صاحب نے اُن سے بہت کچھ سیکھا اور خاص بات یہ ہے کہ اُس کو یاد رکھا۔ ورنہ سُننے اور سیکھنے تو بہت سے لوگ ہیں۔ صلاحیت فطرت کی بخشی ہوئی تھی، طبیعت میں اُپج کا مادہ موجود تھا، تربیت کے لیے فضا سازگار تھی اور ان سب کے ساتھ چشم نمائی اور نکتہ چینی کا میدان بھی کھلا ہوا تھا اور اس فن کے ماہرین بھی سرگرمِ کار تھے۔ ان سب عناصر نے مل کر اُن کو نثر لکھنا سکھا دیا۔ یہ بات کم لوگوں کے لیے کہی جا سکتی ہے کہ ان کو نثر لکھنا آتا ہے اور مِتّل صاحب کا نام اس مختصر فہرست میں شامل ہے۔

مجھے اس کا واقعی افسوس ہے کہ صحافیانہ دلچسپیوں نے اُن کو ادب کی طرف کم متوجہ ہونے دیا۔ بات یہ ہے کہ اُن کی تصنیفی زندگی کا آغاز صحافت ہی سے ہوا تھا اور وہ آخر تک ہر پھر کے اسی دائرے میں قدم رکھتے رہے، بل کہ یوں کہیے کہ اسی دائرے کے اسیر رہے۔ نثر میں اُن کی قابلِ ذکر تحریر وہ ہے جو "لاہور کا جو ذکر کیا" کے نام سے چھپی ہے۔ یہ مختلف یادداشتوں کا اور منتشر تاثرات کا مجموعہ ہے، لیکن نثر کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہے۔ اُردو میں اس قدر دلچسپ ادبی یادداشتوں اور شخصی تاثرات کے مجموعے بس دو ہی چار اور ملیں گے۔ طنز اور مزاح تاثیر صاحب کی طبیعت کا حصّہ ہے اور اُن کی گفتگو کا جوہر! اُن کی تحریر بھی اس سے خالی نہیں ہوتی اور یہ واقعہ ہے کہ طنز کی نشتریت اور مزاح کی لطافت اُن کی عبارت میں کمال کے درجے پر پائی جاتی ہے۔ مَیں محض اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے اس کتاب سے دو چار مختصر اقتباسات پیش کروں گا، ان سے بخوبی اندازہ کیا جا سکے گا کہ ایجاز کی خوبی، حُسنِ ادا کا لُطف، طنز کی لطیف آمیزش اور مزاح کی نفاست یہ اجزا اُن کی نثر میں تناسب اور توازن کے پورے اہتمام کے ساتھ شامل ہوتے ہیں اور تہ نشیں رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اہم بات یہ ہے کہ تنقیدی بصیرت کی جھلکیاں ایسے مقامات پر پس منظر کو نمایاں کرتی ہوئی دکھائی دیں گی اور محسوس ہوگا کہ بہت سی شخصیتوں کے سامنے آئینے رکھ دیے گئے ہیں :

۱۔ "کرشن چندر اور اُپندر ناتھ اشک کی آمد اس بات کا اعلان تھی کہ اب ادب کے میدان میں قلندری کا دَور ختم ہوا۔ دوسرے ادیبوں کے برعکس جو لاابالی تھے اور ادبی کام کو کاروبارِ زیاں سمجھ کر کرتے تھے، یہ دونوں حصولِ کامیابی کے واضح پروگرام کے تحت ہر قدم ناپ تول کر اُٹھاتے تھے۔"

۲۔ "ٹریبون کو چھوڑ کر، جو انگریزی میں نکلتا تھا، پنجاب کے اخبار اُن دنوں پالیسی نام کی کسی چیز سے آشنا نہیں تھے۔ صحافتی کالموں میں ایڈیٹروں کا رویّہ وہی ہوتا تھا جو ایک بگڑے ہوئے جاگیردار کا اپنی جاگیر میں ہوتا ہے۔ اس کی نمایاں مثال زمیندار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں تھے۔ پہلے صفحے پر ان کی نظم پڑھ کر یہ پتہ تو چل جاتا تھا کہ آج اُن کا موڈ کیا ہے، اور وہ کس سے خوش یا ناخوش ہیں! اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

۳۔ "مجاہد بننے کا اُن دنوں سبھی ادیبوں اور شاعروں کو جنون تھا۔ ساحر بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے، لیکن یہ نکتہ بھی اُن کی نظر میں تھا کہ :

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

زہد بلاکش وہ نہیں تھے، اس لیے بہت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔"

۴۔ "سیاست کے متعلق پنجابیوں کا رویہ یہ تھا کہ:

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

اور ہنگامہ آرائی میں احراری سب سے آگے تھے۔ احراری جوشیلے بھی تھے اور مخلص بھی، جہادِ مسلسل اُن کا شیوہ تھا، لیکن یہ انھیں کبھی معلوم نہیں ہوسکا کہ اس جہاد کا مقصد کیا ہے۔"

۵۔ "شاعروں اور ادیبوں کی طرح اُردو کے صحافی، بالخصوص مسلم صحافی بھی کج کلاہی اور قلندری کو زندگی کی معراج سمجھتے تھے۔ معین پالیسی کی قید سے تو اُردو کے سبھی اخبار آزاد تھے، لیکن ہندو اخبار انتظامی اور کاروباری ضابطوں کے پابند ضرور تھے۔ مسلمان اخبار اس کے بھی قائل نہیں تھے۔ ان کے وجود کا انحصار دستِ غیب یا پبلک کے چندوں پر تھا۔"

۶۔ "مجھ سے پہلے میلارام وفا ادبی دُنیا کے زمانے میں مولانا (تاجور نجیب آبادی) کے نائب رہ چکے تھے، جنھیں انھوں نے اپنی طرف سے "لسان الاعجاز" کا لقب دیا تھا اور ان کے حق میں اتنا مؤثر پروپگنڈا کیا تھا کہ مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے بھی . . . یہ مصرع نکل گیا تھا:

شعر کہنے کا سلیقہ سیکھ میلارام سے"

۷۔ "پنڈت ہری چند اختر کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو اُن کی بذلہ سنجی اور اُن کے لاأبالی پن نے نقصان پہنچایا، وہاں اُن کی غیر معمولی شرافت بھی تباہی کا باعث بنی۔ اُن کے پائے زہد کو لغزش تو کبھی نہیں ہوئی، البتہ اس مظاہر کی پاکبازی سے اُن کی اَنا کی تسکین ضرور ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی تو اُن کی پیشانی پر نورِ شہادت بھی چمک اُٹھتا تھا۔ اپنے رنگین مزاج دوستوں کے ساتھ طوائفوں کے کوٹھوں پر جانا اُن کے نزدیک ممنوع نہیں تھا، لیکن وہاں جا کر طوائفوں سے وہ کوئی شریفانہ قسم کا رشتہ ضرور قائم کر لیتے تھے۔"

۸۔ "لکھنے والوں کو اکثر اپنی صلاحیتوں کا مبالغہ آمیز احساس ہوتا ہے اور وہ اس واہمے میں مبتلا ہوتے ہیں کہ دُنیا نے اُن کی ایذا رسانی کے لیے کوئی سازش کر رکھی ہے۔ جو ناکام ادیب غیر مسلم ہوتے ہیں، انھیں اپنی ناکامی میں مسلمانوں کی سازش نظر آتی ہے۔ بہرحال جہاں تک ہندو شاعروں کے احساس

مظلومی کا تعلق ہے، یہ رائیگاں نہیں گیا۔ مُلک تقسیم ہوا تو ہندستان میں اُردو کی حالت ابتر ہو گئی۔ . . .
بطور تلافی ان کی پذیرائی شروع ہو گئی۔"

بسمل صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز رسالوں کی ادارت سے ہُوا تھا۔ مولانا تاجور کے رسالے ' شاہکار' کی ادارت کے فرائض اُسی زمانے میں انجام دیے تھے۔ اُس زمانے کے لحاظ سے اور مولانا تاجور کی نسبت سے یہ بڑا اعزاز تھا۔ بعد کو وہ مختلف اخباروں سے بھی وابستہ رہے۔ تقسیم کے بعد جب وہ دہلی میں مستقلاً مقیم ہو گئے تو انھوں نے رسالہ 'تحریک' جاری کیا جو ۲۹ برس سے زیادہ عرصے تک پابندی کے ساتھ شایع ہوتا رہا۔ بسمل صاحب کے سیاسی افکار سے بہتوں کو اختلاف ہوگا، مَیں بھی اُن سے اس باب میں متفق نہیں تھا، لیکن اس پر سبھی متفق ہوں گے کہ تحریک اُردو کا معیاری ادبی رسالہ تھا۔ اس کے صفحات پر اعلا درجے کے اربابِ قلم کے بہت سے اہم مضامین محفوظ ملیں گے۔ اس لحاظ سے ادبی رسائل کے ممتاز ترین مدیروں میں اُن کا نام شامل رہے گا۔ اس فن کو جیسا انھوں نے برتا اور اس منصب کے آداب اور وقار کا جیسا خیال انھوں نے رکھا، اُس کو دنوں تک یاد رکھا جائے گا۔ اقبال کا مشہور مصرع ہے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

تحریک کے صفحات پر ایسی کئی ادبی معرکہ آرائیاں محفوظ ہیں جن کا عنوان اس مصرعے کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ان کی متعدد ادبی اور سیاسی ادارتی تحریریں بھی اس عنوان کے ذیل میں رکھی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے بعض کے متعلق شاید یہ کہا جائے کہ اُن میں حق گوئی سے زیادہ بے باکی کا عمل دخل تھا؛ لیکن اس بات کو شاید سبھی لوگ اُس بے باکی میں آگہی کا گہرا رنگ ضرور شامل رہا ہے۔

'تحریک' کے واسطے سے بسمل صاحب نے کئی ادبی ہنگامے برپا کیے اور کئی ہنگاموں کو رونق بخشی۔ انھی میں سے ایک ہنگامہ جدیدیت کا بھی تھا۔ وقت کی رفتار پر نظر رکھنا اور ہوا کے رُخ کو پہچان لینا ایک باخبر صحافی کا امتیازی وصف ہوا کرتا ہے اور یہ وصف بسمل صاحب کی زندگی کا امتیازی نشان رہا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس انھوں نے جدیدیت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹیں سُن لی تھیں اور اندازہ کر لیا تھا کہ اب ہوا کا رُخ کیا ہوگا۔ وہ قدامت بیزار شاید کبھی نہیں رہے۔ رفتار و گفتار اور افکار و خیالات، غرض کہ ہر لحاظ سے وہ پُرانے پن کے قدر شناس اور قدرداں رہے ہیں۔ ادب میں بھی کلاسکی روایتوں کی پرستاری اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ بیش تر نئے ادیبوں، اور شاعروں کے متعلق اُن کی رائے تحقیر آمیز رہی ہے (یہ بات مَیں ذاتی علم کی بنا پر لکھ رہا ہوں) لیکن جدیدیت کی طرف داری اور سرپرستی تحریک کے توسط سے اس طرح کی گئی جیسے وہ اُس کے واقعی ہوا خواہ ہوں۔ بات یہ تھی کہ اس طرح وہ ایک تو نئے لوگوں میں تحریک کے لیے جگہ بنا سکتے تھے اور دوسری طرف اشتراکیت سے جوان کی منصوبہ بند معرکہ آرائی تھی، اُس میں جدیدیت کی سرپرستی سے ادبی سطح پر بہت مدد مل سکتی تھی۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ حالات کا

صحیح طور پر اندازہ کر لینا اسی کو کہتے ہیں ——— ہاں، اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجیے کہ مِتّل صاحب نے اپنے خیالات کی طرح اپنی شاعری پر بھی جدیدیت کی پرچھائیں نہیں پڑنے دی۔ دوسروں کی ہمت افزائی کرتے رہے لیکن خود کلاسکی آب و رنگ سے معمور شعر کہتے رہے۔ خود شناسی اور معاملہ فہمی شاید اسی کو کہتے ہیں۔

مِتّل صاحب کی زندگی کا دوسرا رُخ وہ ہے جو شعر و شاعری سے عبارت ہے۔ یہ واقعی افسوس کی بات ہے کہ اُن کی رنگارنگ مصروفیتوں نے شاعری کی طرف اُن کو کماحقہٗ متوجہ نہیں ہونے دیا، اس کے باوجود اُن کے مجموعۂ کلام میں غزل کے ایسے متعدد اشعار موجود ہیں جن کو کسی بھی اچھے انتخاب میں بہ آسانی شامل کیا جا سکتا ہے اور یہی صورت بعض نظموں کی ہے۔ زبان پر جو قدرت اُن کو حاصل ہے، بیان کے اسلوب پر وہ جس طرح قابو یافتہ ہیں اور شاعری کے عیب و ہنر سے وہ جس قدر باخبر ہیں، اس کے پیشِ نظر یہ بات بہ آسانی کہی جا سکتی ہے کہ وہ اگر اسی فن کے ہو رہتے تو اپنے معاصرین میں ممتاز حیثیت حاصل کر سکتے تھے۔ شاعری کی مشکل یہ ہے کہ شرکتِ غم اس کو راس نہیں آتی۔ مِتّل صاحب نے اپنے ابتدائی زمانے کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک اخبار کے ایڈیٹر نے بہ سلسلۂ ملازمت اُن سے پوچھا کہ: "کیا تم سیاسی موضوعات پر بھی نظمیں کہہ سکتے ہو؟ میں نے کہا ہاں، تو بولے: لیکن نظم تو موڈ آنے پر ہی کہی جا سکتی ہے۔ میں نے کہا: لالہ جی! شاعری میری محبوبہ نہیں، بیوی ہے! مجھ سے کبھی انکار نہیں کرتی۔" لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاعری کی حیثیت محبوبہ کی سی ہوتی ہے، جس کی ہر طرح نازبرداری کرنا پڑتی ہے۔

مِتّل صاحب کے کلام کا مجموعہ "صحرا میں اذان" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے میں غزلوں کے کچھ ایسے اچھے اچھے شعر ہیں اور بعض نظمیں اس قدر عمدہ ہیں کہ بے اختیار ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے ان کے اس تغافل پر جس کو شاعری کے ساتھ روا رکھا گیا۔ مِتّل صاحب نے شاعری میں تجربے نہیں کیے، احساس اور جذبے کو شعر کی زبان دے دی ہے۔ ان کا شعری مزاج سراسر کلاسکی ہے اور اس رنگِ خاص میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے، وہ قابلِ قدر ہے۔ میں یہاں سے محض مثال کے طور پر اُن کی غزلوں سے چند شعر پیش کرنا چاہوں گا:

اب شکوۂ سنگ و خشت کیسا
جب تیری گلی میں آ گیا ہوں
مشکل نہیں ترکِ عشق، لیکن
اس کا بھی مآل جانتا ہوں

سکوں ہے گھر میں، مگر اس کی لذتیں مت پوچھ
وہ زندگی جو سرِ رہ گزار گزری ہے

ٹوٹا ہے اپنے زعمِ وفا کا طلسم آج
محسوس ہو رہا ہے کہ تو بے وفا نہ تھا

اِس لیے چپ ہوں کہ بات اور نہ بڑھ جائے کہیں
ورنہ سچ یہ ہے کہ کچھ تم سے گلہ ہے تو سہی

اُس کی بیداد کے ہر ذکر کے ساتھ
اُس کی ایک ایک ادا یاد آئی
شکریہ ناصحِ مشفق، کہ پھر آج
اپنی رُودادِ وفا یاد آئی

یوں دل کو چھیڑ کر نگہِ ناز جھک گئی
چھپ جائے جیسے کوئی کسی کو پکار کے

مجھے زندگی کی دُعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

مَیں نے اس سے پہلے یہ کہا ہے کہ زبان پر ان کو قدرت حاصل ہے اور بیان کے اسلوب پر وہ قابو یافتہ ہیں (کلاسکی طرز کی غزلیہ شاعری میں جس کی بنیادی اہمیت ہے) اس کے ثبوت میں ان کی ایک غزل کے دو تین شعر پیش کرنا چاہوں گا، جس کی ردیف "چاندنی" ہے:

جلوہ طراز بام پہ ہے کون رشکِ ماہ
وہ کثرتِ جمال ہے، ششدر ہے چاندنی
آرامِ جاں بھی، راحتِ قلب و نظر بھی ہے
کیا تیرے التفات کا پیکر ہے چاندنی
اب ضبط و احتیاط کا یارا نہیں رہا
تو ہم سفر ہے اور فسوں گر ہے چاندنی

نظموں میں اُن کے یہاں نئے پن کا احساس کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ اُن کے مذکورہ مجموعے میں کئی نظمیں ایسی ہیں جن کو اُردو کی اچھی نظموں میں شمار کرنا چاہیے۔ اس مختصر تحریر میں اس کی گنجایش نہیں کہ کسی نظم کو نقل کیا جا سکے۔ ان کی کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں بیان کا حسن پایا جاتا ہے اور خیال کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ نظمیں اُس تکرار اور طوالت سے معرا ہیں جن سے نظم میں بکھراؤ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ بیان نے خیال کی مناسبت سے وسعت پیدا کی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ لفظوں کے انتخاب اور صرف میں نسبتوں کو اور شاعرانہ کفایت شعاری کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

وضع داری، اُردو دوستی اور ذہن و خیال کی وسعت اُن کی شخصیت کے اہم اجزا ہیں، لیکن ان پر دوسرے لوگ اظہارِ خیال کریں گے، کیوں کہ یہ باتیں بجائے خود وسعتِ بیان کی طلب گار ہیں، البتہ میں پچھلے بیس بائیس برس کی ملاقات اور تجربے کے بعد یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کھرے پٹھانوں کی طرح اُن کے یہاں بھی دوستی کو نبھانے اور بات پر اڑ جانے کے شدید جذبات کارفرما رہتے ہیں۔ وہ پٹھانوں کی طرح بہت اچھے دوست بن سکتے ہیں اور اُتنے ہی بُرے دشمن بھی۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہ ضرورت کے وقت اُس مصلحت اندیشی سے اور اُسی سوجھ بوجھ سے بھی کام لے سکتے ہیں اور کام لیتے ہیں جن سے وہ بیگانۂ انجام قوم ہمیشہ سے محروم رہی ہے۔

میرے اُن کے مراسم پر اب دو دہائیوں سے زیادہ زمانہ بیت چکا ہے۔ یہ مدت کافی ہوتی ہے کسی کے جوہرِ ذاتی کھلنے کے لیے۔ میں نے ان کو وضع داری کا قائل، دوست داری کے آداب سے آشنا، اظہارِ رائے میں بے باک اور اُردو کی محبت سے سرشار پایا ہے۔ کم لوگوں میں اتنی صفات یک جا ملتی ہیں۔ وہ پھبتی کہنے میں، جملے چست کرنے میں اور بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی بلکہ لطیفہ تراشی میں بے مثال صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اُن کے احباب اُن کی ان صلاحیتوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ وہ اس سادگی و صفائی کے ساتھ جملہ چست کر جاتے ہیں کہ دوسرے کو ذرا دیر میں اُس کی خبر ہوتی ہے۔ البتہ یہ میں جانتا ہوں کہ ان سب صفات کے ساتھ اور ساری مادّی آسودگیوں اور آسایشوں کے باوجود اندر سے اُن کا وجود بکھرا ہوا سا ہے اور دل پر کچھ داغ ہیں جو کسی گزرے ہوئے زمانے کی نشانی ہیں۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ دلِ جراحت آشنا اُن کے ساتھ رہا، ورنہ اس کا قوی امکان تھا کہ بصورتِ دیگر وہ صرف اچھے دنیادار بن کر رہ جاتے اور یہ جو "کاروبارِ زیاں" کی بعض خوبیاں مختلف وقفوں میں اُن کے یہاں اپنے آپ کو نمایاں کر لیا کرتی ہیں یہ مرحوم ہو کر رہ جاتیں۔ اس بے کراں اور بے اماں شہر میں اب اُن جیسے لوگ کم رہ گئے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ وہ دنوں تک ہمارے ساتھ رہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس تمنا میں بہت سے لوگ میرے شریک ہوں گے۔

●●

انور سدید

گوپال متّل کا عقبی دیار

ڈاکٹر وزیر آغا نے "نردبان" کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ: "ہر فن کار کا ایک عقبی دیار ہوتا ہے" شاعر دُنیا کے کسی گوشے میں بھی چلا جائے یہ عقبی دیار اس کے رگ و ریشے میں سمایا رہتا ہے اور اپنی جھلکیاں اس کی تخلیقات میں بعض اوقات واضح طور پر اور بعض اوقات تمثالوں، علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کے وسیلے سے دکھاتا رہتا ہے۔ وہ دُنیا کے گوشے گوشے سے تجربات سمیٹتا ہے لیکن جب فن میں ان تجربات کی قلبِ ماہیئت کرتا ہے تو لاشعوری طور پر اس عقبی دیار کے گلی کوچوں میں ہی چہل قدمی کرنے لگتا ہے۔ اُردو شاعری میں اس کی خوبصورت ترین مثال میر انیس ہیں جو لکھنؤ کی محبت میں سر تا سر غرق تھے۔ انھوں نے سیّد الشہداء کا مرثیہ کہنے کی سعادت حاصل کی تو بلاشبہ مرثیے میں کوفہ و کربلا کا ذکر کیا لیکن مرثیے کے شعری عقب سے جو شہر جھانکتا ہے وہ کوفہ کے برعکس لکھنؤ ہے، عقبی دیار بقول وزیر آغا شعر کو ارضی ماحول بھی عطا کرتا ہے اور یہ تخلیق کا منبع اور مخرج بھی ہے۔

گوپال متّل کے فکر و فن اور فتوحاتِ ادب کا مطالعہ کریں تو واضح طور پر اس کا عقبی دیار لاہور نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گوپال متّل کا مرزبوم مالیر کوٹلہ ہے، اس کی ابتدائی تربیت میں لدھیانہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دو شہروں کا ذکر گوپال متّل کی خود نوشت میں تو موجود ہے لیکن اس کی شاعری میں یہ دونوں شہر اپنی جھلک

کہیں بھی نہیں دکھاتے، اس کی خود نوشت کی حیثیت تاریخی ہے لیکن اس میں بھی ان شہروں کے لیے گوپال متّل کی محبت کا زاویہ کہیں نہیں اُبھرتا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے ہاں اُن شہروں کے بارے میں تلخی کا رویّہ زیادہ نمایاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ریاستِ مالیرکوٹلہ کے حکام نے رسالہ "کارنامہ" کا ڈیکلریشن قبول کرنے کے بجائے اسے انکار اور اثبات کی کسی واضح منزل پر پہنچائے بغیر خاموشی اختیار کر لی تو گوپال متّل کے دل میں اس ماحول کے خلاف جہاں فرد کو اپنی آواز نکالنے کی اجازت بھی نہیں تھی شدید منفی ردِّعمل پیدا ہوا۔ گوپال متّل نے اپنے ادبی ذوق کی پرورش کے لیے لدھیانہ سے رسالہ "صبحِ امید" نکالا لیکن اس شہر نے "صبحِ امید" کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی۔ خسارے کا یہ تجربہ گوپال متّل کے لیے خاصہ گراں اور ناگوار ثابت ہوا اور بقول شخصے اس کے گلے میں کئی مصیبتیں ڈال گیا۔ چنانچہ اُس زمانے میں جب اس کی انا کا نرم و نازک پودا ابھی برگ و بار ہی نکال رہا تھا کہ وہ خود شکستگی کی زد میں آ گیا۔ اس دَور میں علم و ادب کی پیاس اسے لاہور کھینچ لائی، یہاں اسے احسان دانش، نہیم بیگ چغتائی، حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اختر، مولانا تاجور نجیب آبادی اور صدہا دیگر ادیبوں کی صحبتیں حاصل ہو گئیں تو گویا صحرا میں ہولے ہولے بادِ نسیم چلنے لگی اور گوپال متّل کو یک گونہ اطمینان نصیب ہو گیا۔

مالیرکوٹلہ میں اظہار و بیان کی جو آزادی مفقود تھی گوپال متّل کو وہ آزادی لاہور میں وافر مقدار میں میسّر آئی۔ متحدہ ہندوستان میں لاہور نہ صرف علم و ادب کا گہوارہ تھا بلکہ بہت سی ادبی، سیاسی اور معاشرتی تحریکوں کا محور بھی تھا۔ ایک طویل عرصے تک لکھنؤ اور دلّی اُردو کے اہم ترین مراکز شمار ہوتے رہے تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد ان عظیم شہروں کی عظمت کو شدید ترین صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے لاہور کی طرف رُخ کیا تو اپنے ساتھ اُردو کی ولایت بھی اُٹھا لائے۔ چنانچہ اب آہستہ آہستہ اُردو ادب کی قافلہ سالاری لاہور کو ہی تفویض ہوتی چلی گئی۔ اس شہرِ بے مثال نے جدید اُردو نظم کی تحریک انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے اُٹھائی تو اس کو عروج کی دَور میں داخل کرنے کے لیے سب سے زیادہ خدمات تصدق حسین خالد، ن۔ م۔ راشد، میراجی، یوسف ظفر، اور قیوم نظر نے سرانجام دیں۔ آزاد اور حالی کے فکر و نظر میں جو انقلابی تبدیلیاں آئی تھیں ان میں لاہور کے قیام اور انجمن پنجاب کے مشاعروں کی اہمیت کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ جب لکھنؤ میں غزل بولتے ہوئے بدن کی جمالیات کا مرقع بن چکی تھی اور دلّی اس جمالیات کے داخلی زاویے کو فروغ دینے میں مصروف تھا لاہور میں شاعری کی کایا پلٹ چکی تھی اور اب یہاں شاعری کا مقصد صرف احساسِ جمال کی تسکین ہی نہیں تھا بلکہ شاعری کو اپنے زمانے کا ترجمان بنانے اور حیات و کائنات سے براہِ راست استفادے کا رجحان بھی فروغ پا چکا تھا۔ اب ادیب محض اظہار کے تقاضے ہی پورے نہیں کرتا تھا بلکہ شعر کے بطون میں اپنے ردِّعمل کو سمونے اور اپنے عہد کی صداقت کو ڈھالنے کا فریضہ بھی سرانجام دیتا تھا۔

اُردو ادب میں گوپال متّل کی اوّلیں نمود اسی حیات افروز دَور میں ہوئی۔ یہ دور نیازمندانِ لاہور کے آزادہ فکری اور خوش طبعی اور تاریخ نگاری کا دَور تھا، اس دَور میں ادب کی ایک قندیل مولانا تاجور نجیب آبادی نے بھی روشن کر رکھی تھی، اس کا کلاسیکی زاویہ اس عہد کے مشاعروں میں اور جدیدیت کا زاویہ ان کے رسالہ "شاہکار" سے ظاہر ہوتا تھا۔ گوپال متّل

نے ان سب سرچشموں سے استفادہ کیا۔ اس کے ہاں کلاسیکیت اور جدیدیت کا جو امتزاج نظر آتا ہے اس کے انکھوے مولانا تاجور نجیب آبادی اور رسالہ "شاہکار" سے ہی پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاہم اس کے ہاں اختلاف کو ابھارنے، اس پر زندہ دلی سے تبصرہ کرنے اور پھر مسلسل پھبتی کھانے کا جو حوصلہ موجود ہے، اس کی جہت نیاز مندانِ لاہور کی پیدا کردہ فضا کی عطا نظر آتی ہے۔

اس دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ادیب اور شاعر کو نمایاں ہونے اور اپنی ادبی شخصیت کو تسلیم کرانے کے لیے جانکاہ محنت سے کام لینا اور ریاضِ فن کے طویل مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ مشاہدے کی وسعت اور گہرائی کے ساتھ ساتھ اسے ادب کے قدیم سرچشموں تک رسائی اور کلاسیکی خزینوں کی گہری کھدائی کرنی پڑتی تھی۔ اساتذۂ فن کا عالم یہ تھا کہ وہ نئے لکھنے والوں کو اپنی ذاتی فیکٹری کی ڈھلی ہوئی غزلیں عطا نہیں کرتے تھے بلکہ جہاں جوہرِ قابل نظر آتا اس کی پذیرائی دل و جان سے کرتے اور پھر اس کی فنی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ گوپال مِتّل کا شمار بھی ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ریاضتِ فن کے بیشتر مراحل لاہور میں ہی طے کیے۔ چنانچہ اس کے ہاں لفظ کا گھونگھٹ الٹنے اور اس کے بطون سے معنی کی شفق اچھالنے کا جو انداز موجود ہے وہ اس ریاضِ فن کا ہی قیمتی ثمر نظر آتا ہے۔

گوپال مِتّل کی ادبی شخصیت کو چمکانے میں لاہور کی صحافت کے مخصوص ماحول نے بھی مثبت کردار ادا کیا ہے۔ رسالہ "صبح امید" اور ماہنامہ "شاہکار" سے روزنامہ "نیشنل کانگریس" کی طرف اور پھر دہلی کے متعدد روزنامہ اخبارات سے رسالہ "تحریک" کی طرف گوپال مِتّل کی مراجعت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس نے زندگی کے تجربات اور نوادرات سمیٹنے کے لیے نسبتاً وسیع سمندر میں غوطہ لگایا۔ زمانے کے گرم سرد کو اپنی زبان سے چکھا۔ بادِ حوادث کے تھپیڑے اپنے سینے پر سہے لیکن اپنے باطن میں پرورش پانے والے ادیب کا گلا نہیں گھونٹا۔ بلاشبہ صحافت گوپال مِتّل کا زادِ حیات بنی۔ لاہور نے غیور اور خوددار گوپال مِتّل کو باوقار صحافی بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اس میدان میں اس کی خدمات مرصّع اور بوقلموں ہیں تاہم گوپال مِتّل کی فطرت کا اصلی روپ اس کے ادب میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جب اپنی آواز کا لہرا انسانوں کے جنگل سے اٹھاتا ہے تو یہ صدا دور تک جاتی ہے راستہ بھولے ہوئے کارواں اس اذان کو غور سے سنتے ہیں اور اپنے سفر کی سمت متعین کر لیتے ہیں۔

متذکرہ بالا زاویوں سے دیکھیے تو لاہور گوپال مِتّل کے لیے گہوارۂ ادب ہی نہیں ماں کی گود بھی بنی۔ وہ حوادث کے تھپیڑے کھاتا ہوا لاہور پہنچا تو اس مادرِ مشفق نے اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر رکھا۔ یہاں اسے زندگی کا کوہ گراں جدّوجہد سے تراشنے کا سبق ملا۔ روزگار کے مواقع میسر آئے، اپنے فطری ذوق کی پرورش کی سہولت حاصل ہوئی۔ مخلص دوستوں کا ایک وسیع حلقہ مرتب ہوا۔ چنانچہ لاہور آہستہ آہستہ گوپال مِتّل کی روح میں اترتا اور اس کے رگ و ریشے میں سماتا چلا گیا۔ اس شہر کی تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی فضا نے اس کے ذہن پر جو نقوش مرتب کیے وہ اتنے پختہ تھے کہ ان کی نمود گوپال مِتّل کی شاعری میں بھی ہوئی اور اس نے اپنی یادوں کو "لاہور کا جو ذکر کیا" میں سمیٹا تو ایک زندہ و پائندہ عہد کے آثار سطح پر ابھر آئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب گوپال مِتّل لاہور میں زندگی کے ہنگامہ خیز دن گزار رہا تھا تو اسے شاید یہ علم نہیں تھا کہ لاہور اس کی روح میں اتر چکا ہے۔ اس کے ہر بن مو کو گرفت میں لے چکا ہے۔ اس کی جذباتی زندگی کا اٹوٹ انگ بن چکا ہے۔ یہ احساس تو اس وقت جاگا جب اسے لاہور سے مفارقت اختیار کرنا پڑی۔ اور اپنی جڑیں لاہور کی

دھرتی سے نکال کر ایک اور زمین میں اگا نا پڑیں۔

آزادی کے بعد گوپال متل نے اپنا رُخِ حیات دلی کی طرف موڑ لیا تھا۔ دلی لاہور کے مقابلے میں بڑا شہر ہے لیکن اس بڑے شہر میں گوپال متل کو لاہور جیسا سکون حاصل نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گوپال متل نے ہجرت کے بعد زندگی کا کٹھن سفر تنہا طے نہیں کیا بلکہ اس کا ہم سفر وہ احساسِ ملال بھی ہے جو لاہور کی فرقت کے وقت پیر تسمہ پا کی طرح اس کے دل پر بیٹھ گیا تھا، اور جس کی جراحت میں پینتیس سال کے بعد بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ گوپال متل کی شاعری چونکہ سچ بولتی ہے اس لیے متذکرہ ملال کے نقوش اس میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نے لکھا ہے:

اب کڑی دھوپ کا شکوہ کیسا
اب گلہ کیا ہے مقدر میں اگر
سایۂ گیسوئے دلدار تو کیا!
کسی دیوار کا سایہ بھی نہیں!

اسے یہ احساس بھی کھائے جا رہا ہے کہ:

یہ دل اب خرابہ ہے
ایسا خرابہ
کہ برگِ مسرت تو کیا اس میں خارِ الم تک نہیں ہے
نہ جشنِ بہاراں
نہ ماتم خزاں کا

اس احساس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ:

فقط اک شغلِ بے کاری ہے اب بادہ کشی اپنی
وہ محفل اٹھ گئی قائم تھی جس سے سرخوشی اپنی

گوپال متل نے لاہور سے دائم جدائی کو زندگی کا جبر شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

زندگی ترا کہنا مان ہی لیا میں نے
دیکھ ترکِ الفت کا زہر پی لیا میں نے
زخم جو یہ سینے کا بن گیا ہے اب ناسور
چاک تھا گریباں کا جس کو سی لیا میں نے
اب کسی کو کیا بتلاؤں دل پہ اپنے کیا گزری
زندگی فریضہ تھا اور جی لیا میں نے

اس عالم میں گوپال متل کے ہاں جس ٹھوس تمثال نے جنم لیا ہے وہ سُونا مکان ہے۔ اور جو شخصی تصویر سامنے آتی ہے

وہ ایک ایسے مسافر کی ہے جو آشوبِ سفر میں مبتلا ہے لیکن جس کے سامنے نہ جادہ ہے اور نہ منزل :

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سُونے مکان کا دِیا ہوں
منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں
محمل بھی نہیں کوئی نظر میں
صحرا کی بھی خاک چھانتا ہوں

اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب
اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

اب وہ نہیں ہے جلوۂ شام و سحر کا رنگ
تیرا جمال شاملِ حسنِ نظر نہیں!

دلچسپ بات یہ ہے کہ مفارقت کے اس عالم میں گوپال متّل کے ہاں جاں کاہ تنہائی دُور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس تنہائی میں جب گوپال متّل کے دل پر اس کا عقبی دیار دستک دیتا ہے تو یہ صدائے رفتگاں معلوم نہیں ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سانسوں کے جھمیلے میں کھوئی ہوئی شفقتوں اور گم شدہ محبتوں کو جگا رہا ہے۔ اس عالم میں جب اس کی یادیں تخلیق کی نیت میں شامل ہو جاتی ہیں تو اس عقبی دیار کے سامنے گوپال متّل اپنا سر عقیدت و احترام سے جھکا دیتا ہے اور اس کے لبوں سے جو اشعار نکلتے ہیں ان میں اس دیار کی عظمت کا اعتراف اور اس کی سلامتی کے لیے دعا موجود ہے :

سلام تیری ہوا کو تری فضا کو سلام
ہے جن کی دین مرا ذوقِ شعر و نغمہ گری
خلوصِ دل سے دعا ہے رہے قیامت تک
ستاروں کے ستاروں سے تیری مانگ بھری

میں اپنے عزم کی سوگند کھا کے کہتا ہوں
ہر ایک نغمۂ دل کو رجز میں ڈھالوں گا!

جو تو شفیق ہے مَیں بھی غیور بیٹا ہوں　　　قلم کی نوک کو نوکِ سناں بناؤں گا[1]

تاہم یہاں بھی احساسِ ملال گوپال مِتّل کے ذہن و دل پر حاوی نظر آتا ہے اور وہ برملا کہتا ہے:

دلِ ناکام میسّر تجھ کو
صرف دیوار کا سایہ ہی نہیں
سائۂ گیسوئے دلدار بھی تھا
تو نے اک منزلِ موہوم کی دُھن میں ناداں
وہ سکوں زارِ وفا چھوڑ دیا
اپنا پیمانِ وفا توڑ دیا

گوپال مِتّل کی معرکہ آرا کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" بظاہر کچھ جگ بیتی اور کچھ آپ بیتی ہے لیکن حقیقت میں یہ کتاب صد رنگ آئینوں کا ایک ایسا متواج سمندر ہے جس کی ہر لہر اپنے ساتھ سینکڑوں خوش رنگ منظر لاتی ہے اور ان مناظر سے لاہور کے فطری مزاج کو آشکار کر دیتی ہے۔ اس کتاب کے باطن سے جو مرکزی شخصیت ابھرتی ہے وہ لاہور کی شخصیت ہے۔ گوپال مِتّل تو اس مرکزی شخصیت کا ایک استعارہ ہے۔ لیکن اتنا بلیغ استعارہ کہ اس کے بغیر لاہور کے نقوش مرتب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ صاف نظر آتا ہے کہ گوپال مِتّل کے مزاج میں جو کج کلاہی نظر آتی ہے وہ اسی عقبی دیار کی عطا ہے۔ وہ داتا گنج بخش کے مزار پر دھمال ڈالنے والا قلندر ہے اور دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ بڑے سے بڑے سرمایہ دار کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جونہی کوئی شخص اس پر حملہ زن ہوتا ہے وہ دشمن کے وار کو اپنی انا کی ڈھال پر سہتا ہے اور جھکنے کے بجائے شجرِ حیات کو نسبتاً کھلی فضا میں پرفشاں کر ڈالتا ہے۔ لاہور کا مزاج بھاٹی دروازے کا زائیدہ ہے۔ اس کے خمیر کو موچی دروازے کی سیاسی فضا نے پروان چڑھایا ہے۔ اس کے بدن میں دلّی دروازے کے کھلے میدان میں لگنے والے میلوں کی گہما گہمی اور شاہ حسین کے چراغوں کی لَو ہے۔ گوپال مِتّل نے اپنے عقبی دیار کے ان زاویوں کو ایک مخلص فرزند کی طرح اپنے دل میں اتارا ہے۔ چنانچہ جب وہ دیوندر ستیارتھی کے ساتھ علمی مذاق کرتا ہے تو وہ ایک خوش ذوق تماشہ پسند نظر آتا ہے۔ کرشن چندر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں ذہانت اور فطانت کا زاویہ موجود ہے۔ میرزا ادیب کے ساتھ جملوں میں اس کی خیال آفرینی کا عنصر نمایاں ہے۔ ترقی پسند تحریک کے اختلاف میں وہ قلعۂ لاہور کی طرح مضبوط، توانا اور سربلند ہے اور اس کے مخالفین تا حال اس قلعے میں نقب نہیں لگا سکے۔ وہ بڑی سے بڑی بات کو معمولی تصور کرتا ہے اور ہر مشکل کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سب سے اہم اس کی حسِ مزاح ہے جو زہر خند سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ زندگی کے بطون سے ابھرتی ہے اور پورے منظر پر شگوفوں کی طرح تبسم کی پھوار بکھیر دیتی ہے۔

مجھے گوپال مِتّل سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن جب اس کا رسالہ "تحریک" آتا تھا تو مجھے اکثر اوقات یوں محسوس ہوتا کہ انصاری مارکیٹ دہلی سے لاہور کی مہک اٹھ رہی ہے۔ اس مہک کا دوسرا نام گوپال مِتّل ہے۔ جو آج بھی اپنے عقبی دیار میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

---

[1] جیسا کہ وزیر آغا کے مضمون میں وضاحت کر دی گئی ہے اس نظم کا تعلق لاہور سے نہیں ہے۔ یہ اس وقت لکھی گئی تھی جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا ویسے یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ لاہور مِتّل صاحب کے ذہن پر حاوی ہے۔ اور اس کا اعتراف انھوں نے کھل کر کیا ہے۔ (مرتب)

شین کاف نظام

متّل صاحب کو جیسا سمجھا

متّل صاحب سے متعلق لکھے گئے ایک مضمون میں مَیں نے پڑھا ہے کہ کسی[1] مشاعرہ میں شراب بندی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جب مرحوم جوش ملیح آبادی نے مندرجہ ذیل رباعیات پڑھیں :

آتے نہیں جن کو اور دھندے ساقی
اوہام کے بنتے ہیں وہ پھندے ساقی
جس مے کو چھڑا سکا نہ اللہ اب تک
اس مے کو چھڑا رہے ہیں بندے ساقی

---

[1] یہ مشاعرہ لال قلعے میں سالہ ۱۹۵۱ء کو جشنِ جمہوریت کے سلسلے میں ہوا تھا اور براہِ راست نشر ہو رہا تھا گوپال متّل صاحب کو جوش صاحب کے شعروں سے کہیں زیادہ ان کا ترددِ ناگوار گزرا - اتفاق کی بات ہے کہ حاضرین نے متّل صاحب کے شعروں پر بے تحاشہ داد دی اور ہر شعر کو تین تین چار چار بار پڑھوایا گیا۔ گوپال متّل صاحب نے اس نظم کو نہ تو اپنے مجموعۂ کلام میں شامل کیا ہے اور نہ کبھی اس واقعے کا ذکر ہی کرتے ہیں۔ (مرتب)

اے ترکِ شراب کے سیہ قلب وکیل
تو جبرِ حکومت کو سمجھتا ہے دلیل
تیری دہشت سے چھوڑ دے گا پینا
انساں کو اس قدر سمجھتا ہے ذلیل

واقف بھی ہیں آپ؟ زندگی ہے گرداب
آنسو کی طرح غریب پیتے ہیں شراب
جو وقت ہے دراصل ترس کھانے کا
اس وقت بھی اعتراض کرتے ہیں جناب

کہتے ہیں، دل رہینِ مستی نہ رہے
کمبخت کو جھوٹی تشفی نہ رہے
کھاتا ہوں، شراب پی کے، عشرت فریب
یاروں کی تمنا ہے کہ یہ بھی نہ رہے

یہ حکم نہ بن جائیں فسانے تو سہی
اس ڈانٹ سے ابھریں ترانے تو سہی
مے خانوں کو اے جیل بنانے والو
جیلیں نہ بنیں شراب خانے تو سہی

آنا تو صُراحیاں گرا کر آنا
انگور کی بیل تک جلا کر آنا
مجھ رند کے منہ پہ تھوک دینا جس روز
انساں سے مے کشی چھڑا کر آنا

تو سامعین اُن کے جرأتِ اظہار پر آہ آہ اور فنِ شعرگوئی پر واہ واہ کا فلک شگاف نعرہ بلند کرنے لگے لیکن گوپال متل صاحب کو جوش صاحب مرحوم کی یہی جرأت بزخود غلط معلوم ہوئی اور انھوں نے ان کے خیالات کی تردید میں جوابی احتجاج فی البدیہہ اشعار میں کیا اور داد و تحسین حاصل کی وہ اشعار یہ تھے:

وطن میں ہو اگر عیش و مسرت کی فراوانی
مجھے کیا گر کوئی لطفِ مئے گلفام لیتا ہے
مگر جب قوم کے ہاتھوں میں ہو کاسہ گدائی کا
کوئی خود دار اپنے ہاتھ میں کب جام لیتا ہے
کمر بستہ وطن ہو جب پئے تکمیلِ آزادی
وہ بے غیرت ہے جو ساقی کا دامن تھام لیتا ہے
شرابِ ناب کیسی شیرِ مادر ہے حرام اس پر
جو ایسے وقت میں بادہ کشی کا نام لیتا ہے

معلوم نہیں ان اشعار کا جوش مرحوم کے پرستاروں پر کیا اثر یا ردِ عمل ہوا لیکن اس واقعہ سے شبل صاحب کے کردار کا ایک یہ پہلو ضرور سامنے آتا ہے کہ ان کا کردار چند اقدار سے عبارت ہے اور ان اقدار کی اہانت برداشت کرنے سے وہ قطعاً قاصر ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار، مجمع اور ماحول کی پروا کیے بغیر کرنے کی ہمت اُن میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

میرے نزدیک سچے فن کار کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں سلیقے سے کہنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ سچ بولنے کی بھی ہمت ہو۔ "بادشاہ ننگا ہے" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے وہ مصلحت و مضرت کو مدِ نظر نہیں رکھتا۔ فن کار اور سیاسی شخص میں بھی یہی فرق ہے۔ سیاسی شخص موقع کا منتظر رہتا ہے اور فن کار موقع کی پروا نہیں کرتا۔ جن لوگوں کا شبل صاحب کی تحریروں سے سروکار رہا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ وصف اُن کے یہاں ان کے معاصرین کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔

مارکسی مفکر نقاد والٹر بنجامن (WALTER BENGAMIN) نے ایک بار کہا تھا:

FASCISM 'AESTHETICIZES POLITICS', WHEREAS COMMUNISM 'POLITICIZES ART'.

مجھے شبل صاحب کا احتجاج بنجامن کے اس قول کی تفسیر و تجسیم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ اکثر لوگ سوچتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ شبل صاحب ادیب کو راہب بن کر دوسویا نیر و متصور کرتے ہیں۔ وہ ادیب کی سیاسی اور سماجی ذمہ داریوں کے منکر یا منحرف نہیں لیکن ان ذمہ داریوں کو ادبا کے گلے منڈھنے کی سعی سے متنفر ہیں اس لیے وہ ان لوگوں کی مذمت کرتے ہیں جو زبردستی سوسائٹی، تہذیب اور تمدن کو کپڑے پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے یہ بات آئینہ ہوتی ہے کہ اُن کے نزدیک ادیب کا بنیادی کام ادب تخلیق کرنا ہے۔ آئیڈیالوجی انگیز نا نہیں۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے: "ادب کا بنیادی مقصد احساسِ جمال کی تسکین ہے" اور: "ادب مقصود بالذات ہونے کے باوجود سماجی فریضے کا حامل ہوتا ہے اس سے قوم کے احساسِ جمال کی تسکین ہوتی ہے۔ اس کا ذہنی توازن برقرار رہتا ہے" ان خیالات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ادب ان کے نزدیک تہذیب کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔

متین صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے : " ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ادیب کا بھی اپنا ضمیر ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کے تقاضے ہوتے ہیں جن کی وہ تکمیل چاہتا ہے۔ وہ ادب کے ذریعہ صرف اپنے انفرادی شخصیت کا اظہار ہی نہیں چاہتا بلکہ صداقت کی تلاش بھی کرتا ہے۔ اب اگر اس کا ماحصل فلسفی اور سیاست داں کی تلاش سے مختلف نکلتا ہے تو ان دونوں گروہوں کو اس پر جز بز ہونے کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ ادیب بیچارہ منکسر المزاج ہوتا ہے اور اپنے دعاوی میں ان دونوں حضرات کی طرح بلند آہنگ نہیں ہوتا "

انفرادی شخصیت کا اظہار و تکمیل یا صداقت کی تلاش ایسی اصطلاحات ہیں جو اجتماعیت کے عاشقوں کے گلے میں اٹکتی ہیں اور آنکھوں میں کھلتی ہیں۔ دروں بینی کو کور چشمی کا نتیجہ اور بروں بینی کو دور اندیشی کا ثمرہ سمجھنے والوں کو متین صاحب کے ایسے خیالات ضرور پریشاں کریں گے کہ : " ادبِ عالیہ ہمیشہ داخلی عمل ہوتا ہے جس میں شعوری کوشش سے کہیں زیادہ تحت شعور کو دخل ہوتا ہے۔ اس کا نہ کوئی افادی پہلو ہوتا ہے نہ سماجی مقصد "

متین صاحب کے مخالفین کی مصیبت یہ ہے کہ وہ مغرب کے ادھ کچرے اور جلدی جلدی چبانے کے باعث معدے کے لیے ناقابلِ قبول علم میں ملوث ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے محسود کو مغرب زدہ خیال کرتے ہیں۔ مغربی اندازِ نظر اور زاویۂ فکر یہ بتاتا ہے کہ فن شخصیت سے گریز کا نام ہے جب کہ مشرقی مفکرین و فن کاروں کے نزدیک فن شخصیت کی شناخت اور تلاش کا نام اور اسی کے توسط سے صداقت کو حاصل کرنے کی سعی سے عبارت ہے۔ لیکن آئیڈیالاجی کا اپنا مزاج ہے۔ اس کے اپنے اصول ہیں۔ اس لیے یہ سب باتیں جانتے ہوئے بھی بُرا تو متین صاحب ہی کو کہنا ہوگا نہ ؟ خیر ــــــــ آئیڈیالاجی کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہ جب تشکیل و تعمیر کے مراحل سے گزرتی ہے تو انسان کو مرکزی مقام عطا کرتی ہے لیکن جب وہ ظلِ عاطفت بن کر انسانی زندگی میں نمودار ہونے لگتی ہے تو وہ انسان ہی کو غیر ضروری چیز سمجھنے کی مرتکب ہو جاتی ہے اور مرکزی حیثیت کے حامل ہی کو مکھی کی طرح نکال باہر کرتی ہے۔ آئیڈیالاجی کے آقا جس کا محبوب مشغلہ انسانی خیر سگالی کا ڈھول پیٹنا ہوتا ہے، برسرِ اقتدار ہوتے ہی سب سے پہلے جس چیز سے بدکنے لگتے ہیں وہ ہوتا ہے انسان یا اُس کا مطالبۂ آزادی۔ متین صاحب نے انسانی آزادی کے حق میں بار بار آواز بلند کی اور صلے میں پائی سفلی مخالفت۔ لیکن مختلف مخالف ہواؤں کے باوجود انھوں نے اپنے فکر کے چراغ کو بجھنے نہیں دیا یہ ہمارے عہد میں کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ انھوں نے کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ ادیبوں کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

> " کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ ادیبوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں جمہوری ادیب یہ مانتے ہیں کہ ادیب اپنے ضمیر کے ماسوا اور کسی کا پابند نہیں وہاں کمیونسٹوں کے نزدیک ادب سیاست کی لونڈی ہے اور ادیبوں پر کمیونسٹ پارٹی کے مقاصد کی تکمیل فرض ہے "

بات دراصل یہ ہے کہ متین صاحب کی فکر ایک ایسے جمہوری نظام کی طالب ہے جس میں انسان کو آزادی میسر آئے۔ آئنسٹائن نے کہا تھا کہ آزادی کا مطلب فقط روزی روٹی سے فراغت حاصل کرنا نہیں یہ تو اس کی پہلی شرط ہے۔ کسی بھی ملک یا معاشرہ کے لیے یہ ایک شرمناک بات ہوگی کہ اس میں زندگی کرنے والے افراد اس بنیادی آزادی کو حاصل کرنے میں ہی اتنے

کھو جائیں کہ دیگر شعبۂ حیات میں اُسے ترقی کے مواقع ہی میسر نہ آئیں۔ سیاسی شاطر اس خیال کو بھی مسخ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلے بنیادی آزادی تو مل جائے پھر دوسری چیزیں بھی دیکھ لیں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دوسری آزادی کی طرف انسان کو کہیں بھی متوجہ نہیں ہونے دیا گیا۔ اصل میں آگے پیچھے کا معاملہ ہے ہی نہیں۔ یہ دونوں متوازی ہیں۔ لیکن جیسے ہی کسی نے دوسری آزادی کی اہمیت و افادیت کی بات کہی وہیں اُسے رجعت پسند، زوال پسند، قدامت پرست جیسے القاب سے نوازا جائے گا۔ ترقی پسندی کا مطلب ہی ان کی پسند کو پسند کرنا ہے۔ مِتّل صاحب اس رویّے کی مذمت کرتے ہیں :

> "کمیونزم کی مخالفت کو منفی رویّہ قرار دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ جمہوریت کا ارتقا انسان کی ہزارہا سال کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس عظیم ورثے کا تحفظ اور اُسے مٹانے والی تحریکوں کی مخالفت بڑا ہی مثبت قدم ہے۔"

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جمہوریت کے امکانی خطرات و خدشات اُن کی نظر سے اوجھل ہیں ان کی طرف بھی انھوں نے بعض ایسے واضح اشارے کیے ہیں جو بعد میں سچ ثابت ہوئے :

> "جمہوریت کے لیے سب سے زیادہ خطرہ کا باعث یہ مریضانہ جذبہ ہے کہ آدمی مبتلائے پندار ہو کر یہ سمجھنے لگے کہ وہ خود نیکی کا مجاہد ہے اور اس کے مخالف ابلیس کے پیرو۔ یہ جذبہ بالآخر اسی کو ابلیس کا پیرو بنا کر دم لیتا ہے۔ جمہوریت کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ آدمی اس امکان کو مکمل طور پر کبھی نظر انداز نہ کرے کہ اس کی اپنی رائے غلط ہو سکتی ہے اور اس کے مخالفوں کی صحیح۔"

لیکن جو ادب کو پارٹی کے احکامات کا تابع یا اقدار کی بجائے اقتدار کا مرہونِ منت تصور کرتے ہوں وہ انسانی آزادی اور آزادی کے مطالبہ کو بھی ناجائز مطالبہ مانتے ہیں۔

مِتّل صاحب کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت مجھے سول بیلو (SAUL BELLOW) کا یہ قول بار بار یاد آتا ہے۔ اس نے کہا تھا :

> GENIUS IS ALWAYS, WITHOUT STRAIN, AVANT-GARDE ITS DEPARTURE FROM TRADITION IS NOT THE RESULT OF CAPRICE OR THE POLICY BUT OF AN INNER NECESSITY.

'صحرا میں اذان' کی نظموں اور شروعات کی غزلوں کی زبان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مِتّل صاحب میں کتنی تخلیقی توانائی ہے۔ میری محدود معلومات کے مطابق خورشید احمد جامی اور گوپال مِتّل ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں زبان میں غیر معمولی تبدیلی تب واقع ہوئی جب ان کے دیگر معاصرین یا تو شعر گوئی سے ہاتھ اٹھا چکے تھے یا قاری کو متنفر کر دینے کی حد تک اپنے آپ کو دہرانے لگے تھے۔ اس پر طرۂ امتیاز یہ کہ اس تخلیقی تبدیلی کے باعث نہ تو ذہن کے بگڑنے کی خبر لینا ضروری جان پڑا نہ ان کو صدا میر کی خجالت سے سر کھجانے کی ضرورت پیش آئی۔ اظہار اور تخلیق میں تبدیلی جاں نثار اختر مرحوم کے یہاں بھی آئی اور انھوں نے 'پچھلے پہر' اور 'گھر آنگن' میں جو شاعری کی ہے کہ اردو کے شعری ادب میں قیمتی اضافہ ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ اختر مرحوم کے یہاں تبدیلی تب واقع ہوئی جب جدیدیت کو اس کا اپنا لہجہ میسر

آچکا تھا جب کہ مثل صاحب یا جامی نے نیا راستہ تب اختیار کیا تھا جب جدید شاعری اپنا لہجہ حاصل کرنے میں کوشاں تھی۔ اس لیے ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کے یہاں تبدیلی شوقیہ یا سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کے مصداق نہیں تھی بلکہ وہ تبدیلی ان حضرات کے تخلیقی تقاضوں کا نتیجہ تھی۔ مثال کے طور پر مثل صاحب کے یہ شعر ملاحظہ ہوں:

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
مَیں سُونے مکان کا دیا ہوں
منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں
منصور، نہ دعویِ اناالحق
سُولی پہ مگر لٹک رہا ہوں

وارث علوی نے لکھا ہے کہ: "جدید شاعر، شاعری میں الفاظ کو 'خیالات' یا 'نظریوں' اور 'آدرشوں' کی ترسیل و تبلیغ کے لیے استعمال نہیں کرتا بلکہ الفاظ کے آبگینوں میں زندہ تصویروں کو قید کرنا چاہتا ہے۔" مندرجہ بالا اشعار میں: سونے مکان کا دیا، مصرف کے بغیر جلنا، منزل اور جادہ کا نہ ہونا، اس کے باوجود سفر کے آشوب میں مبتلا ہونا، نہ منصور ہونا، نہ دعویِ اناالحق کرنا، اس کے باوجود سولی پر لٹکنا۔ ایسی کیفیات ہیں جو نہ صرف یہ کہ بیسویں صدی کے انسان کے المیے کی تصویریں ہیں بلکہ ان میں الفاظ کا انتخاب و انسلاک قاری کو یہ سمجھنے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتا ہے کہ شاعر عصری ادراک کو فن بنانے میں کامیاب ہے اور ہم عصر انسانی فکر اور سماج میں اس کی حیثیت کسی اجنبی کی سی نہیں ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ اس کا لہجہ اس قدر منکسر اور مجبوری کا مظہر ہے۔ ڈبلو۔ ایچ۔ آڈن نے جدید شاعری کے بنیادی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی بنیادی شناخت INTIMATE TONE OF SPEECH ہے۔ مثل صاحب کے اشعار یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ جدید شعری اسلوب کا ان کے یہاں انجذابی عمل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد کم ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ صحرا میں اذان، کا بنیادی رجحان نہیں ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اس رجحان کو منزل و منتہا تک پہنچانے کی تخلیقی سکت نہیں رکھتے یا انھیں اس اسلوب پر اعتماد نہیں یا ان کا معاملہ بھی ع

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہ رو کے ساتھ

والا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا خاص مزاج طنز ہے اور طنز کا بنیادی مقصد انسانی کمزوری پر حملہ کرنے یا اس کا بیان کرنے یا انسانی کمزوری کو GLORIFY کرنے یا اس کمزوری کی طرف داری، تائید و تنقید کرنا نہیں بلکہ ان کی کمزوریوں کو اُبھارنا ہے۔ طنز کسی طرح کی اصلاحی ذمہ داری تو اپنے اُوپر نہیں لیتا لیکن چند اقدار کی طرف داری وہ ضرور کرتی ہے ان پر قایم نہ رہ سکنے والوں یا ان اقدار سے تجاہلِ عارفانہ سے پیش آنے والوں کو ہدفِ ملامت بھی بناتی ہے لیکن اس کا انداز اس طرح کا ہوتا ہے کہ صلاح کار کجا دمن خراب کجا۔ یہی سبب ہے کہ سچا طنز نگار نہ بزرگوں کا بغلی گھونسہ ہوتا ہے نہ قدامت میں قباحت تلاشتا ہے نہ نا اہلوں کی نادان کے آبِ غلیظ میں خود کو لتھ پتھ کرتا ہے۔ وہ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور کسی کے ساتھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ سب کی دست رس میں ہو کر بھی کسی کے زیر دست نہیں ہوتا۔ مثل صاحب انھیں معنوں میں سچے طنز نگار ہیں۔ اُن کا طنز، یہ اسلوب اُردو کے دو جدید طنز نگاروں ——— یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی ——— سے مختلف ہے۔ یگانہ کی طنز جراحت کی حدوں کو چھونے لگتی ہے جس کی بڑی وجہ ان کی انا کی شکست اُن کا غرور غریبی کا غرور ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے فن کار کو دوسروں پر ہنسنے کے ساتھ ساتھ خود اپنے پر قہقہہ لگانے کی توفیق بھی میسر ہے۔ شاد عارفی کی طنز ایک ایسے شکست خوردہ انسان کی طنز ہے جس کا قدیم قدروں پر ایقان و اعتقاد ہے۔ اس کا کتابی کردار بدلتے ہوئے معاشرے میں قدم قدم پر چرمراتا ٹوٹتا ہے اس لیے ان کی طنز میں شکست خوردہ شخصیت کی جھلاہٹ اور غصہ ملتا ہے۔ مثل صاحب کا طنز ایک ایسے مہذب انسان کا طنز ہے جس کے نزدیک حفظ مراتب کی دو سطحیں ہیں ایک وہ جو اسے ودیعت ہوئی، دوسری وہ جو اس نے وضع کی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اُسے دوہری آزادی میسر ہے وہیں اس پر دوہری پابندیاں بھی ہیں۔ پابندیاں اور ان کا ادراک ہی شاعر کو ایک خاص مقام سے آگے نکلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ان کی طنز میں توازن ہے تجاوز نہیں۔ بہت ممکن تھا کہ ایسے میں ان کی طنز اُردو کے سب سے بڑے طناز میر کی طنز سے جا ملتی لیکن عقلیت کوشی مانع ہوتی ہے۔ اس لیے ع

کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

کہنا ان کے بس میں نہیں کیونکہ یہ ان کا مزاج نہیں ہے۔ اُن کی طنز اُن کی باچھوں کے زاویے سے برآمد ہوتی ہے۔ ان کی سنجیدگی میں ایک صلابت ہے اسی لیے ان کے مضحکہ میں معاوضہ کا پہلو کم سے کم ہے لیکن اس کے باوجود طنز کا بنیادی پہلو، اس کا پینا پن، آپ اپنی مثال ہے۔

طنز کی تمازت سے وہ لوگ تو محفوظ رہ ہی نہیں سکتے جن کے قول و فعل میں تفرق ہوتا ہے۔ مثل صاحب کا نشتر ایسے معاملات میں اس لیے بھی دو دھارا ہوتا ہے کہ وہ آئیڈیالاجی کے عقیدت مند اور "نجات دہندگان" کے نیازمند خود تو ہیں نہیں اور جو ہیں انھیں بھی برخود غلط سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر:

خدمتِ راج محل پر اُنھیں دیکھا مامور
جو یہ کہتے تھے سرِ دار بسیرا ہوگا

شاعری کو سماج یا سیاست کے ہاتھوں تشنۂ ابہ متصور کرنے والوں، اسے خدمتِ خلق یا قومی خدمات یا کنبہ کی منصوبہ بندی پر مامور کرنے والوں، ادب کو اقدار کی بجائے افکار کا استخراج گردانے یا اشعار کو اسلحہ ماننے والوں کی بھی وہ خوب خبر لیتے ہیں لیکن ایسے وقت میں ان کا لہجہ متانت و ملاحت سے خالی نہیں ہوتا۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ شاعری کو سب سے پہلے شاعری دیکھنے کے متمنی ہیں اس کے بعد کچھ اور۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں:

شاعری میں نہ رہا جذبہ و احساس کو دخل
اب اسے قوم کی خدمت پہ لگایا جائے

شعر میں تذکرۂ دشت و بیاباں ہو مگر
اک بڑے شہر میں گھر اپنا بنایا جائے

ناز کر اپنے فلک سیر تخیل پہ مگر
جو ترے پانو سے لپٹی ہے وہ زنجیر بھی دیکھ

کس کو ہے حسنِ خدا داد کا دعویٰ دیکھیں
کس کا چہرہ نہیں منت کشِ غازہ دیکھیں

متل صاحب عرصۂ شعر و ادب میں خواہ کتنے ہی نظریے کے طرفدار ہوں لیکن میدانِ حیات میں اُن کے بھی نظریے رہے ہیں۔ وہ قابلِ احترام اس لیے ہیں کہ انھوں نے اپنے نظریوں سے اپنی نظر کو ملوث نہیں ہونے دیا۔ اسی بات کا اعتراف کرتے ہوئے حیات اللہ انصاری نے لکھا ہے:

"گوپال متل کی شاعری کسی رُخ سے بھی نعرہ بازی نہیں ہے۔ وہ خود ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی سے متعلق رہے تھے لیکن اُن کی شاعری میں اس کی جھلک نہیں ملتی ہے، اُن کی شاعری صرف شاعری ہے، جس کے تیور ہیں ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

رہینِ غمِ جہاں اور طنز کے ملے جلے تاثرات اور متل صاحب کی شاعری کی بانگی کے دو تین نمونے اور دیکھیے:

مفلسی اور عاشقانہ مزاج
دینے والے یہ کیا دیا تو نے

کون کہتا ہے بے وفا تجھ کو
کس کے مُنہ میں زبان ہے پیارے

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

متل صاحب نے جدید شعر و ادب کے ساتھ ایک اور عملی تعاون کیا ہے جس کا نام ہے 'تحریک'۔ حصولِ آزادی کے بعد گاندھی جی نے کہا تھا کہ اب کانگریس کو ختم کر دینا چاہیے کیونکہ اس کا کام ختم ہو چکا ہے۔ 'تحریک' بند تو خیر اسی

طرح ہوا جس طرح دوسرے اُردو رسالے بند ہوتے ہیں لیکن ایمان داری کی بات یہ ہے کہ 'تحریک' کا بند ہونا ایک ایسا ادبی حادثہ ایک ایسا خلا ہے جو شاید کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ بسمل صاحب کے 'تحریک' نے اُن آوازوں کو اُبھرنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا، جو آج اُردو ادب میں جدید اور معتبر آوازیں شمار کی جاتی ہیں۔ لیکن ان کے بعد والی آوازوں کو کسی اور گوپال متل کی تحریک کا انتظار ہے۔ لیکن جب متل صاحب کی پوری جدوجہد ایک نکتہ پر لا کر سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ 'تحریک' کا ایک مقصد تھا کہ نظریے کی بجائے نظر کا ادب فروغ پائے جب نظر کا ادب اہلِ نظر کے نزدیک ایک بار پھر معتبر ثابت ہو گیا تب 'تحریک' تو بند ہو ہی جانا چاہیے تھا نا؟

متل صاحب کی شاعری کی طرح اُن کی نثر بھی مثالی نثر ہے۔ 'لاہور کا جو ذکر کیا' اس کی بہترین مثال ہے۔ متل صاحب کی شخصیت اور ان کے مزاج کو اگر آپ ایک لفظ میں سمیٹنا چاہیں تو صرف اضطراب لکھ کر چھٹی پا سکتے ہیں۔ اگر خود متل صاحب کی زبان میں اُن کے مزاج و معیارِ حیات کی تفہیم درکار ہے تو یہ شعر ملاحظہ ہو:

خدا گواہ کہ دونوں ہیں دشمنِ پرواز
غمِ قفس ہو کہ راحت ہو آشیانے کی

یہی اُن کی زندگی کا دستور العمل ہے اور یہی نصب العین بھی۔ مسلسل رفتار متواتر تلاش سے ہی اُن کا وجود عبارت ہے۔ اُن کی منزل اور راہ دونوں پرواز سے عمل سے عبارت ہے۔ ایک سچے فن کار کا انسان کو اس سے بڑا پیغام ہو بھی کیا سکتا ہے۔

آزاد گلاٹی

مِتّل صاحب

اپنی زندگی کے پچھتر برسوں کے سفر میں مِتّل صاحب اس کے ہر نشیب و فراز سے بائرن کی نظموں کے ہیرو کی طرح خندہ پیشانی سے گزرے ہیں۔ مالیر کوٹلہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے لاہور سے گریجویشن کیا اور جلد ہی صحافت، سیاست اور ادب کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ ۱۹۳۳ء میں لدھیانہ سے 'صبح امید' جاری کیا اور اس ماہنامہ کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی لیکن اس کا پہلا شمارہ ہی آخری شمارہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد وہ لاہور سے شایع ہونے والے کئی رسالوں اور اخباروں سے وابستہ رہے۔ قیامِ لاہور کے دوران انھوں نے اپنے عہد کے بیشتر عظیم اُدبا، شعراء کی صحبتوں سے جو فیض حاصل کیا، اُس نے ان کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔ ۱۹۵۲ء میں اُنھوں نے دہلی سے "تحریک" کا اجرا کیا۔ اس جریدہ نے ربع صدی تک اپنی باقاعدہ اشاعت کے دوران ادب و صحافت میں ایک منفرد اور باوقار مقام بنا لیا۔ اس رسالے نے نہ صرف مِتّل صاحب کو اپنے کمیونسٹ مخالف نظریوں اور اس نظام کی خامیوں اور سازشوں کے اظہار کے لیے مناسب اور موزوں وسیلہ فراہم کیا بلکہ نئی شاعری کے خدوخال سنوارنے اور اس کی سمت اور مزاج متعین کرنے میں بھی اس رسالے نے بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے خاص نمبر مِتّل صاحب کی صحافتی صلاحیتوں کے ایسے

شاہکار ہیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

لیکن قتیل صاحب کی تخلیقی صلاحیتیں اتنی توانا اور متنوع ہیں کہ وہ محض صحافتی سرگرمیوں تک محدود نہیں رہ سکتی تھیں۔ انھوں نے اپنے اظہار کے لیے ادب اور سیاست کو بھی اپنی جولانگاہ بنایا۔ ان کے سیاسی نظریہ کی تشکیل میں ان کا مشاہدہ، فہم و فراست، وسیع مطالعہ اور اپنے عقیدوں کی صداقت میں اُن کا گہرا اعتقاد کارفرما رہے ہیں۔ ان کا کمیونسٹ مخالف نظریہ ان کی شاعری کے علاوہ ان کی سبھی تحریروں سے مترشح ہے لیکن کمیونزم کی مخالفت میں بھی وہ کبھی استدلال اور توازن کا دامن ہاتھ نہیں چھوڑتے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ کمیونزم فرد کی ذات کے آزادانہ ارتقا میں حائل ہوتا ہے کیوں کہ وہ سماجی ضرورتوں کے مطابق اس کی تراش خراش کرتا ہے۔ ان کے خیال میں ادب میں ترقی پسند تحریک دراصل ادیب کی انفرادیت کو سلب کرنے، اُسے حلقہ بگوش بنانے اور اس طرح اُسے مسلسل غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی ایک نپی تُلی سازش تھی۔ انھوں نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "ادب میں ترقی پسندی: ایک ادبی تحریک یا سازش؟" (۱۹۵۸ء) میں کمیونسٹ سرکاروں کے شائع شدہ مصدقہ مواد ہی کے حوالوں سے یہ بات بخوبی ثابت کر دی ہے کہ ادب میں ترقی پسند تحریک محض ایک ایسا ظاہری تماشہ تھی جس کے پس منظر میں کمیونسٹ پارٹی کی طاقتیں ترقی پسند ادبا کو کٹھ پتلی کا ناچ نچواتی تھیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قتیل صاحب ادیب کی سماجی ذمہ داریوں سے چشم پوشی اختیار کرتے ہیں ہاں وہ ان ذمہ داریوں کو باہر سے عائد کرنے اور ادیب کو ان کا پابند بنا دینے کے خلاف ہیں کیونکہ ایسا کرنا ادیب کی ذاتی حسیات میں براہِ راست مداخلت کے مترادف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "ادبِ عالیہ ہمیشہ داخلی عمل ہوتا ہے" اور کہ: "ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے کے لیے زندگی کا براہِ راست مطالعہ اور ایک طرح کی غیر جانبداری بہت ضروری ہے۔" وہ چاہتے ہیں کہ ادیب کو ہر قسم کے دباؤ سے آزاد رکھا جائے تاکہ اس کی تخلیقی قوتیں کھلی فضا میں بلا روک ٹوک سانس لے سکیں اور ان کی نشوونما آزادانہ طور پر ہو سکے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ادیب کی شخصیت کے کئی ایسے تقاضے بھی ہوتے ہیں جن کی تشفی وہ اپنی تخلیقات کے توسط سے ہی کر پاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے قلم کے ذریعے نہ صرف اپنی ذات کے اظہار کی سعی کرتا ہے بلکہ حیات و کائنات کے سربستہ راز بھی فاش کرتا ہے اور حقیقت کی تلاش میں بھی سرگرداں رہتا ہے۔ یہ سب ایسے ادیب کے لیے ناممکن ہے جو نظریات سے وابستہ ہو۔ خصوصاً ایسے نظریات سے جو اُس کے ذاتی محسوسات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوں۔ ان کے خیال میں ادب کا مقصد "احساسِ جمال کی تسکین ہے۔ ایسا ادب پیدا کرنا جو طہارتِ فکر کا آئینہ دار ہو اور اس کے اظہار کا انداز بھی حسین و جمیل ہو، سماجی اعتبار سے بہت بڑی افادیت رکھتا ہے کیونکہ اس طرح ادیب صرف شخصیت کا اظہار کر کے شخصی ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے بلکہ قوم کے جذباتِ لطیف سے اپیل کر کے بہتر سماجی ماحول کی تخلیق میں بھی مدد دیتا ہے۔" وہ ادب کو "بہتر زندگی کی امنگ" گردانتے ہیں۔ کمیونزم سے ان کے

اختلاف کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بہتر زندگی کی اس امنگ کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔

متّل صاحب نے ان گنت اداریوں، مضامین، کتابوں اور ترجموں کے ذریعہ اپنے اس نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی ہے۔ لیکن وہ اپنے نظریات کو اپنی شاعری پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ انھوں نے وطنی اور سیاسی نظموں میں بھی اپنے نظریہ کے بوجھ سے نظم کے تخلیقی ڈھانچے کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اس طرح وہ خود اپنی شاعری کے ذریعہ شاعر کی ذات کی آزادی کے نظریہ کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کرتے ہیں اور یہ ان کی سیاسی بصیرت اور ادبی بصارت کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے 'دوراہا' (۱۹۴۶ء) اور 'صحرا میں اذان' (۱۹۷۰ء) شایع ہو چکے ہیں۔ اُن کے دوسرے مجموعۂ کلام میں ان کے شاعرانہ محسوسات ایک واضح اور جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ روایت کے پاس دار ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ روایت کی روشنی سے پوری طرح اپنی ذات اور حیات کو منور کیے بغیر مستقبل کے موہوم دھندلکوں میں اعتماد سے قدم نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ سب کچھ اُن کے کلام سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ وہ شاعرانہ اسلوب کی مہارت، الفاظ کے مزاج سے فن کارانہ آگہی، زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت، شگفتگی، برجستگی اور سلاست سے جس طرح قاری کو اپنے محسوسات میں شریک کر لیتے ہیں، وہ سب جذبہ و خیال کے اظہار کی ندرت کے ساتھ ساتھ روایت کی گہری پاسداری کے احساس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان کی غزلیں روایت کے احترام کے باوجود عام روایتی غزلیہ شاعری کے عاشق کی آہوں اور کراہوں سے مبرّا ہیں۔ وہ محبت کے جذبے اور آج کل کی زندگی کی گوناگوں ذہنی و نفسیاتی الجھنوں کی ترجمانی بہت خوبی اور نفاست سے کرتے ہیں۔ وہ اپنے غم کو خوبصورت انداز سے برداشت کرنے کا مشکل فن جانتے ہیں اور ان کی مخصوص خود آزاری بھی انھیں اپنے نفسیاتی کرب کو دوسروں کے ذہن میں منتقل کرنے کی بجائے اُسے خود بھوگنے کے اہل بناتی ہے وہ آج کی زوال پذیر سماجی اور ثقافتی قدروں سے پیدا شدہ زندگی کی بے معنویت کے اذیت ناک کرب سے آگاہ ہیں لیکن قنوطیت اور یاسیت سے کوسوں دُور ہیں۔ وہ دراصل انسانی زندگی کی مجبوریوں، اس کی محرومیوں اور محزونیوں کو زندگی کے تصنع پر ایک لطیف طنز کی شکل دے دیتے ہیں۔ وہ اندھیرے میں بھی روشنی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ انسانی عظمت پر اُن کا اعتقاد انھیں کبھی مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ 'صبح کاذب' اور 'شب تاب' جیسی نظموں میں بہت اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ تمام تر تاریکیوں کے باوجود یہ زمین اور یہ زندگی روشنی سے مستقل طور پر محروم نہیں ہو سکتیں!

ان کی ایک اور اہم تصنیف "لاہور کا جو ذکر کیا" (۱۹۷۱ء) ہے جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران لاہور میں اُن کے ادبی، صحافتی اور سیاسی تجربوں کا ایک دلکش مرقع ہے۔ وہ اپنے قاری کو پنجاب کے ایک بحرانی دور کے سیاسی اور ادبی ماحول کی سیاحت پر ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ذریعۂ معاش کی تلاش اور ان کے ذہن کے مخصوص تخلیقی رجحانات نے انھیں اس دور کے لاہور کی ادبی، سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں میں شریک ہونے کے جو مواقع فراہم کیے تھے وہ ان سے جذباتی وابستگی کے باعث ان کا اظہار ایک عجیب نسطالجیہ (NOSTALGIA)

سے کرتے ہیں۔ عرب ہوٹل اور نگینہ بیکری میں سجتی شام کی محفلوں کا تذکرہ وہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری خود کو ان محفلوں میں شریک محسوس کرتا ہے۔ مختلف ادبی اور سیاسی نظریوں کے لوگ یہاں اپنی سبھی اُلجھنیں بھلا کر ملتے تھے۔ اُن کی دوستی و دشمنی، رشک و حسد اور طنز و ظرافت کو مبّل صاحب بہت موثر ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں۔ یادوں کے اس دلچسپ سلسلے میں وہ قاری کو یکے بعد دیگرے کئی واقعات سے گزارتے ہیں اور اپنے عہد کی اہم شخصیتوں سے ملاقات کرواتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی خود ان کی اپنی شخصیت کے مثبت اور منفی پہلو بھی نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ اس کتاب سے ان کی جو شخصیت اُبھرتی ہے وہ فرشتے کی نہیں بلکہ ایک انسان کی ہے . . . ایک ایسے حسّاس انسان کی جو گرد و پیش کی فضا میں ہلکے سے ارتعاش سے بھی اپنے اندر کی زندگی میں، اُبھرتی ڈوبتی لہروں میں انکشافِ ذات کے امکانات پیدا کر لیتا ہے۔ اس کتاب کا ایک اور اہم پہلو اس کا رواں دواں نثری اسلوب ہے۔ واقعہ یا واردات کوئی بھی ہو، اسے ہمدردانہ، طنزیہ یا مزاحیہ انداز میں بیان کرنا مطلوب ہو یا پھر مختلف سیاسی جماعتوں کے لطیف و کثیف نظریاتی اختلافات کا ذکر مقصود ہو۔ مبّل صاحب کی نثر اور الفاظ کا تخلیقی استعمال کہیں بھی قاری کو مایوس نہیں کرتے۔ وہ اظہار کے سیدھے سادھے پیرائے اختیار کرتے ہیں اور ان کے طنز میں بھی ایک مخصوص بانکپن جھلکتا ہے جو اُن شخصیت کا ایک دلکش پہلو ہے۔

مبّل صاحب کی ذات ایسی صفات کا مرکّب ہے جو زندگی کی شرافت، متانت، استقلال اور تحمّل سے گزارنے پر ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ ان سے چند لمحوں کی گفتگو بھی انکشافات کے کئی در باز کرتی چلی جاتی ہے اور ان کے الفاظ میں علم و دانش کی ایسی نویں سموئی ہوتی ہیں جو قاری کے اندر اندھیرے گوشوں کو منور کر دیتی ہیں۔ وہ اپنے پسندیدہ موضوعات پر جس وقار سے گفتگو کرتے ہیں وہ صرف اس شخص کا مقدر ہو سکتا ہے جس نے اپنے عقیدوں کو زندگی بھر جیا ہو اور نبھایا ہے۔ مبّل صاحب کی داستانِ حیات ایک معروف، مجتہد، ہمہ جہت شخص کی داستانِ حیات ہے۔ ان کی ذات و حیات ایک ایسا PRISM ہیں جس میں سے نکلی ہفت رنگ کرنیں ایک ایسا تصور تعمیر کرتی ہیں جس میں ایک سادہ بے لوث اور متین شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی رُوپ ریکھا نمایاں ہوتی ہے۔ وہ دراصل ایک ایسی انجمن ہیں جس کے ذکر کے بغیر آزادی کے بعد کے اُردو ادب اور صحافت کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

●●

بسمل سعیدی

رباعیات

(بسلسلۂ تبریک و تہنیت جشن سالگرہ منعقدہ ۲۰ رجون ۱۹۷۵ء)

ہر غم سے ہوں دور، ہر خوشی سے نزدیک
جشنِ طرب سالگرہ میں ہوں شریک
گلہائے سخن از پے "نذرِ مشتل"
ہیں پیش، سرِ بزم، بطورِ تبریک

معراج کی جانب وہی کرتی ہے رجوع
جو بات کسی ساعتِ خوش میں ہو شروع
اس وقت وہ پہنچا ہے سرِ سمت الراس
خورشیدِ ادب آج ہوا ہے جو طلوع

جب صبحِ ازل فضا میں جلوہ گر تھی
قدرت کی نظر میں قدرِ خیر و شر تھی
فکرِ مشتل کو ملی بطورِ الہام
ہر اک وہ صلاحیت جو صالح تر تھی

'صحرا میں اذان' ہے کہ فردوسِ سخن
ہر لفظ میں جس طرح مہکتا ہو چمن
مجموعۂ اشعار ہے دامانِ بہار
ہر شعر گلِ سرسبدِ فکر و فن

خورشید ہیں کتنے ضمِ سحر میں تیری
سجدوں کے نشاں ہیں رہگزر میں تیری
یکتائیٔ اصابت کی نہ ہو فکر میں کیوں
ہر سطرِ سیاست ہے نظر میں تیری

بشرِ ادب و علم ہے فیضان ترا
طبعاً ہے، مزاجاً ہے یہ رجحان ترا
اردو نے بھی کچھ کم نہ سراہا ہے تجھے
حالاں کہ ہے اردو پہ بھی احسان ترا

یہ روح فزا، نشاط افزا یہ دن
یہ عشرتِ مستقبل دفردا یہ دن
تاریخ ادبی ذکر سے رہتی محروم
تقویمِ جہاں میں جو نہ ہوتا یہ دن

کرشن موہن

اُردو کا نارد مُنی

وہ اُردو کا نارد مُنی ہے
شرارت ہے اُس کی محبت کی صورت
وہ حرکت کی برکت، عزیمت کی مورت
ریاضت میں جو تیکھا پن ہے وہ اُس کا پیمبر
وہ شوخی کا پیکر
ہے فکرِ جدید اُس کا مذہب
یہ منزل نما تیز گامی
نئے لکھنے والوں کی حامی
ہے بوسیدہ پیڑوں سے اک چھیڑ بھی اُس کا مشرب
وہ ذہنِ رسا ہے بنی نوع انساں کو بھی اور خالق کو بھی چھیڑتا ہے
بھنور سے بچا کر جو لایا ہے ساحل پہ اُردو کی ناؤ کو، وہ ناخدا ہے
ہمیشہ پرے جس کے دل سے کدورت رہی ہے
ہر اک دور میں ایسے البیلے رہبر کی، نارد مُنی کی ضرورت رہی ہے
ضرورت رہے گی

مخمور سعیدی

شب تاب

کرن کرن یہ خیالوں کی روشنی تجھ سے
چمک اُٹھا اُفقِ علم و آگہی تجھ سے

دھواں دھواں تھے مناظر دیارِ دانش کے
مگر یہ تیرہ فضا جگمگا اُٹھی تجھ سے

سسک رہا تھا ادب نرغۂ سیاست میں
اسے پھر ایک نئی زندگی ملی تجھ سے

حصار توڑ سکے مصلحت پسندی کا
ہوئی کسی سے یہ ہمت تو ہو سکی تجھ سے

زمانہ ساز روئیے اگر ترے دشمن
تو خود شناس مزاجوں کی دوستی تجھ سے

ادا کیا ہے سدا زندگی کا حق تو نے
گلہ گزار نہیں ہے یہ زندگی تجھ سے

کمار پاشی

اسے لفظوں میں ڈھونڈو

وہ باہر ہے نہ گھر میں ہے
تو لفظوں میں اسے ڈھونڈیں
سُنا ہے نہ وہ کہیں لمبے سفر میں ہے

مجھے اب یاد آتا ہے : اسے دیکھا ہے مَیں نے
محفلوں میں درمیاں اُن موسموں کے
جو اُسے بھولے نہیں اب تک
جو اَب بھی گھیر لیتے ہیں اُسے تنہا کہیں پاکر

مَیں اب بھی سوچتا ہوں :
موسموں میں اُس کے کھو جاؤں
جو گہری دُھند اُس کے چارسو پھیلی ہوئی ہے
درمیاں اس کے وہ اک ایسا جزیرہ ہے
جہاں اُس کو پہنچنا ہے

تو پھر آؤ ——
اسے ڈھونڈیں
اسے لفظوں میں ڈھونڈیں
وہ نہ باہر ہے نہ گھر میں ہے
کہیں لمبے سفر میں ہے

امیر قزلباش

خود اپنی آگ میں جلتا ہوا سورج

اک ایسا عہد قسمت بن چکی ہو جس کی محرومی
اک ایسا عہد جس کی سب دشاؤں پر مسلط ہو
اندھیرا ہی اندھیرا بے حسی کا، کم شناسی کا
مگر —— دیکھو
وہ اپنی آگ میں جلتا ہوا سورج
جو اک زندہ حقیقت تھا
جو اک زندہ حقیقت ہے
جو اس ظلمت کدہ میں روشنی پھیلا رہا ہے دید و دانش کی
شعاعیں مرتسم ہیں جس کی ہر تاریک منظر پر
اُجالا بانٹنے والا یہ سورج کل بھی روشن تھا
یہ سورج اب بھی روشن ہے
اُسے معلوم ہے اندھی گپھا کے بند دروازے
اچانک وا نہیں ہوتے
اچانک وا نہیں ہوں گے

ضیا فتح آبادی

گوپال مِتّل کی سالگرہ پر

رات، یعنی دن کی ضد
تہہ بہ تہہ تاریکیوں کا بار کندھوں پر اُٹھائے
بے حسی کے گیت گاتی، ناچتی،
بحر و بر، کون و مکاں پر چھاگئی
گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں ہیبت ناک اُداسی کا سماں
خیمہ زن خاموشیوں کا کارواں
دفعتاً دل کے نہاں خانے میں گونجی ایک دُور افتادہ چیخ
مُردہ ارمانوں کو اذنِ زندگیِ نَو ملا
یاس پر اُمید کا جادو چلا
روشنی کی جستجو تازہ ہوئی

چلتے چلتے، چلتے چلتے مل گیا اک ہمسفر
مشعلِ عرفاں جلائے
محرمِ اسرارِ حُسنِ کائنات
رہگذر کے پیچ و خم سے آشنا
منزل آگاہِ حیات

خوف، ڈر، اندیشے کی آلائشوں سے پاک و صاف
حق نوا و راست گو
قدر دانِ علم، ادب کا پاسباں
دوستوں کا دوست، لیکن دشمنوں کے حق میں، برقِ بے اماں
نکتہ داں، صاحب نظر
حامیِ آزادیِ فکر و خیال
آدمی اور آدمیت کا پرستارِ قدیم

اک عجب انداز سے دی اُس نے صحرا میں اذاں
وہ اذاں، دراصل اک تحریک تھی
ذرّہ ذرّہ، پتّہ پتّہ جاگ اُٹھا
نُور کے فوّارے پھوٹے ہر طرف
روشنی کے طالبوں کو روشنی مل ہی گئی

رضا نقوی واہی

گوپال متّل کے نام

اے حضرتِ متّل، یہ کرم ہے کہ ستم ہے
کیوں لطفِ نظر آپ کا ناچیز پہ کم ہے
واللہ کہ ہیں آپ بھی اک زندہ عجائب
"صحرا میں اذاں"[1] دے کے کہاں ہو گئے غائب
مانا کہ مرے شہر سے دلّی ہے بہت دُور
جیسے کہ رہِ رسمِ وفا سے دلِ مخمور
یہ بات کہے کون
جنگل میں اگر بیل پکا ہے تو چکھے کون
صحرا میں جو گونجی ہے وہ آواز سُنے کون
جب تک نہیں پہنچے دلِ صاحب نظراں تک
شوریدہ سراں تک
آوازِ اذاں کیا؟
گل بانگِ نغاں کیا؟

مَیں کان میں انگلی دیے بیٹھا تو نہیں ہوں
بہرا تو نہیں ہوں
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
پھر غیر سبب کیوں
اس بندۂ ناچیز پہ تخفیفِ کرم ہے
یہ بھی نہیں کہتا کہ مجھے مفت ہی بھیجیں
توفیق بہ اندازۂ ہمّت کا ہوں قائل
مَیں آپ کی دیرینہ شرافت کا ہوں قائل
ہر حال میں راضی بہ رضا ہوں
ہدیہ بھی ادا کرنے سے انکار نہیں ہے
آپس میں تکلّف کی تو دیوار نہیں ہے
پھر مجھ پہ تغافل کی نظر کیوں ہے جفا کیوں
یہ حضرتِ مخمور سعیدی کی ادا کیوں

---

[1] جناب گوپال متّل کا مجموعۂ کلام

عزیز تمنائی

مدراس میں مِتّل

اجنبی سڑکیں
سُلگتے دن دہکتی راتیں
چلاتی ہوئی تنہائیاں
گھومتے پاؤں میں دردِ اضطراب
آنکھوں میں شمعِ تشنگی
احساس کی قندیل پر
تہہ دار محرومی کی گرد
اک مسافر ایک شہر اور سات دن
ایک وقفہ تیشہ زن
ایک سنگیں خامشی!

تبصرہ نگاری

اُن میں حزاں کا رنگ بھی شامل ضرور ہے
گہری نظر سے نقش و نگارِ بہار دیکھ

گوپال مِتّل کے چند تبصرے

نظیر صدیقی

گوپال مِتّل کی تبصرہ نگاری

گوپال مِتّل نے اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو اتنی سمتوں میں بکھیر رکھا ہے کہ میرے لیے ان کی مرکزی حیثیت کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی صحافت اور شاعری سے شروع کی۔ صحافت ان کا ذریعہ معاش بھی اور شاعری ان کا ذوق۔ شاعری میں انھوں نے غزل گوئی اور نظم نگاری دونوں سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ لاہور سے دلّی آ گئے۔ دلّی سے انھوں نے ماہوار رسالہ 'تحریک' جاری کیا جسے وہ بڑی ہی باقاعدگی سے چلاتے رہے ہیں۔ رسالہ 'تحریک' کو خالص ادبی رسالہ کہنا شاید صحیح نہ ہوگا۔ اس کا اداریہ عموماً سیاسی اور نیم سیاسی موضوعات پر لکھا جاتا رہا ہے۔ تقسیم سے پہلے گوپال مِتّل کا شمار بھی غالباً ترقی پسندوں میں ہوتا تھا۔ ان کے بیشتر احباب بھی اُردو کے مشہور ترقی پسند ادیب اور شاعر تھے۔ تقسیم کے بعد وہ 'رجعت پسندوں' کی صف میں آ گئے۔ اشتراکیت کے مخالف اور سرمایہ دارانہ نظام کے حامی تصور کیے جانے لگے۔ مجھے ابھی تک اس کا اندازہ نہیں ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامی کس حد تک ہیں۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ وہ اشتراکیت کے سخت ترین مخالفوں میں سے ہیں۔ وہ اشتراکیت کے خلاف کئی طریقوں سے جہاد کرتے رہے ہیں۔ کبھی اشتراکیت کے خلاف مضامین، کتابچے اور کتابیں لکھ کر اور کبھی اشتراکیت کے خلاف لکھے ہوئے لٹریچر کا اُردو میں ترجمہ کر کے۔ انھوں نے اشتراکیت کے خلاف انگریزی میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ مجھے

ان کی تمام تحریروں کو پڑھنے کے مواقع نہیں ملے۔ ان کا رسالہ 'تحریک' مدتوں میرے پاس آتا رہا۔ گزشتہ بارہ سال سے میں اس رسالے سے بھی محروم رہا ہوں۔ اس رسالے میں ایڈیٹر کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ گوپال متل ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے بھی سامنے آتے رہے ہیں۔

تبصرہ نگاری ابھی تک ہمارے ادب کی ایک ایسی صنف ہے جسے برصغیر میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہو اے ہونی چاہیے۔ اگرچہ رسالوں اور اخباروں میں تبصرہ نگاری کا رواج عام ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اُردو رسالوں اور اخباروں میں تبصرہ نگاری بڑی حد تک ایک رسم کے طور پر ہوتی ہے۔ تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے لیکن اس اب میں عمومی صورتِ حال یہ ہے کہ اگر رسالے کے ایڈیٹر سے تعلقات خوش گوار ہیں تو تبصرہ موافقانہ ہوتا ہے۔ اور اگر تعلقات ناخوش گوار ہیں تو تبصرہ مخالفانہ۔ اگر تعلقات بالکل نہ ہوں تو کتاب کی دو جلدیں بھجوانے کے باوجود تبصرہ ہوتا ہی نہیں اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اُردو رسالوں اور اخباروں میں جو آدمی جس طرح کی کتاب پر چاہے تبصرہ کردے۔ کتاب کے موضوع کے اعتبار سے تبصرہ نگار میں خاص اہلیت کا ہونا ضروری نہیں۔ بصیرت اور دیانت کی کمی تبصرہ تو تبصرہ اُردو تنقید تک میں نمایاں ہے۔ ہمارے یہاں بہت کم نقاد ایسے ہیں جو سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ تنقید یا تبصرہ لکھتے ہیں۔ گزشتہ بیس پچیس سال کے اندر شعر و ادب میں من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو کی کوششوں نے تنقید اور تبصرے کو اور بے جان بنا دیا ہے۔

اس صورتِ حال کے اعتبار سے گوپال متل ایک استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے 'تحریک' میں جن کتابوں پر تبصرے کیے ہیں ان میں اس صاف گوئی اور حق گوئی کا ثبوت دیا ہے جس کے بغیر کسی تنقید یا تبصرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں انھیں بارہا ہندوستان کی بڑی ممتاز شخصیتوں سے ٹکر لینا پڑی ہے۔ انھوں نے اپنے تبصروں میں نہ صرف غیر معمولی جرأت اور بیباکی کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ یہ ثابت کرنے میں بھی کامیاب رہے ہیں کہ اردو شعر و ادب سے تعلق رکھنے والی ممتاز ترین شخصیتیں بھی کتنی اخلاقی ریاکاری کی شکار ہیں۔ معاملہ تنقید و تحقیق کا ہو یا کتابوں پر تقریظ و تمہید کا گوپال متل اس معاملے میں نہ تو احتشام حسین اور فراق گورکھپوری کی پاسداریوں کو برداشت کرتے ہیں نہ آلِ احمد سرور اور مالک رام کی کوتاہیوں کو۔ بعض اوقات وہ ان پر طنز کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک ہندوستانی شاعر نذیر بنارسی کی نظموں اور غزلوں کے مجموعہ "گنگ و جمن" پر پروفیسر احتشام حسین نے تعارف لکھا تھا اور فراق گورکھپوری نے دیباچہ۔ دونوں نے تعارف اور دیباچے میں حد درجہ مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔ "گنگ و جمن" پر تبصرہ کرتے ہوئے گوپال متل نے لکھا کہ :

> "ان شعروں میں اگر آپ کو وہ خوبیاں نظر نہ آئیں، جو پروفیسر احتشام حسین اور فراق گورکھپوری کو نظر آئی ہیں تو اسے اپنی ہی کوتاہیِ فہم اور بدذوقی پر محمول کیجیے کیونکہ پروفیسر احتشام حسین ساہتیہ اکادمی میں اُردو کے نمائندے ہیں اور

"پروفیسر فراق بہ یک وقت عظیم شاعر اور عظیم نقاد"

رسالہ 'تحریک' ہی کے صفحات میں ایک مرتبہ فراق گورکھپوری اور گوپال متل کے درمیان جو بحث چلی تھی وہ اُردو کے POLEMICAL ادب میں تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ فراق کے ایک غیر معمولی شاعر اور حساس نقاد ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی دونوں حیثیتوں میں اپنے حق سے بدرجہا زیادہ اہم مانے گئے اور مانے جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اُردو کے نہایت OVERRATED شاعر اور نقاد ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ: پیراں نمی پرند مریداں می پرانند۔ مگر فراق ایک ایسے ادبی پیر تھے جو خود بھی اُڑتے تھے اور جنھیں حسن عسکری اور سلیم احمد جیسے مرید در مریدنے اور اونچا اُڑایا۔ لیکن جب کبھی وہ کسی نزاعی بحث میں اُلجھے تو اس راز سے پردہ اُٹھتا گیا کہ ان کے مریدوں نے انھیں جتنا بلند پرواز ظاہر کر رکھا ہے ان کے پروں میں اتنی طاقت پرواز نہ تھی۔

گوپال متل کے ساتھ فراق کا مناظرہ فراق کی اس رباعی پر گوپال متل کے ایک مضمون سے شروع ہوا تھا:

اُلجھی ہوئی گتھیوں کو بل دیتے ہیں\
کب کوئی وہ پیغامِ عمل دیتے ہیں\
یہ فلسفیِ زندگی کو سمجھیں، سمجھائیں\
ہم زیست ہی یکلخت بدل دیتے ہیں

فراق نے یہ رباعی 'شعورِ نو' کے عنوان کے تحت شایع کی تھی۔ گوپال متل نے بڑے مدلل اور مسکت انداز میں فراق کو بتایا کہ:

"شعورِ نو موجودہ دنیا کو یک لخت بدل دینے یا اسے کسی انقلاب کے ذریعے تباہ کر دینے کی اجازت ہرگز نہیں دیتا بلکہ اس کا مطالبہ اصلاح پسندی ہے۔ ۔ ۔"

اس مضمون کے جواب میں فراق نے گوپال متل کو خط لکھا اور یہ خواہش کی کہ ان کا خط جوں کا توں 'تحریک' میں شایع کیا جائے۔ گوپال متل نے نہ صرف یہ خط بلکہ بعد کے دوسرے خطوط بھی فراق کے اندیشے کے برعکس جوں کے توں شایع کر دیے اور فراق کے اُٹھائے ہوئے سوالات کا جواب دیتے چلے گئے۔ بات سے بات نکلتی چلی گئی اور فراق کے خطوں میں اشتراکی نظام، سرمایہ دارانہ نظام، برطانوی حکومت کے رویے اور روایات، شعر و ادب میں زبان و بیان کے نئے تصورات، ہم جنسی محبت، مہذب ترقی پسندی، بدتمیز ترقی پسندی، 'ادب اور انجمن'، اردو ادب کی حمایت اور فراق، جیسے موضوعات اور مسائل آتے چلے گئے۔ اس بحث میں گوپال متل کے علاوہ بعض دوسروں نے بھی حصہ لیا۔ مثلاً رشید حسن خاں اور غلام محمد بٹ نے۔ ان میں رشید حسن خاں نے فراق

کی زبان اور بیان پر جو اعتراضات کیے وہ ان سے اُٹھ نہ سکے۔ اسی طرح اشتراکیت اور جدلیاتی مادیت سے متعلق غلام محمد بٹ اور فراق کی بحث میں غلام محمد بٹ کا پلہ بھاری معلوم ہوتا ہے۔

اشتراکیت کے بارے میں فراق جن خوش گمانیوں کے شکار تھے ان کی تردید گوپال متل نے جس طریقے سے کی اس سے ان کی تاریخی علمیت، تجزیاتی صلاحیت اور سیاسی حقیقت پسندی پر روشنی پڑتی ہے۔ اگر سرمایہ داری کے بعد اشتراکیت تاریخی ارتقا کا منطقی نتیجہ اور نوع انسان کا ناگزیر مقصد ہے جب بھی اشتراکیت کو انسان کی جنت کے طور پر دیکھنا ذہنی ناپختگی کی دلیل ہے۔ کوئی بھی نظامِ حیات بذاتہ کتنا ہی اچھا، مفید اور آرام دہ کیوں نہ ہو انسان کی جبلّی INHERENT کمزوریاں اسے مکمل طور پر عمل میں نہیں آنے دے سکتیں۔ نتیجتاً انسانوں کی دنیا میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے سے رہیں۔ بقول جارج آورویل تمام حیوان (آورویل کا اشارہ انسانوں کی طرف ہے) برابر ہیں۔ لیکن بعض حیوان زیادہ برابر ہیں۔ جارج آورویل ہی نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس نظامِ حیات کو خیر و برکت کا نظام کیوں کر مانا جائے جس میں انسان کو روٹی دے کر اس سے دو اور دو چار کہنے کا حق چھین لیا جائے۔ آج جبکہ انسانی شعور کی بالیدگی بڑے سے بڑے پیغمبرانِ خدا کے اقوال کی صحت یا صداقت پر ایمان لانے میں دشواری محسوس کر رہی ہے۔ وہ بعض ماہرینِ معاشیات اور مفکرینِ سیاسیات کے ہر قول کو قولِ فیصل کیونکر مان لے۔ انسان جس ناانصافی اور ظلم کا شکار رہا ہے اس کا حل یہ تو نہیں ہے کہ اسے ایک قسم کی ناانصافی اور ظلم کے بدلے دوسرے قسم کی ناانصافی اور ظلم سے دوچار کر دیا جائے۔

اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو گوپال متل اشتراکیت کی مخالفت انہی بنیادوں پر کرتے رہے ہیں جن کا ابھی ذکر کیا گیا۔ چونکہ میرے سامنے ان کی ساری تحریریں موجود نہیں اور میں ان کی سوانحی تفصیلات سے بھی واقف نہیں ہوں اس لیے اُن کے نظریات و خیالات کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے معذور ہوں۔ ان کی یہ خوبی یقیناً لائقِ اعتراف اور قابلِ تحسین ہے کہ وہ ادبی تبصروں اور علمی و ادبی مناظروں (POLEMICS) میں حق گوئی اور بیباکی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ مصلحت کوشی اور مفاد پرستی کے اس دور میں یہ کام ایک کارنامے سے کم نہیں۔

۲۷ مئی ۱۹۸۲ء

چند تبصرے

خطوطِ غالب : ——— کتاب پر مرتب کی حیثیت سے مالک رام کا نام درج ہے لیکن اس کے تعارف میں پروفیسر آلِ احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو رقمطراز ہیں :

"خطوطِ غالب کا پہلا ایڈیشن جو مولوی مہیش پرشاد نے مرتب کیا تھا اور جس پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے نظر ثانی کی تھی، ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی اکیڈمی یوپی نے شایع کیا تھا۔ یہ ایڈیشن ٹائپ میں چھپا تھا۔ اول تو علمی کتابوں کی ہمارے یہاں کما حقہٗ قدر نہیں ہوتی دوسرے ٹائپ سے اُردو طبقہ ابھی تک مانوس نہیں ہو پایا ہے۔ بہرحال بہت دن کے بعد یہ ایڈیشن ختم ہوا۔ ہندوستانی اکیڈمی کو چاہیے تھا کہ اس کا دوسرا ایڈیشن شایع کرتی مگر اس زمانے میں اُسے اُردو کی کتابیں شایع کرنے سے چنداں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس لیے باوجود ایک نئے ایڈیشن کی شدید ضرورت کے یہ مسئلہ تعویق میں پڑا رہا۔

جب مہیش پرشاد کا انتقال ہوا تو ان کے مسودات اور ادبی کاغذات انجمن ترقی اردو ہند نے خرید لیے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی کوشش سے اکیڈمی خطوطِ غالب کے حقوق سے دستبردار بھی ہوگئی۔ انھیں کے مشورے سے اردو کے مشہور محقق مالک رام صاحب سے خطوطِ غالب کا دوسرا ایڈیشن تیار کرنے کی فرمائش کی گئی اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ موصوف نے یہ ذمّہ داری قبول کر لی۔"

مولوی مہیش پرشاد نے خطوطِ غالب کا مجموعہ جس محنت سے مرتب کیا تھا اس کی تفصیل انہی کی زبان سے سنیے جو انجمن کے شایع کردہ ایڈیشن میں دیباچہ کے عنوان سے شامل ہے:

"۱۹۲۴ء کی بات ہے کہ مجھے مرزا غالب کے خطوط کو پڑھنا پڑا۔ اس وقت مطبوعہ خطوط کے اغلاط و اسقام معلوم ہوئے اور ان کے باب میں بعض امور کا خیال ہوا۔ چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج یہ نسخہ حضرتِ غالب کے قدردانوں کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے "عود ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں جتنے خط ہیں وہ سب اس مجموعے میں یکجا کر دیے گئے ہیں اور ان کے علاوہ بہت سے خط اس میں شامل ہیں جو ان دونوں کتابوں کے کسی نسخے میں نہیں ملتے بلکہ کسی اور کتاب یا مختلف ادبی رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اب تک کہیں شایع نہیں ہوئے یا شایع ہو چکے ہیں مگر ان میں جا بجا غلطیاں تھیں جو خط "عود ہندی" یا "اردوئے معلیٰ" میں ہیں۔ ان کے مقابلے اور تصحیح کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں کہیں ایک متن کے دو زیادہ نسخوں میں اختلاف تھا بہتر صورت کو متن میں رکھا گیا اور اختلاف اگر کاتب کے سہو پر مبنی پایا گیا تو اس سے قطع نظر کیا گیا۔ صرف اہم اختلافات حاشیے میں دے دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں متن میں کوئی لفظ کم معلوم ہوا اور اس کے بغیر جملہ ناقص ہو گیا تھا تو ضروری لفظ بڑھا دیا اور اس طرح یہ اضافہ کہنی دار بکیروں کے اندر رکھا گیا ہے۔

ہر ایک مکتوب الیہ کے نام کے خط تاریخی ترتیب سے مرتب کیے گئے ہیں۔ ہر ایک مکتوب الیہ کے نام کے پہلے خط کی تاریخ کے

لحاظ سے مکتوب الیہوں کی تقدیم و تاخیر کی گئی ہے" عودِ ہندی" میں بہت تھوڑے خط ایسے ہیں جن میں تاریخیں درج ہیں مگر ان میں اکثر ایسے ہیں کہ ان میں دن اور مہینہ تو ہے مگر سنہ نہیں ہے۔" اردوئے معلیٰ" کے بہت سے خطوں میں تاریخیں ہیں کہیں ہجری تاریخیں، کہیں عیسوی تاریخیں ہیں، کہیں دونوں اور بعض تاریخیں غلط بھی ہیں۔ اس مجموعے میں تاریخوں کو ایک ڈھنگ پر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جن خطوط میں صرف ہجری میں تاریخیں ہیں ان کے مطابق عیسوی تاریخیں خط کے آخر میں درج کر دی گئی ہیں جس خط میں کوئی تاریخ درج نہیں ملی اس کے زمانے کی تعیین اندرونی شہادت یا کسی اور ذریعہ سے کی گئی۔ مثلاً منشی ہرگوپال تفتہ کے نام کے پہلے خط کا وقت" اسعد الاخبار" آگرہ ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کے پرچے سے متعین کیا جاسکا۔ اس لیے کہ اس میں منشی صاحب کے دیوان پر میرزا غالب کی لکھی ہوئی تقریظ کا ذکر ہے۔

تلاش اور کوشش سے جو مسالہ مجھے ملا اس میں بعض چیزیں بہت قدر کے قابل ہیں۔ جیسے ایک بہت پرانا خط تفتہ کے نام کا اور ایک خط مجروح کے نام کا جو غالب کے ایک اور شاگرد لالہ بہاری لال مشتاق کے خلف الرشید لالہ چندو لال صاحب کی عنایت سے حاصل ہوئے۔ پہلا" اردوئے معلیٰ" حصہ دوم میں موجود ہے، دوسرا ابھی تک شائع نہیں ہوا تھا۔ قاضی عبدالجلیل جنون کے نام سے ۱۷ خط" عودِ ہندی" اور" اردوئے معلیٰ" میں ہیں مگر ان کے بھتیجے قاضی محمد خلیل صاحب رئیس بریلی کی بے اندازہ شفقت نے ان خطوں کی تعداد کو تیس تک بڑھا دیا۔

——— قاضی محمد خلیل صاحب نے مطبوعہ خطوں کا اصل سے مقابلہ کرنے اور خطوں کی نقل کروانے اور پھر ان کے مقابلے کی زحمت فرمائی۔ نیز غالب کے لکھے ہوئے لفافے اور بعض اصلاحیں وغیرہ عنایت فرمائیں۔ ان چیزوں میں ایک نقل مولوی عزیزالدین کے نام کے خط کی بھی تھی۔ جس سے چھپے ہوئے خط کی تصحیح کی گئی۔

انوار الدولہ شفق کے نام گیارہ خط اعظم گڑھ میں کسی صاحب کے پاس ہیں۔ پنڈت رامیشور دیال صاحب ڈپٹی کلکٹر کا احسان مند ہوں کہ ان کی وساطت سے ان خطوں سے مطبوعہ خطوں کا مقابلہ کیا جا سکا۔ قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر (پٹنہ) کی توجہ سے سید فرزند بلگرامی کے نام کے چھ خط ملے ہیں جن میں سے پانچ "جلوۂ خضر" میں اور ایک رسالہ "ندیم" (گیا) میں شایع ہو چکا۔ نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، خان بہادر سید ابو محمد صاحب پنڈت گوپی ناتھ کرزود صاحب، آغا محمد اشرف صاحب دہلوی، سید فرخ حیدر صاحب رئیس شمس آباد، پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب، منشی اقبال حسین بیگ صاحب اور سید بشیر الدین حیدر صاحب موسوی نے نے مختلف خطوط نقل یا مقابلے کے لیے عنایت فرمائے جن سے کتاب کی ترتیب میں مدد ملی۔

قدر بلگرامی کے نام کے خط پہلے مولانا حسرت کے رسالے "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ (دسمبر ۱۹۰۸ء) میں چھپے پھر مطبع کریمی لاہور کی "مکمل اردوئے معلیٰ" (۱۹۲۳ء) میں ضمیمے کے طور پر داخل کیے گئے لیکن متن دونوں کا حرف بہ حرف ایک ہے۔ یہاں تک کہ جو غلطیاں علی گڑھ کے رسالے میں ہیں وہ لاہور کے نسخے میں بھی اسی طرح موجود ہیں۔ خوش قسمتی کہ ان میں سے بعض خطوں کی نقلیں ڈاکٹر صدیقی صاحب کے پاس تھیں جنھیں انھوں نے رسالہ "ہندوستانی" الٰہ آباد (جلد ۳) میں شایع کیا۔ ان سے بعض خطوں کے متن درست کرنے میں مدد ملی۔ "ہندوستانی" (ج-۴) میں بھی کئی خط ڈاکٹر صاحب نے شایع کیے تھے اور ان کے علاوہ ان کے پاس غالب کے رقعوں کا ایک انتخاب ہے جسے خود غالب ہی نے ترتیب دیا تھا۔ ان چیزوں سے بھی بعض خطوں کی تصحیح میں مدد ملی۔

متعدد اردو رسالوں میں غالب کے خط شایع ہوتے رہے ہیں جن میں سے خاص ذکر کے قابل یہ ہیں۔ "فصیح الملک"، "اردو"، "معارف"، "ہندوستانی"، "مرقع"، "خیابان" (لکھنؤ) "ندیم" (گیا)

"حیاتِ نو" (پانی پت) اور "جورنل ہسٹاریکل سوسائٹی" (لکھنؤ) میں سے
اِن سب رسالوں سے فائدہ اٹھایا ہے جس کے لیے میں اُن کے مضمون نگاروں
اور ایڈیٹروں کا ممنون ہوں۔"

مولوی مہیش پرشاد کی کاوش اور جستجو کا کچھ حال اس طرح سامنے آجاتا ہے لیکن پروفیسر آل احمد سرور کے تعارف سے ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ مالک رام جی نے دوسرے ایڈیشن کی تدوین میں اپنی حقیقی صلاحیت کے کیا کیا مظاہرے کیے ہیں اور نہ خود مالک رام جی ہی نے ہمیں اپنے اعتماد میں لیا ہے۔ اس پر بھی سُرور صاحب نے سرورق پر مرتب کی حیثیت سے مولوی مہیش پرشاد کا نام کاٹ کر ان کا نام درج کر دیا ہے۔ اور مالک رام جی نے چپ چاپ اس عزت افزائی کو قبول فرمالیا ہے۔

کتاب کی طباعت بھی ناقص ہے۔ پہلا ایڈیشن ٹائپ میں چھپا تھا۔ دوسرا ایڈیشن لیتھو میں چھپا ہے۔ سُرور صاحب کا یہ ارشاد اپنی جگہ درست ہے کہ "ٹائپ سے اُردو داں طبقہ ابھی تک مانوس نہیں" لیکن کیا وہ اچھی طباعت سے بھی مانوس نہیں؟

——— جنوری ۱۹۶۹ء

تبصرہ پڑھ کر پروفیسر آل احمد سُرور نے مدیر تحریک کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا تھا:

"تحریک" کے جنوری ۱۹۶۹ء کے شمارے میں 'خطوطِ غالب' پر آپ کا تبصرہ دیکھا۔ آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ سرورق پر مہیش پرشاد صاحب کا نام ضرور ہونا چاہیے تھا۔ دراصل مالک رام صاحب نے یہ خط مرتب نہیں کیے۔ اس بات کی وضاحت میرے مقدمے اور مہیش پرشاد کے دیباچے دونوں میں ہوگئی ہے۔ ہوا یہ کہ کتاب عرصہ ہوا مالک رام صاحب کو نیا ایڈیشن تیار کرنے کے لیے دی گئی تھی۔ وہ طباعت کی تصحیح کر کے گوپی چند نارنگ کو کتاب دے گئے اور انھوں نے دہلی میں اس کی کتابت کرائی۔ کتاب واقعی اچھی نہیں چھپی جس کا مجھے مزید رنج ہے۔ بہر حال اب اس ایڈیشن کی نکاسی پر انجمن اس کا نیا ایڈیشن جلد ہی شایع کرے گی جس پر سرورق پر مہیش پرشاد کا نام مرتب کی حیثیت سے ہوگا اور مالک رام کا جدید ایڈیشن کے نگراں کی حیثیت سے۔ ویسے اس ایڈیشن میں کچھ ایسے خطوط بھی شامل ہیں جو مہیش پرشاد والے ایڈیشن میں نہیں تھے۔ اس بات کی وضاحت مجھے اپنے مقدمے میں کر دینا چاہیے تھی۔

——— مارچ ۱۹۶۹ء

فَاعتبرُوا یا اُولی الاَبصار :

حال ہی میں ایک شاعر نذیر بنارسی کی نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ "گنگ و جمن" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ احتشام حسین نے اس مجموعے کا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے :

"شاعری میں انفرادی اور اجتماعی، شخصی اور جماعتی تصورات کی آمیزش ہوتی ہے جنہیں فن کی پابندی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے خود فن کا تصور بھی دونوں پہلو رکھتا ہے۔ فنی روایات کا احساس اجتماعی اور سماجی نوعیت رکھتا ہے لیکن اسے استعمال کرنے کی قوت شاعر کی شخصی صلاحیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس طرح شاعر پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے . . .

کبھی کبھی اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ ایک شاعر کی طرف متوجہ کیا جائے تاکہ جنہیں اس وقت تک اس کے کلام سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا ہے وہ توجہ سے پڑھیں۔ اور پڑھتے وقت ان خصوصیات کو مدِ نظر رکھیں جو تعارف نگار کو نظر آتی ہیں . . .

نہایت سادہ زبان میں بغیر کسی ابہام و پیچیدگی کے شاعر نے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے . . .

اس مجموعے کی دوسری اہم خصوصیت آسان اور با محاورہ زبان کے استعمال سے متعلق ہے . . .

نذیر بنارسی نے غزلوں میں بھی ایک دل کش رنگ پیدا کیا ہے مترنم، رواں اور معتدل بحروں میں لکھی ہوئی ان غزلوں میں بڑے پُر اثر اور خوبصورت اشعار ملتے ہیں"

اور فراق گورکھپوری اپنے دیباچے میں رقمطراز ہیں :

"جو اُمنگ اور ترنگ اور زندگی کا حوصلہ ان کے کلام میں میں نے پایا اسے میں قدر کی چیز سمجھتا ہوں اور اپنے لیے اسے نعمت تصور کرتا ہوں۔ ان کی آواز میں ایک چلبلے پن کے ساتھ ساتھ ایسی گمبھیرتا ہے جو دعوتِ فکر و نظر دیتی ہے . . .

ان کے کلام میں ایک خلوص ہے، ایک رکھ رکھاؤ ہے اور ایک ایسی

کشش ھے جو ھمارے اندر ایک صحت مند انسانہ اور حیات آور تڑپ پیدا کر دیتی ھے۔ معنوی لحاظ سے ان کے کلام میں ایک وزن ھوتا ھے اور فنی لحاظ سے ان کے کلام میں ایک نوک پلک ھوتی ھے۔ . . شاعری کے فن شریف کی تمام پابندیوں اور نکات سے واقف ھیں اس لیے بے راہ روی کے کبھی شکار نہیں ھوتے . . .

نذیر بنارسی نے اکتسابِ فن بہت سمجھ داری اور کاوش کے ساتھ کیا ھے جس کا ثبوت ان کے کلام کی پختہ کاری، سادگی اور پرکاری اور بیان کی چابک دستی سے ملتا ھے . . .

کہا جاتا ھے کہ اردو شاعری پر کچھ دنوں سے ایک جمود کی کیفیت طاری ھے . . نذیر بنارسی کے کلام کی اشاعت سے اس امر کا پتہ چلتا ھے کہ اردو شاعری کا یہ جمود ایک نئی بیداری کا پیش خیمہ ھے"

آپ نے تعارف نگار اور دیباچہ نگار کی رائے پڑھ لیں۔ اب ذرا شاعر کا کلام بھی ملاحظہ فرمائیے:

ہندوستان کی شان میں فرماتے ہیں:

جال بچھائے جال سنبھالے
کمسن سڑکیں مانگ نکالے
بال بکھیرے ندی نالے

میرا تو واس استھان یہی ہے
پیارا ہندوستان یہی ہے

پڑتی بوندیں، بجتی پائل
دھرتی جل تھل، پنچھی گھائل
بولے پپیہا، کوکے کوئل

میرا تو واس استھان یہی ہے
پیارا ہندوستان یہی ہے

اور شہیدانِ وطن کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

سوگ میں کل کوئی آنسو نہ بہا سکتا تھا
لاش کیا آنکھ بھی کوئی نہ اٹھا سکتا تھا
کل تمھیں کوئی کفن تک نہ پنہا سکتا تھا

کم ہے کم آج تو تم اوڑھ لو دامانِ وطن
ہم تمھیں پھول چڑھاتے ہیں شہیدانِ وطن

شاعر نے گاندھی جی کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور ان الفاظ میں :

مرے بوڑھے بہادر اس بڑھاپے میں جواں مرزی
نشاں گولی کے سینے پر ہیں گولی کے نشاں والے
نشاں ہیں گولیوں کے یا کھلے ہیں پھول سینے پر
گلستاں ساتھ لے کر جا رہے ہیں گلستاں والے

اور غریب اُردو پر بھی اس طرح کرم فرمائی کی ہے :

تم نے ہندی کی خاطر تو سب کچھ دیا
تم نے اُردو پہ کتنے لُٹائے ہیں دھن
آج تکتی ہے اس طرح سے دیش کو
جیسے دُولہا کا مُنہ دیکھتی ہو دُلہن

ہلالِ عید کا نظارہ بھی ان کے کلام پر کچھ زیادہ خوش گوار اثر نہیں ڈالتا - فرماتے ہیں :

اک حسیں طوق ہے یہ حُسن دل آرا کے لیے
اک تماشا ہے یہ بے تابِ تماشا کے لیے
ایک ٹوٹی ہوئی چوڑی ہے یہ بیوہ کے لیے
ایک نشتر ہے یتیموں کی تمنّا کے لیے

اس میں اُمید بھی بربادیِ اُمید بھی ہے
ساتھ ہی ساتھ محرّم بھی ہے اور عید بھی ہے

اب چند غزلوں کے شعر بھی سُن لیجیے کیونکہ بقولِ احتشام حسین : " نذیر بنارسی نے غزلوں میں بھی ایک دلکش رنگ پیدا کیا ہے اور مترنم رواں اور متداول بحروں میں لکھی ہوئی ان غزلوں میں بڑے پُر اثر اور خوبصورت اشعار ملتے ہیں :

کوئی پیمانہ لڑا جب کسی پیمانے سے
ہم نے سمجھا کہ پکارا گیا میخانے سے

محبت اے نذیر اس دہر سے ناپید ہو جاتی
محبت کی یہ قسمت تھی کہ پیدا ہو گئے ہم تم

اپنا حالِ تباہ کیوں دیکھوں
عشق کو آنکھ ہے نگاہ نہیں

آپ روزِ جزا کے لیے رو دیے
ہم تو اپنے کئے کی سزا پا گئے

یہ راہِ محبت ہے اس میں ایسے بھی مقام آجاتے ہیں
رُکیے تو پسینہ آتا ہے چلیے تو قدم تھراتے ہیں

فرقت کی شب ادائے تمنا نہ پوچھیے
اک حُور تھی جو سر کو جھکائے کھڑی رہی

کھڑا ہوں راہ میں پھیلا کے دامانِ نظر اپنا
حسیں جتنے گزرتے ہیں تجلی چھوڑ جاتے ہیں

سردیِ صلح بھی ہے گرمیِ پیکار بھی ہے
زندگی ڈھال بھی چلتی ہوئی تلوار بھی ہے

ان شعروں میں اگر آپ کو وہ خوبیاں نظر نہ آئیں، جو پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو نظر آئیں ہیں تو اسے اپنی ہی کوتاہیِ فہم اور بدذوقی پر محمول کیجیے۔ کیونکہ پروفیسر احتشام حُسین ساہتیہ اکاڈمی میں اُردو کے نمائندے ہیں اور پروفیسر فراق بہ یک وقت "عظیم" شاعر اور "عظیم" نقاد۔

——— جون ۱۹۵۹ء

شیرازۂ مژگاں: ———

شیرازۂ مژگاں کرشن موہن کی گیارہویں شعری تصنیف ہے۔ اس سے پہلے ان کے دس مجموعے شایع ہو کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔ عام طور پر جن شاعروں کی شعرگوئی کی رفتار تیز ہوتی ہے وہ اپنا اعادہ کرنے لگتے ہیں اور تازگی کی بجائے ان کے کلام میں استادانہ داؤ پیچ کا مظاہرہ زیادہ ہونے لگتا ہے۔ کرشن موہن کے

تازہ مجموعۂ کلام کو دیکھ کر یہ خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ اس میں بازگوئی کے آثار مطلق نظر نہیں آتے اور ہر صفحے پر قاری ایک تازگی اور ندرت محسوس کرتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ کرشن موہن شاعری کو ایک میکانکی عمل کی بجائے دلی واردات کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ میکانکی شاعری کا مذاق انھوں نے اپنی ایک مختصر سی نظم میں جس کا عنوان "غزل کا ایک عملی کردار" ہے اس طرح اڑایا ہے:

جلد ہو جائے غزل اُس آس پر
پہلے لکھتا ہے قوافی صفحۂ قرطاس پر
اور پھر ان کے سہارے شعر کہہ پاتا ہے وہ
قافیوں کی کھونٹیوں پر پارچاتِ فکر لٹکاتا ہے وہ

صرف یہی نہیں کہ کرشن موہن کی شاعری ایک میکانکی عمل نہیں، اس کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ شاعر نے زندگی کا مطالعہ سفر وضموں اور کتابوں کے واسطے سے نہیں بلکہ براہ راست کیا ہے۔ اس نے قلبِ انسانی میں براہِ راست جھانکا ہے۔

یہ کام آسان نہیں۔ عام طور پر آدمی جب اپنے قلب میں جھانکتا ہے تو ریا کی عینک لگا لیتا ہے اور دوسروں کے قلب میں جھانکتا ہے تو ناصح بن بیٹھتا ہے۔ کرشن موہن کی شاعری ان دونوں عیبوں سے پاک ہے۔ اس کی اخلاقی قدر و قیمت کیا ہے۔ یہ اہلِ مذہب جانیں لیکن اس کی شعری قدر و قیمت شک و شبہ سے بالا ہے۔ کرشن موہن کی خود نگری کا کرشمہ دیکھیے:

لطف اُٹھایا میں نے حُسن و رنگ کا
اور جی بھر کر سُنا
نغمۂ رنگیں رباب و چنگ کا ——
ذائقہ چکھا ہے خوب
سرد و گرم عشق، امن و جنگ کا
خوب سینکا خواہشوں کی دھوپ کو
آس، ارماں، شان و شوکت، شوقِ ہست
میں نے آنکھوں پر بٹھایا زیست کے بہروپ کو
یاس، حرماں، غم، پشیمانی، شکست
میں نے سینے سے لگایا موت کے ہر رُوپ کو
—— تجربہ

ایسی نظم ایک ایسا شاعر ہی کہہ سکتا ہے جس نے زندگی کو ہر جہت سے دیکھا ہو اور جس شاعر نے زندگی کو ہر جہت سے دیکھا ہو اس کی شاعری لازماً سدابہار ہو گی۔ ایسا شاعر پُرگو تو ہو گا بازگو نہیں کیونکہ زندگی کی تو ہر چھب نئی پھبن رکھتی ہے۔

داشتہ اور طوائف پر اُردو میں بے شمار نظمیں ہیں لیکن اکثر شاعروں نے جن میں ایسے شاعر بھی شامل ہیں جو طوائف کے کوٹھے کا طواف اپنی عملی زندگی میں کچھ زیادہ معیوب نہیں سمجھتے، اسے شیطان کی بیٹی اور تقدیر کی ہیٹی کہہ کر دامن بچالیا چنانچہ اس موضوع پر نظمیں متعدد شاعروں نے لکھی ہیں، لیکن معنوی اعتبار سے ان میں اتنی یکسانیت ہے کہ یہ ایک دوسرے کا چربہ معلوم ہوتی ہیں۔ اب اس موضوع پر کرشن موہن کی نظم دیکھیے:

میں تری داشتہ اپنی کچھ بھی نہیں
میں نے تیرے لیے اپنا جیون نچھاور کیا
اپنا جوبن نچھاور کیا
میری آغوش تیرے لیے، تیری آغوش کی مستحق اور بھی
(کاش کہہ سکتی میں، تیری آغوش ہے صرف میرے لیے)
عشقِ باغی ہمارا ہمیشہ رہا رہ نما
میرے اور تیرے یارانے میں کوئی بھی شک نہیں
عارضی رنجشیں تک نہیں
لیکن اس پیار کو میں ترستی ہوں جو
عارضی رنجشوں ہی کا پروردہ ہو
بے خبر سا، زمانے سے غافل سا ہو
جس میں نچے بھی ہنگامہ زا ہوں کبھی
دونوں کھل کر ملیں رشتہ داروں سے، احباب سے
عشق سے پیار تک ایک لمبا سفر
پیار کا مستقل اپنا پن جس میں گھر کی گھٹن، گاہے گاہے تھکن
بھی رہے خیمہ زن
(مضمحل تن بدن، زار من)
کاش میرے مقدر میں ہوتا محبت کا یہ بھولپن
آہ میرا چلن
عشق کی یہ جلن، داشتہ ہونے کی یہ چبھن
کاش ہوتی میں اپنی بھی کچھ، اے نیاز زمن
میں تری داشتہ اپنی کچھ بھی نہیں

نظم کا مصرعہ:

جس میں نہ بچے بھی ہنگامہ زا ہوں کبھی

کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ جس عورت کے دل میں ماں بننے کی خواہش پوشیدہ ہے زمانے کی مجبوریاں خواہ اسے داشتہ بنادیں خواہ طوائف، لیکن اس کا تقدس برقرار ہے۔ اس تقدس تک رسائی یا کسی صوفی کی ہو سکتی ہے یا شاعر کی اور اعلیٰ شاعری کے ڈانڈے بہر حال تصوف سے جا ملتے ہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ کرشن موہن نے زندگی کا ہر جہت سے مطالعہ کیا ہے۔ "شیرازۂ مژگاں" کی ورق گردانی کرتے ہوئے مندرجۂ ذیل نظم پر نظر پڑی۔ پتہ چلا کہ کرشن موہن کا بھی اپنے اور اپنی شاعری کے بارے میں یہی خیال ہے:

کوئی مجھ سے پوچھے اگر، میں کہاں ہوں
تو اس کو بتاؤں
کبھی ہوں میں پاتال کے پانیوں میں
کبھی عرش کی جلوہ سامانیوں میں
مرا نام شاعر
مرا کام آوارگی اور تماشا زمیں کا، فلک کا
جفا کی سیاہی، وفا کی جھلک کا
خرد کے دھندلکے، جنوں کی دمک کا
دھندلکے کا آنگن بھی ہے میرا مسکن
چمک کا گلستاں بھی میرا شبستاں

——— شاعر

ویسے اقبال بھی شاعروں کو یہی مشورہ دے گئے ہیں:

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ آہے، فغانے

اور کرشن موہن کو اقبال سے یہ خصوصی مناسبت بھی ہے کہ دونوں کا وطن سیالکوٹ ہے۔

"شیرازۂ مژگاں" کی گیٹ اپ مثالی ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ "شیرازۂ مژگاں" نے اردو دنیا کو ایک نئے آرٹسٹ سے بھی متعارف کرایا ہے۔ اس کا ٹائیٹل ساگر کے موقلم کا نتیجہ ہے اور لطافت اور ندرت دونوں کا حامل ہے۔

——— جولائی ۱۹۷۱ء

نئے نام :

"میرا دماغ میرے پیٹ میں ہے ۔ دل ؟ تم اسے بستر میں تلاش کر سکتے ہو ۔ معدہ ؟ یہ میز کے نیچے میرے پاؤں کو چاٹ رہا ہے ۔ جگر آئینے کا منہ چڑا رہا ہے ۔ تلی دراز میں ہے ۔ . . اور میرے پھیپھڑے تفریح میں مصروف ہیں اور تمہارے کنیری کے پودوں میں سوراخ کر رہے ہیں ۔"

یہ الفاظ ایک نئے سرئیلسٹ ڈرامے کے ایک کردار کی زبان سے ادا ہوئے ہیں ۔ بظاہر ان میں سے ہر بات مہمل ہے لیکن ایک انگریزی روزنامے کے کالم نویس نے اس پارے سے اپنے سیاسی کالم کی ابتدا کی ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے ۔ خارجی دنیا کے متعلق کالم نویس کے ادراک اور سرئیلسٹ ڈرامے کے کردار کی داخلی کیفیت میں چونکہ ہم آہنگی تھی اس لیے نہ تو کالم نویس کو مندرجہ بالا پارہ مہمل محسوس ہوا اور نہ اس کے پڑھنے والوں کو ہی ۔

ترسیل کا عمل دو طرفہ ہوتا ہے ۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کہنے اور سننے والے میں ذہنی یا احساساتی ہم آہنگی کس حد تک ہے ؟ ذہنی ہم آہنگی کی عدم موجودگی کی صورت میں صرف الفاظ ہی نہیں بلکہ بسا اوقات اعمال بھی ناقابلِ فہم بن جاتے ہیں ۔

انڈیانا کا فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں کا لیکچرار گرافورڈ وِل ۱۹۰۷ء کی ایک سرد رات کو خط ڈالنے گھر سے نکلا ۔ راستے میں اس کی ملاقات ایک مفلوک الحال فاقہ زدہ لڑکی سے ہوئی جو ایک خستہ حال نوٹنکی سے تعلق رکھتی تھی ۔ لیکچرار نے اسے کھانا کھلایا اور اپنے کمرے پر لے گیا ۔ اسے اس نے اپنے بستر پر سلا دیا اور خود اپنے مطالعے کے کمرے میں فرش پر سوتا رہا ۔ صبح اس کا پیریڈ آٹھ بجے شروع ہوتا تھا ۔ وہ پڑھانے گیا تو دو ناکتخدا خواتین جو مالک مکان تھیں کمرے کی صفائی کے لیے آئیں ۔ انھوں نے مہمان کو دیکھا اور فوراً ہی کالج کے پریسیڈنٹ اور مہتمم کو فون کر دیا اور لیکچرار جس کی عمر اس وقت صرف بائیس برس تھی معزول کر دیا گیا ۔ گرافورڈ وِل اور ناکتخدا خواتین اور منتظمینِ کالج کے درمیان چونکہ ذہنی اور روحانی ہم آہنگی نہیں تھی اس لیے قدرتی طور پر اس کا عمل ان کے لیے ناقابلِ فہم تھا ۔ یہی معزول شدہ لیکچرار بعد میں مشہور شاعر بنا ۔ اب اگر اس کی شاعری کچھ لوگوں کے لیے ناقابلِ فہم ہو تو عجیب بات نہیں ۔ اس کا تو عمل بھی دوسروں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا ۔ اردو کے نئے شاعروں پر عدمِ ترسیل، مبہم گوئی اور مہملیت کے جو الزام لگتے ہیں وہ ناقابلِ فہم نہیں ۔ پچھلے دنوں تک اردو شاعری ایک ایسے ماحول میں ہوئی ہے جس میں شاعر اور قاری میں مکمل ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی تھی اس شاعری کا مفہوم پہلے سے متعین تھا اور سننے والے کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا تھا ۔ شعرا بالعموم اپنی شاعری کے متعلق اس قسم کی باتیں کہا کرتے تھے : استاد نے اس مضمون کو اس طرح باندھا تھا میں نے اس طرح باندھا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں عدمِ ترسیل کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا ۔

ترقی پسندوں نے مفروضاتِ شعری میں کچھ رد و بدل تو کیا لیکن کام انھوں نے بھی مفروضوں ہی سے لیا ۔ انھوں نے ایسے مفروضوں کو نظم کیا جو نعروں کی حیثیت سے بزمِ سیاست میں پہلے ہی معروف ہو چکے تھے لہٰذا ترسیل کے معاملے میں انھیں بھی کسی دقت کا سامنا نہیں تھا ۔

نئی شاعری مفروضوں اور نعروں کی نہیں ہے ۔ یہ فردِ واحد کے روحانی اور احساساتی واردات کی عکاس ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں شاعر کو ترسیل کی دشواریوں کا سامنا ضرور ہوگا ۔ پرانی شاعری سے (جس میں ترقی پسند شاعری بھی شامل ہے) اس کا اختلاف جزوی یا فروعی نہیں بلکہ نوعی ہے ۔ اگر کچھ لوگوں کے نزدیک یہ شاعری مہمل اور مبہم بھی ہے تو اس سے اس کی قدر و قیمت کم نہیں ہوتی ۔ یہ بات کسی نئے شاعر نے نہیں بلکہ ایک پرانے شاعر نے کہی تھی : "یہ دنیا ہے اسے ہر بات سمجھائی نہیں جاتی ۔"

پھر بھی نہیں کہ جو چیز آپ کے لیے آج مہمل ہے وہ کل بھی مہمل ہی رہے ۔ "نئے نام" (ترتیب دینے والے : شمس الرحمٰن فاروقی، حامدی

حامد) میں، جو نئے شاعروں کی نظموں غزلوں کا مجموعہ ہے، احمد ہمیش اپنی نظم "تجدید-۳" میں لکھتا ہے:

ایک بار ایک قصبے میں ایک ننھی سی بچی نے مجھ سے
میری اُداسی پوچھی تھی
میری اُداسی میرے اندر تھی
اور بچی کا مطلب باہر تھا

لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ کبھی اس ننھی بچی کو بھی اندر کی اُداسی کا سامنا ہو جائے۔ کیا اس صورت میں بھی وہ شاعر کی اُداسی کو سمجھنے میں اتنی ہی ناکام رہے گی؟ —— اسی احمد ہمیش کی نظم "تجدید-۱" کا ایک ٹکڑا ہے:

تو بہر حال جہاں سے ہم کبھی فرض کیے گئے ہوں گے
وہیں کروڑوں عمروں اور عادتوں کی آنکھیں بنائی ہوئی
روشنی ایستادہ تھی
عادتیں اور عمریں، ہمارے ملک کے پرانے غلاموں کی طرح
اپنا اپنا حصہ لینے کو کھڑی تھیں
یعنی ہم نہیں جانتے کہ ہم کیوں روشنی میں بٹ گئے
یعنی ہم نہیں جانتے کہ ہم کیوں اندھیروں میں محلول ہے
اس وقت جب ہم سفر میں رات ہوتے ہیں
تو ایک ان دیکھی بچی کا چہرہ گونج جاتا ہے
یہ ہمارا قصہ ہے، ہمارے پاؤں کہیں لانبے شہروں میں چل رہے ہیں
تو ان کے چل چلنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اب
جی دار زلزلے نہیں آتے

اگر آپ اس ٹکڑے کو لفظاً سمجھنے کی کوشش کریں تو بہت ممکن ہے کہ آپ کو مشکل پیش آ جائے لیکن اگر آپ ایک ایسے شخص کا تصور کر سکیں جو اپنے ماحول سے اتنا غیر ہم آہنگ ہے کہ اسے زندگی کا سفر ایک بے معنی سفر نظر آتا ہے تو آپ کو یہ شکایت نہیں ہوگی کہ شاعر مجموعی تاثر منتقل کرنے میں بھی ناکام رہا ہے اور مکمل طور پر تو یہ کائنات بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر اس بنا پر آپ کائنات کو مہمل قرار نہیں دیتے تو شاعر کی نظم پر اس قسم کا فتویٰ کیوں لگائیں۔ زلزلوں کو جی دار کہنا اس بات کی علامت ہے کہ زندگی کی بے ربطی اور مہملیت سے اکتائے ہوئے شاعر کے لیے زلزلہ اور دھماکہ خوش گوار ہیں۔ ان مصرعوں کی تشریح اور تاویل جنسی اصطلاحوں میں کی جائے تو زلزلہ بھرپور اور ولولہ انگیز جنسی زندگی کا سمبل بن جائے گا جس سے شاعر اب تک محروم ہے لیکن نظم کی وسیع تر معنویت اس تاویل کے بعد بھی باقی رہے گی۔ زندگی کے مہمل پن کے احساس کا اظہار اس نے آگے چل کر ان مصرعوں میں بھی کیا ہے:

وہ کیسے بستر ہیں جن پر عورتیں کبھی نہیں سوئیں
جن کی تربیت، محض ایک کھونٹی ہے
جس پر دماغ اور جسم سبھی ٹنگے ہیں
سمندر، اس ملک کی دھول بردار بھیڑ سے دور ہیں

آپ نے اس شخص کے دل میں تو جھانک لیا جو زندگی سے بیزاری اور اکتاہٹ محسوس کرتا ہے، جو ماحول سے ہم آہنگ نہیں۔ اب اس شخص کی صورت بھی دیکھیے جو اس زندگی سے ہم آہنگ ہے مبادا آپ یہ سمجھنے لگیں کہ زندگی سے بیزاری مریضانہ کیفیت اور ماحول سے ہم آہنگی صحت مندی کی علامت ہے۔ مصحف اقبال توصیفی نے سفید پوش کی تصویر ان لفظوں میں پیش کی ہے:

وہ آرہا ہے
وہ اقلیدسی شکل اس کی، مثلث نما ہونٹ
لہجے کی مخصوص گمبھیرتا
وہی جانے پہچانے مانوس فقرے
ابھی میرے شانے پہ وہ ہاتھ رکھ کر کہے گا
"بھئی اتنے دن سے کہاں تھے
کہیں بیٹھ کر آؤ کچھ دیر باتیں کریں
——— ہٹیں

کواٹی بار، پرسنر
چلیں؟"

مداری:
پٹارے میں کیا ہے؟
وہی بین، سانپ ——— اور کوئی تماشہ؟!!"

اور اس بے ڈھنگے ماحول سے تطبیق پیدا کر کے بھی آپ کیا لیں گے؟ جتنی اس ماحول سے تطبیق پیدا کریں گے اتنے ہی اپنے آپ سے دور ہو جائیں گے اور بلراج کومل کے الفاظ میں "سرکس کا گھوڑا" بن کر رہ جائیں گے۔ اس گھوڑے نے چابکوں اور ہنٹروں کی بدولت سب کرتب سیکھ لیے ہیں۔ لیکن جب:

وہ سرکس کا گھوڑا
پریشان شہروں میں کرتب دکھاتا
تماشائیوں کے دلوں کو لبھاتا
تحیر، ہنسی، قہقہوں، تالیوں کی فضاؤں میں برسوں جھلانگیں لگاتا
اسی گاؤں کے ایک میلے میں پہنچا
خریدا گیا تھا جہاں سے وہ بچپن میں، لیکن وہاں اب؟
وہاں کون تھا اس کو پہچاننے والا کوئی نہیں تھا

"نئے نام" میں ۸۰ نئے شاعروں کی نظموں غزلوں کا انتخاب ہے کسی انتخاب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مکمل اور نمائندہ ہے آسان نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اسے پڑھ کر نئی شاعری کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ شروع میں شمس الرحمن فاروقی کا "ترسیل کی ناکامی کا المیہ" کے عنوان سے ایک معنی خیز اور خیال افروز مقدمہ بھی ہے۔

مطبوعاتِ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۲

ادب، تنقید و تحقیق

اے پیارے لوگو	وارث علوی	۴۰/-
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۲۴/-
تیسرے راشٹرپتی: ڈاکٹر ذاکر حسین	عبداللطیف اعظمی	۸/-
تلاش و تعبیر	ڈاکٹر منظر اعظمی	۳۶/-
نسوانی محاورے	وحیدہ نسیم	۱۸/-
آنکھیں ترستیاں ہیں	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۳۶/-
نشانِ منزل	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۴۰/-
میرے خیال میں	نظیر صدیقی	۳۸/-
ن۔م۔راشد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر شہریار	۴۰/-
میراجی: شخصیت اور فن	کمار پاشی	۴۰/-
محمد اقبال: ایک ادبی سوانح حیات	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۲۵/-
منٹو: شخصیت اور فن	پریم گوپال متل	۴۰/-
شاعرِ آخر الزماں: جوش ملیح آبادی	ڈاکٹر فضل امام	۳۰/-
ساحر لدھیانوی: ایک مطالعہ	مخمور سعیدی	۳۰/-
چند ادبی شخصیتیں (خاکے)	شاہد احمد دہلوی	۳۰/-
چوری سے یاری تک (انشائیے)	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۸/-
لاہور کا جو ذکر کیا (یادداشتیں)	گوپال متل	۱۵/-
مذہب اور سائنس	مولوی عبدالحق	۱۱/-
گوپال متل: ایک مطالعہ	محمد عبدالحکیم	۱۵/-
راجستھانی زبان و ادب: ایک تعارف	ڈاکٹر فضل امام	۱۸/-
قصہ جدید و قدیم: ایک ادبی مباحثہ	مخمور سعیدی	۱۸/-
نیا اردو افسانہ: انتخاب احتساب	کمار پاشی	۱۸/-
افکارِ عبدالحق	آمنہ صدیقی	۳۵/-
گلاگ مجمع الجزائر (یادداشتیں)	الیگزینڈر سولنسٹین	
تین جلدوں میں	قیمت فی جلد غیر مجلد	۱۰/-

ناول، افسانے، ڈرامے

دل کے دروازے	عطیہ پروین	۲۵/-
گریز	عزیز احمد	۳۵/-
واپسی	آمنہ ابوالحسن	۱۸/-
سپنے کب اپنے	فرخندہ شمیم	۲۴/-
غم کے سائے	بیگم محمودہ بشیر	۳۵/-
زرد چاندنی	عقیلہ ہما	۳۰/-
گرماں والی	کشمیری لال ذاکر	۳۰/-
کینسر وارڈ	الیگزینڈر سولنسٹین	۱۸/-
برف پر مکالمہ	سریندر پرکاش	۱۸/-
انتظار حسین کے سترہ افسانے	انتظار حسین	۱۸/-
سو کینڈل پاور کا بلب	سعادت حسن منٹو	۱۸/-
بادل گرجیں جمنا پار	سدرشن شرما	۱۸/-
سلمیٰ سے دل لگا کر	نیر واسطی	۱۸/-
خالی خانے	انل ٹھکر	۲۰/-
ایک ٹانگ کی گڑیا	کنور سین	۲۰/-
ہندو مسلمان	ہمت رائے شرما	۲۰/-
تین پہر کا ایک سوال	کشمیری لال ذاکر	۴/۵۰

شاعری

سحر حرف	ساحر ہوشیارپوری	۲۰/-
صحرا میں اذان	گوپال متل	۱۵/-
سات سمندر	بدیع الزماں خاور	۲۰/-
نام، بدن اور میں	بلکرشن اشک	۱۵/-
روشنی پھر روشنی ہے	بلکرشن اشک	۱۵
ماضیانہ	بلکرشن اشک	۱۵/-
تیسرا سفر	سلیمان خمار	۱۵/-
دائروں کا سفر	شباب للت	۱۵/-
بادۂ صافی	صوفی بانکوٹی	۱۵/-
دینار	بدیع الزماں خاور	۱۰/-
زندگی اے زندگی	سید شکیل دسنوی	۱۸/-